www.KitaboSunnat.com
جناب
غلام احمد
پرویز
اپنے الفاظ کے آئینے میں
پروفیسر محمد دین قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب غلام احمد پرویز

اپنے الفاظ کے آئینے میں

اعادہ اور اضافہ شدہ ایڈیشن

تالیف

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

۲۹۷،۸۷ قاسمی، محمد دین، پروفیسر

ق د س - ج جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں

لاہور: بیت الحکمت

۲۰۰۶ء

ص ۲۲۰

انکار سنت، حدیث، پرویزیت

ISBN 969-8773-46-2

کتاب	:	جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں
مصنف	:	پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی
طبع	:	دوم
اہتمام	:	بیت الحکمت، لاہور
مطبع	:	موٹروے پریس، لاہور
قیمت	:	۲۲۰ روپے

انتساب

ان فریب خوردہ شاہینوں کے نام، جو طلوعِ اسلام کا یک طرفہ لٹریچر

پڑھ کر راہِ حق کھو چکے ہیں

ترتیب

حرف اول......۱۴

باب ۱

دل اور زبان میں عدم موافقت......۳۹

باب ۲

خارزارِ تضاداتِ پرویز......۵۲

باب۳

''مفکر قرآن'' کے چند صریح جھوٹ.....۱۰۹

باب۴

مغالطہ آرائیاں، خیانت کاریاں، فریب انگیزیاں.....۱۳۵

باب ۵

جھوٹے الزامات، افتراءات، بہتانات.....۱۶۵

باب ۶

ناپ تول کے دوہرے معیار..... ۲۱۵

باب ۷

تائیدِ باطل کا رویہ پرویز..... ۲۵۷

باب ۸

تخیلاتی مقصود اور حکمتِ عملی..... ۲۶۵

باب ۹

''مفکرِ قرآن'' کے اکاذیب و اباطیل ۲۹۲

باب ۱۰

''داعیٔ انقلاب'' کا ذاتی کردار (شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا) ۳۱۷

باب ۱۱

"اخلاقی نامردی"……۳۳۵

حرف آخر......۳۸۲

ضمیمہ ــــ چند اعتراضات اور ان کا جائزہ......۳۹۰

کتابیات ۴۳۶

حرفِ اوّل

''لوگو! میں تمہارے درمیان، اپنی عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں۔ بتاؤ، تم نے مجھے سچا پایا، یا جھوٹا؟'' (فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ هَلْ وَجَدْتُمُونِي صَادِقًا أَوْ كَاذِبًا) .....

یہ وہ پہلا سوال ہے، جو علانیہ تبلیغ کا حکم ملتے ہی، نبی اکرم ﷺ نے، صفا پہاڑ پر چڑھ کر، قبائلِ قریش کے سامنے رکھا، حالانکہ آپ جانتے تھے کہ اہلِ مکہ کے ہاں، آپ، صادق اور امین کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لیکن اعلانِ نبوت سے قبل، آپ نے اپنی صداقت و امانت پر، اپنے ہم وطنوں سے پھر استشہاد فرمایا، لوگوں نے جواباً یہ کہا کہ ''ہم نے اپنے تجربہ میں، آپ کو ہمیشہ سچا پایا ہے''۔ مگر جو اہم اعلان آپ کرنے والے تھے، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، آپ نے دوبارہ اِسی سوال کو، ایک اور انداز میں دہرایا اور استفسار فرمایا کہ ﴿ أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنِّي أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ يُصَبِّحُكُمْ أَوْ يُمَسِّيكُمْ أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونِي ﴾ ''اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ دشمن (کا ایک لشکرِ جرار) صبح یا شام تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟''۔ سب نے جواب دیا ''ہاں، کیونکہ ہمارے تجربے میں، تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو''۔

اعلانِ نبوت سے قبل، یہ مکرر سوال، اس امر کی واضح شہادت ہے کہ آپ ﷺ کی اب تک کی زندگی، جو اہلِ مکہ کی نگاہوں کے سامنے گزری تھی، ایسی تھی کہ اس میں جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سالہ یک جائی معاشرت میں، آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اُسے ہوا ہو۔ برعکس، اس کے، جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ آپ کو نہایت سچے، بے داغ اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ سال ہی پہلے، تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں، وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا، جس میں حجرِ اسود کو نصب کرنے کے معاملہ پر، قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے، اور باہم یہ طے پایا تھا کہ کل صبح، پہلا شخص جو حرم میں داخل ہو گا،

اُسی کو سچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز، وہ شخص حضرت محمد ﷺ ہی تھے جو وہاں داخل ہوئے تھے، آپ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے، ھٰذَا الْاَمِیْنُ ، رَضِیْنَا ، ھٰذَا مُحَمَّدٌ "یہ بالکل دیانت دار آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو محمدؐ ہی ہیں"۔ اس طرح، آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے، اللہ تعالیٰ، پورے قبیلہ قریش سے بھرے مجمع میں، آپ کے راست باز اور امین ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اور اب یہاں، صفا پہاڑ پر، خود آپؐ نے بھی، دو مختلف پیرایۂ بیان میں اپنی صداقت و راست بازی پر، اہل مکہ سے شہادت وصول فرمائی۔ کیوں؟ کس لیے؟ صرف اور صرف اس لیے، کہ زمانہ قبل از نبوتؐ کی صاف ستھری اور پاکیزہ و شفاف حیاتِ پیغمبر ہی، دراصل وہ چیز ہے، جو ان کے دعویٰ نبوت پر، واحد، لیکن سب سے زیادہ محکم اور مضبوط دلیل قرار پاتی ہے، ظاہر ہے کہ جس شخص نے تمام عمر، کبھی بھی، اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل، فریب اور دھوکہ سے کام نہ لیا ہو، اس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ جعلی نبوت کا اتنا بڑا جھوٹ، اور ایسا بدنما جعل و فریب لے کر اٹھ کھڑا ہو، اور اپنے ذہن سے کچھ باتیں گھڑ کے، انہیں پورے زور اور تحدی کے ساتھ، (مخلوق نہیں، بلکہ) خالق کی طرف منسوب کر ڈالے؟ بھلا جس نے کسی خفیف سے خفیف اور معمولی سے معمولی معاملہ تک میں مخلوقِ خدا پر افتراء نہ کیا ہو، کیا وہ، خود خالق پر ایسا افتراء اور بہتان باندھے گا جس سے بڑا جھوٹ، کوئی اور نہیں ہو سکتا؟ قرآن کا معجزانہ کلام تو بعد کی چیز ہے۔ قرآن کی ولولہ انگیز خطابت، اس کی انقلاب انگیز دعوت، اس کے ضوابطِ تمدن و معاشرت، اُس کے نظامِ فکر و اخلاق اور مستقل فلسفۂ حیات سے بھی پہلے، جو چیز بطور دلیل اور حجت کے پیش کی جا رہی ہے، وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ بے داغ کردار اور بے عیب سیرت ہے، جو سراپا صدق و صفا، مجسمۂ امانت و دیانت، پیکرِ عدل و انصاف اور خلقِ عظیم کا پتلا ہے، جس میں کذب و زور اور فریب و خیانت یا کسی اور رذالتِ اخلاق کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ کتاب اللہ، اپنی ساری خوبیوں اور فضیلتوں کے باوجود، افرادِ انسانی کے ہاں سے شرفِ قبولیت پالینے کے لیے، نبی اکرم ﷺ کے صاف شفاف اور پاکیزہ و بے عیب کردار کی محتاج ہے، حضور اکرم ﷺ کو ماننے والوں نے، کتاب اللہ کی زبان سے سن کر آپؐ

کو نبی ورسول نہیں مانا، بلکہ انہوں نے آپؐ کے صالح کردار پر مبنی، آپ کی حدیث وگفتگو کو سُن کر، قرآن مجید کو کتاب اللہ تسلیم کیا ہے۔

پرویز صاحب کی "خدماتِ قرآن" پہلے یا اُن کا کردار؟:

پس جب، آپؐ کی لائی ہوئی کتاب پر، کوئی دلیل، ماسوا، آپؐ کی صاف شفاف اور پاکیزہ سیرت وکردار کے، کارگر نہیں ہے، تو ہمیں بھی دیکھنا چاہیے کہ قرآن کریم کے "حقائق ومعارف" پیش کرنے والے، "مفکر قرآن" کا اپنا کردار اور عملی رویہ کس قسم کا تھا۔ یہ بات صرف اس لیے ہی ضروری نہیں کہ (اوپر کی بحث کی روشنی میں) یہی فطری ترتیب ہی موزوں اور مناسب، بلکہ منطقی تقاضا قرار پاتی ہے، بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ "مفکر قرآن" صاحب، قرآن کے نام پر، جو کچھ پیش کرتے رہے ہیں، وہ، اُن کے متبعین کی نگاہ میں "بلند پایہ علمی نکات" اور "بیش بہا قرآنی جواہر پارے" ہیں۔ جبکہ ان کے مخالفین کی نگاہ میں، یہ سراسر "قرآنی تحریفات" ہیں۔ وابستگانِ طلوعِ اسلام، پرویز صاحب کی "قرآنی خدمات" پر، یہ کہہ کر، انہیں ہدیہ تحسین وتعریف پیش کرتے ہیں:

> "ان اٹھارہ سالوں میں صرف ایک ہی آواز تھی جو رجعت الی القرآن کا نعرہ بلند کرتی رہی، قرآن کے ابدی حقائق کو ابھار اور نکھار کر منظر عام پر لاتی رہی۔ یہ مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی شخصیت تھی، جس نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور اس راہ میں دن رات ایک کر دیا، جس کے قلبِ مضطرب کی بے تابیاں اور دیدۂ تر کی بے خوابیاں، جس کی امنگیں اور آرزوئیں، دعائیں اور امیدیں برابر اس مقصدِ عزیز پر مرکوز رہیں، جس کی فکر وبصیرت نے کتاب خداوندی پر پڑے ہوئے، سازشِ عجم کے ایک ایک نقاب کو الٹا، جس نے عصر حاضر کے تقاضوں کا حل، قرآن کی زبان میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔" ❶

> "محترم پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو قرآنی بصیرت عطا فرمائی، اُن کی اس

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۶۵ء، صفحہ ۳۹ + جنوری ۱۹۸۰ء، صفحہ ۶۰

بصیرت نے قرآن کریم اور اسلام کی صحیح تصویر، ہمارے سامنے پیش کر دی۔"●

ان اقتباسات میں، پرویز صاحب کی جن "قرآنی خدمات" پر، انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، اُن ہی کو سامنے رکھ کر، علماءِ دین، پرویز صاحب کے بارے میں یہ کہتے ہیں:

"وہ قرآن کا سہارا لے کر قرآن سے کھیلتا، حدیث کی آڑ میں حدیث پر حملہ آور ہوتا، اور صحابہ سے محبت جتلا کر، اُن ہی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اشتراکیت کی مذمت کر کے اشتراکیت کا پرچار کرتا، مادہ پرستی سے دشمنی ظاہر کر کے مادیت کی راہ ہموار کرتا، مادیت اور روحانیت کے درمیان بظاہر قرآنی راہِ اعتدال کا حوالہ دے کر شریعت سے بیزاری کا اظہار کرتا، سائنس کے نام پر علماءِ دین کو رگیدتا، سائنسی علوم کے مقابلہ میں علومِ دین کو ہیچ سمجھتا، تاریخ کو مسخ کرتا، آخرت کا تصور دلوں سے محو کرتا، اور شعائرِ اسلام کی علی الاعلان تضحیک کرتا ہے۔ اتنا شاطر، اتنا چالاک، اس قدر ذہین، لیکن اسی قدر بد باطن کہ آیاتِ قرآن کے مختلف ٹکڑے چنتا، ان کو ایک خاص ترتیب دے کر، اس خوبی سے ان کو باہم مربوط کرتا، اور ان کو خوشنما معنی پہنا کر من مانے مطالب اخذ کرتا ہے کہ مفہوم، کچھ سے کچھ ہو جائے، لیکن قاری الفاظ و تراکیب میں الجھ کر رہ جائے، اور تحریر کے تسلسل اور روانی کا شکار ہو کر اپنے ذہن کو منجمد ہوتا ہوا محسوس کرے، حتّٰی کہ وہ یہ بھی بھول جائے کہ قرآن مجید میں، اس نے جو کچھ پڑھا تھا، اور جس چیز کی طرف یہ کلام الٰہی اسے اب تک دعوت دیتا رہا ہے، وہ کیا تھی؟ (محدث، لاہور، ستمبر ۱۹۸۲ء)●

اب ظاہر ہے کہ عامۃ الناس میں، ایسی اہلیت و قابلیت نہیں ہے کہ جو کچھ پرویز صاحب نے لکھا ہے، اس کو جانچ پرکھ کر، وہ، یہ فیصلہ کر سکیں کہ وہ فی الواقعہ "بلند پایہ علمی نکات" ہیں یا "رکیک و خسیس قرآنی تحریفات"۔ قطع نظر اس کے، کہ یہ سب کچھ کیا ہے، سب سے پہلے، پرویز

● طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۳۹

● بحوالہ طلوع اسلام، مارچ اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۷۸

صاحب کے سیرت وکردار پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اگر وہ واقعتاً راست باز، صداقت شعار، امانت دار، دیانت دار، عادل ومنصف مزاج اور نیک نیت ہیں، تو یقیناً جو کچھ انہوں نے قرآن کے نام پر پیش کیا ہے، ایک عام آدمی اس کے بارے میں مثبت رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوگا (اگرچہ اخلاص قلب اور نیک نیتی کسی کے لازماً صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی ضمانت نہیں ہے) لیکن اگر وہ صادق کی بجائے کاذب، امانت دار کی بجائے خیانت کار، دیانت دار کی بجائے فریب کار، عادل کی بجائے غیر عادل، اور نیک نیت ہونے کی بجائے بدنیت واقع ہوں، تو پھر ان کی "قرآنی خدمت" کے بارے میں، ہر کوئی منفی رائے رکھنے پر مجبور ہوگا، وہ یہ باور کرے گا کہ جو شخص، بندوں کے ساتھ دروغ گوئی، بددیانتی، خیانت کاری، الزام تراشی کا رویہ اختیار کرنے سے نہیں چوکتا، وہ یقیناً ہی ہے، حتیٰ کہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ بھی ایسا طرز عمل اختیار کرسکتا ہے، جو شخص، دیدہ دلیری سے انسانوں کے کلام اور ان کی عبارات میں، خلق خدا کو دھوکہ دینے کے لیے مسخ وتحریف سے دریغ نہیں کرتا، وہ کلام خداوندی میں بھی تحریف وتغییر سے باز نہیں رہ سکتا۔ جو افراد انسانی کے بارے میں دھوکہ وفریب دہی کی پالیسی اختیار کرنے سے نہیں ہچکچاتا، وہ خدا اور اس کے رسول کے بارے میں ایسی پالیسی اپناتے ہوئے کیوں کر متامل ہوسکتا ہے؟ جو آنکھوں دیکھی دنیا سے حیا نہیں کرتا، وہ ان دیکھے خدا سے کس طرح شرما کر اپنی حرکات بد کو چھوڑ سکتا ہے؟ جو اپنی شان وشوکت کو بلند وبالا کرنے کے لیے، ان کاموں کو بھی، اپنے کارناموں میں شامل کرواتا ہے، جو سرے سے اس نے انجام ہی نہیں دیے، وہ اپنی اغراض کے لیے کون سا جھوٹ نہیں بول سکتا؟

ایک اور پہلو سے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کی "قرآنی خدمت" کا جائزہ لینے سے پہلے، ان کی سیرت وکردار پر نظر ڈالی جائے، اور وہ یہ کہ پرویز صاحب کے پیش کردہ "قرآنی حقائق و معارف" کی جانچ پرکھ کے لیے، بہر حال، کم سے کم ضرورت یہ ہے کہ پرکھ کنندہ شخص، عربی زبان کا علم رکھتا ہو، اس کے بغیر وہ نہیں جان سکتا کہ ترجمہ وتفسیر میں کہاں اور کیا کیا اغلاط واضافے ہیں اس سے بھی آگے بڑھ کر تحریفات وتلبیسات پائی جاتی ہیں۔ جبکہ سیرت وکردار کے واقعات کو ہر

شخص (خواہ عربی زبان کے علم سے کورا ہی کیوں نہ ہو) معمولی کھوج کرید اور تحقیق و تفتیش کے ذریعہ جان سکتا ہے کہ ان واقعات سے وابستہ فرد، جھوٹا ہے یا سچا؟ فریب کار ہے یا دیانت دار؟ عبارت کو اپنے موقع و محل میں رکھ کر پیش کر رہا ہے یا وہاں سے اکھاڑ کر؟ اقتباسات کو، ان کے اصل زمانی پس منظر میں رکھ کر ظاہر کر رہا ہے یا انہیں مقدم و مؤخر کر کے؟ وہ اپنی واقعی کارگزاری کا اعلان کر رہا ہے یا ناکردہ کارناموں کا سہرا اپنے سر باندھ رہا ہے؟ وہ عدل و انصاف کی پاسداری کرتے ہوئے، سب کو ایک ہی معیار اور ایک ہی ترازو میں تولتا ہے، یا اپنوں اور بیگانوں کے لیے الگ الگ معیار اور ترازو استعمال کرتا ہے؟ وہ، اپنے مخالفین کے جس "عیب" پر طعن و تشنیع کے تیر برساتا ہے، خود اس کا اپنا دامن کردار، اس دھبے سے پاک ہے یا نہیں؟

امتِ مسلمہ سے شکایاتِ پرویز:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت امت مسلمہ، نکبت و زبوں حالی کا شکار ہے، زوال و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ ہر صاحب فکر کو اس پر تشویش و پریشانی لاحق ہے، اور ہر کوئی اس کے وجوہ و اسباب کا کھوج لگا کر، اس کے مداوا کی فکر کر رہا ہے، ایسے میں شکایات کا پیدا ہونا لازمی امر ہے، پرویز صاحب بھی، امت مسلمہ سے بعض امور میں ہمیشہ شاکی رہے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر، وہ، اپنی قوم سے یوں شکایت کرتے ہیں:

> "ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوع اسلام کہتا ہے، اُسے، اُس کے الفاظ میں، اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے، اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ●

ہمیں نہیں معلوم کہ اس طرح کا پراپیگنڈہ کرنے والے کون لوگ ہیں، جو "اپنی طرف سے ایک بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوع اسلام (یا جناب پرویز صاحب) کی طرف منسوب کر

● طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۶ء، ص: ۵

کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔" ہم نے اس امر کی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ طلوع اسلام (یعنی جناب پرویز صاحب) کے موقف کو خود انہی کے الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اس پوری تصنیف کے دوران یہی ہماری کوشش رہی ہے کہ انہیں ہمارے خلاف یہ (واقعی یا فرضی) شکایت پیدا نہ ہو۔

پھر اسی شکایت کے تسلسل میں دوسری شکایت وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر کسل انگار واقع ہوئی ہے، اس لیے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوع اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔" ❶

ہمیں سو فی صد یقین ہے کہ اس کتاب کے قارئین کو یہ شکایت لاحق نہیں ہوگی کہ مصنف کتاب کسل انگار واقع ہوا ہے، اور یہ کہ اس نے طلوع اسلام کے اصل ماخذ تک رسائی پانے کی کوشش نہیں کی۔

تصانیف پرویز میں میری دلچسپی:

اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے اولین ماخذ قرآن مجید ہے، جو تقریباً تمام مسلم گھرانوں میں پایا جاتا ہے۔ دینِ اسلام کے حوالے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی گھریلو فضا کے باعث میں اپنے بچپن ہی سے شوقِ مطالعہ رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں بعض اسلامی کتب اور قرآن مجید ہمیشہ موجود رہے ہیں لیکن کتب احادیث میں سے کوئی کتاب مجھے میسر نہ تھی، اس لیے اسلامی تعلیمات کا پہلا اور بنیادی سرچشمہ ... قرآن مجید ... ہمیشہ میرے مطالعہ اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ قرآنی تعلیمات کے ساتھ میرے اسی ذوق اور دلچسپی نے میرے اندر ایک ایسا اشتیاق پیدا کر دیا جس کی بنا پر قرآن کے کسی بھی پہلو پر لکھی ہوئی کوئی بھی کتاب، جو میرے ہاتھ لگتی محروم مطالعہ نہ رہتی۔ اسی مطالعاتی شغف نے مجھے، جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے قرآنی لٹریچر سے متعارف کرایا اور ان کی جملہ کتب، وقفوں کے ساتھ مگر بتدریج، میری نگاہوں سے گزرتی رہیں۔ عبارت کی دلکشی، اسلوبِ نگارش کی شگفتگی، انشاء کی جاذبیت اور ادب کی چاشنی پر

---

❶ طلوع اسلام، [illegible]

مشتمل، ان کا لٹریچر، میری آنکھوں کے لیے وجۂ جاذبیت اور قلب و دماغ کے لیے باعثِ مسحوریت بنتا رہا۔ عبارتوں میں جابجا اشعار کی موجودگی، میری جذباتی تسکین کا سبب بنتی رہی، اور میں دھیرے دھیرے، ان کے لٹریچر کا مطالعہ، ایک تسلسل کے ساتھ اس طرح کرتا رہا کہ دورانِ مطالعہ، قرآن کے متعلق، کوئی اور کتاب بھی مل جاتی تو وہ بھی شاملِ مطالعہ ہو جاتی۔ اپنے حصولِ تعلیم کے دور میں بھی، قرآن سے متعلقہ لٹریچر کے ساتھ، میری دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میں نصابی کتب سے کہیں زیادہ، اسلامی کتب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ پرویز صاحب کے نوع بہ نوع اور تازہ ترین افکار سے آگاہ رہنے کے لیے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا مسلسل مطالعہ بھی میرا دستور رہا، حتیٰ کہ طلوعِ اسلام کی فائل کے وہ شمارے، جو مجھے میسر نہ آ سکے تھے، ان کے حصول کی بھی شدید خواہش ابھری اور میں اس کی فائل کو، نہ صرف (دسمبر ۱۹۸۶ء تک) مکمل کرتے میں، بلکہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مطالعۂ طلوعِ اسلام کا یہ سلسلہ، پرویز صاحب کی وفات کے پونے دو سال بعد تک جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں انقطاع، صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اس کے مضامین میں کسی جدید اضافۂ فکر کی بجائے، پہلے سے مطبوع شدہ افکار و نظریات ہی کا اعادہ و تکرار تھا۔ لیکن بہرحال، میں، اللہ کے فضل و کرم سے، ایک کھلے دل و دماغ کا فرد ہوں اور مجھے زندگی کے کسی دور میں بھی یہ بات قطعاً پسند نہیں رہی کہ میں کسی خول میں بند ہو کر، یک رخے مطالعہ کے سانچہ میں اپنے دل و دماغ کو ڈھال لوں۔ میں پرویز صاحب کی کتب کے علاوہ، دیگر مصنفین اور اہلِ علم کی کتب سے بھی استفادہ کرتا رہا، اور طلوعِ اسلام کے علاوہ دیگر رسائل کی بھی خوشہ چینی کرتا رہا، حتیٰ کہ مرزا غلام احمد قادیانی، جیسے متنبی کا لٹریچر بھی، میری نگاہوں سے گزرتا رہا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے نقطہ ہائے نظر کے مطالعہ سے، مجھے خلافیات (اختلافی مسائل) سے خاصا شغف پیدا ہو گیا اور میں چار و ناچار ایسے مطالعہ کی راہ پر گامزن ہو گیا، جس کے نتیجہ میں، اصحابِ اختلاف کے آراء و نظریات کی کھوج کرید، میرے ذوقِ تحقیق و تدقیق کو نکھارنے کا باعث بنی۔ کتبِ احادیث کے وسیع ذخیرے پر، اور پھر ان کی شروح و تعلیقات پر، میری نگاہوں کا حاوی ہونا اتنا آسان نہ تھا، جتنا کہ قرآنی تعلیمات پر، یہ امر، سہل تھا، چنانچہ اس

زاویۂ نظر سے قرآن اور اس کی تعلیمات کے مطالعہ کے انہماک میں، مَیں، روز بروز فزوں تر ہوتا چلا گیا، اور میرے حلقۂ احباب میں سے، جن اہلِ علم سے کسی علمی بحث پر گفتگو ہوتی تو میں اپنے دلائل کو زیادہ تر قرآن ہی سے پیش کرنے کا عادی رہا (اور اب بھی ہوں)۔

تاہم، پرویز صاحب کی نگارشات کی اُن خوبیوں کے باوجود، جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، کچھ پہلو ہمیشہ میرے ذہن میں کھٹکتے رہے ہیں، اور میں مکمل قلبی طمانیت نہ پا سکا اور ذہنی یکسوئی سے محروم رہا۔ مَیں، جناب پرویز صاحب کی کامل حمایت وہم نوائی اور ان سے گریز ومخالفت کے درمیان، ایک عرصہ تک معلق اور متربص رہا اور یوں، مَیں قلبی طور پر، جناب پرویز صاحب کے دلائل وبراہین سے، نہ دل جمعی کے ساتھ موافقت وہم آہنگی کا رویہ ہی اختیار کر پایا اور نہ ہی بالکلیہ انہیں رد کر کے فکرِ پرویز سے اپنا دامن چھڑا سکا۔ وہ امور، جو میرے لیے وجۂ خلجان اور موجبِ عدم اطمینان بنے رہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)..........سب سے پہلے جو چیز میرے لیے وجۂ خلش بنی، وہ جناب پرویز صاحب کا وسیع وعریض خارزارِ تضادات ہے۔ اسلامیت اور مغربیت کے درمیان کشمکش کے نتیجہ میں، جو مسائل دورِ حاضر میں پیدا ہوئے، ان کے بارے میں، انہوں نے جو متضاد اور متناقض رویہ اختیار کیے رکھا، وہ ہر اس شخص پر عیاں ہے، جس کی نظر ان کے پورے لٹریچر پر حاوی ہے (اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آ رہی ہے)۔ الغرض آج کچھ کل کچھ، یہاں کچھ وہاں کچھ، کبھی کچھ کبھی کچھ، حجابِ نسواں، گیت سنگیت، مصوری وتمثال سازی، ملکیتِ مال واراضی، ضبطِ تولید، خلیفۃ اللہ اور خلافتِ الٰہیہ، انسانی فطرت، وقتِ موت کا تعین وتقرر، دین ومذہب کے معنی ومفہوم میں فرق، سنتِ رسول کی حیثیت بطور ماخذِ قانونِ اسلام، غرض یہ کہ ان تمام امور میں اور ان جیسے دیگر بے شمار امور میں سے وہ کون سا معاملہ ہے جس میں واضح تضاد وتناقض کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا، اور لطف یہ کہ، یہ تمام متضاد ومتناقض رویے، ''قرآن کی روشنی'' میں اپنائے گئے ہیں۔ اس سے بدیہی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یا تو قرآن (معاذ اللہ) خود متناقض ومتضاد تعلیم پیش کرتا ہے، یا پھر قرآنِ کریم کے واحد سند اور حجت ہونے کے دعوے دار، دل سے اس کی سندیت اور حجیت کے قائل نہیں ہیں،

کیونکہ بقولِ پرویز صاحب:

"قرآن کو سند اور حجت ماننے والا تو ساری عمر میں، دو متضاد باتیں بھی قرآن کی سند سے نہیں کہہ سکتا۔" ❶

(۲)............دوسری چیز، جو مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے، وہ، جناب پرویز صاحب کا وہ رویہ ہے جو تقلید کے بارے میں وہ اپنائے ہوئے تھے۔ اعتقادی اور نظریاتی طور پر، وہ ہمیشہ، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، یہی کہتے رہے ہیں:

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے تقلید کو حرام قرار دے کر، نیز کتاب اللہ میں یہ تصریح فرما کہ اللہ تعالیٰ تقلید کو قبول نہیں فرمائے گا، نہ آخرت میں مقلد کو معذور اور قابلِ معافی سمجھے گا، بالواسطہ ہر ایک کے لیے خود اعتمادی کے ساتھ دین کا استدلالی علم سیکھنا فرض قرار دیا ہے۔" ❷

"قرآن کے نزدیک اپنے عقل و فکر سے کام نہ لینا، اور دوسروں کی اندھی تقلید کیے جانا، ایسی روش ہے جو افراد اور اقوام دونوں کو جہنم میں جا گراتی ہے۔" ❸

لیکن عملی زندگی میں، مجھے ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کو، جس کی نگاہوں سے ان کا لٹریچر گزرا، یہی نظر آیا کہ انہوں نے تقلید کو دو قسموں میں بانٹ کر، ایک قسم کی تقلید کی پُرجوش مخالفت کی اور دوسری قسم کی تقلید پر کاربند رہے۔ وہ، تقلیدِ قدیم پر تو خوب برستے رہے، لیکن تقلیدِ جدید کا دم بھرتے رہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی تقلید کی تو ڈٹ کر مخالفت کرتے رہے لیکن کارل مارکس، چارلس ڈارون، ہیگل اور برگسان وغیرہ کی تقلید پر کمربستہ رہے۔ حالاں کہ نفسِ تقلید، اگر واقعی بری اور معیوب چیز ہے، تو وہ خواہ قدیم کی ہو یا جدید کی، قابلِ رد و ترک ہے۔ پھر ان کی طرف سے ائمہ اربعہ کی تقلید کی مخالفت کے ساتھ ساتھ آئمہ کفر و الحاد کی تقلید نے، امتِ محمدیہ میں ژولیدہ فکری اور پریشاں خیالی میں اضافہ ہی کیا اور خود اس بات

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۸

❷ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۰

❸ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۶۳

پر مطمئن رہے کہ قرآن کی تعبیر، دورِ حاضر کی علمی سطح کے مطابق کی جا رہی ہے۔ اور غالباً یہی وہ مصلحت تھی کہ علامہ اقبالؒ نے بھی اس دورِ انحطاط و زوال میں تقلید پر زور دیتے ہوئے کہا "تقلید از اجتہادِ دولی تر است۔"

فی الحال، حضرت علامہؒ کے اس موقف کو نظر انداز کیجئے کہ وہ شرعاً درست ہے یا نہیں۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ پرویز صاحب، اگر ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزاد ہوئے تو ائمہ یہود و نصاریٰ کی تقلید میں جا پھنسے اور یوں وہ آسمان سے گرے اور کھجور میں جا اٹکے۔

(۳)......... تیسری چیز، جو میرے لیے موجبِ حیرت اور باعثِ خلجان بنی رہی، وہ ان کی پچاس سالہ "قرآنی خدمات" کا وہ ماحصل ہے، جسے انہوں نے ایسے دل فریب پیرایۂ بیان اور دلکش اسلوبِ تحریر میں پیش کیا ہے کہ قاری، جب تک ان کی تحاریر میں معروف و مگن رہتا ہے، وہ مصنف کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے، لیکن جونہی وہ مطالعۂ کتاب سے فارغ ہو کر سوچنے لگتا ہے، تو وہ محسوس کرتا ہے کہ جناب پرویز صاحب نے برسوں کی خارا شگافی اور کوہ کنی کے نتیجہ میں، جو کچھ قرآن سے برآمد کیا ہے، وہ سب کچھ، مغرب کی مادہ پرست تہذیب میں، پہلے سے موجود ہے۔ فکر اور نظریے کی حد تک ہی نہیں، بلکہ عملاً بھی مدنیت و معاشرت کا وہ پورا نقشہ، جسے قرآن سے کشید کر ڈالنے میں، انہوں نے بڑی زحمت کشی کی ہے، وہ سب کچھ تہذیبِ غالب کے ہاں مروج ہے۔ مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب، مرد و زن کی مطلق اور کامل مساوات، درونِ خانہ فرائضِ نسواں کی بجائے، خواتین کو بیرونِ خانہ مردانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعددِ ازواج کو معیوب قرار دینا، خانگی زندگی میں وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کے دائرۂ عمل کے محیط کو ختم کر ڈالنا اور دونوں اصنافِ بشر کے لیے ایک ہی میدانِ مسابقت قرار دینا، وغیرہ میں سے آخر وہ کون سی چیز ہے جو دورِ حاضر کی مادہ پرست مدنیت میں، پرویز صاحب کی "پچاس سالہ قرآنی خدمات" سے قبل، موجود نہیں تھی۔ رہی اشتراکیت، تو اس کا پورے کا پورا معاشی نظام، "نظامِ ربوبیت" کے نام سے، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے، جبکہ یہ نظام بھی ان کے "قرآن میں غوطہ زن" ہونے سے پہلے، روس میں مسلط ہو چکا تھا۔ پھر آخر اس قرآن کا کیا فائدہ، جس کے بغیر بھی،

دنیائے کفر، ان چیزوں کو اپنائے ہوئے تھی، جنہیں ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے، برسہا برس کی دماغ سوزی کے ساتھ، قرآن سے نچوڑ ڈالا ہے۔

یہ تھیں وہ باتیں جو ہمیشہ میرے لیے (اور میرے علاوہ سوچنے والے ہر دماغ کے لیے) وجۂ پریشانی اور باعثِ خلجان بنی رہی ہیں اور میں جناب پرویز صاحب کے فکر کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں متذبذب رہا، لیکن اس کے باوجود بھی، جب ان کی قرآن سے دلچسپی اور لگن پر غور کرتا، تو میں یہ محسوس کرتا کہ وہ، بہرحال، قرآن مجید کے ساتھ، جو تعلق بھی رکھتے ہیں، وہ مبنی بر اخلاص ہے۔ ان کی ''قرآنی خدمات'' پر خلجان کا شکار ہونے کے باوجود بھی، میں بہرحال، انہیں قرآنِ کریم کا ایک مخلص اور دیانت دار طالب علم خیال کرتا رہا، لیکن افسوس، کہ میرا یہ تأثر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

ہوا یوں کہ میرے ہاں ایک روز، جماعتِ اسلامی کے ایک صاحبِ علم رکن، جن سے میری پرانی شناسائی تھی، بطورِ مہمان ان دنوں تشریف لائے جبکہ میں طلوعِ اسلام کی فائل کی فراہمی کے بعد، اس کے بالاستیعاب مطالعہ پر کمربستہ ہو چکا تھا۔ ان کی تشریف آوری پر، میں، فروری ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں، وہ مقالہ پڑھ رہا تھا، جسے جناب پرویز صاحب نے ''قائدِ اعظم کا پاکستان'' کے زیرِ عنوان شائع کیا تھا۔ اس مقالہ میں، مولانا مودودیؒ کے خلاف انتہائی تلخ نوائی سے کام لیا گیا ہے۔ قلم کی یہ درشتی، ہر اس سلیم الفطرت آدمی پر گراں گزرتی ہے، جو غیر جانب داری کے ساتھ حقیقت کا متلاشی ہو۔ میرے لیے تو، خیر، پرویز صاحب کی یہ درشتی اور تلخ گوئی، نئی بات نہ تھی کیونکہ میرے مطالعہ میں یہ بات آ چکی تھی کہ قیامِ پاکستان کے بعد، مولانا مودودیؒ کے خلاف لب و لہجہ کی یہ ناشائستگی، طلوعِ اسلام کا معمول رہی ہے، لیکن میرے مہمان کے لیے یہ سخت ناگوارِ خاطر تھی۔ جب انہوں نے پورا مضمون پڑھ لیا تو میں نے ان کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم'' میں سے دیئے گئے اقتباسات کو، سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ میں نے جب ثبوت طلب کیا، تو انہوں نے سکوت اختیار کیا۔ چند لمحے کے بعد، خورد و نوش سے فارغ ہوتے ہی، وہ تنہا گھر سے باہر نکل گئے، اور جب تقریباً

ایک گھنٹے کے بعد تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جسے وہ (جیسا کہ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا) جماعتِ اسلامی کے مقامی دفتر سے مستعار لے کر آئے تھے۔ یہ کتاب ''تحریکِ آزادیِ ہند اور مسلمان، حصہ دوم'' تھی، جو ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم'' ہی کا اعادہ شدہ (Revised) ایڈیشن ہے۔ یہ دونوں طباعتیں مولانا مودودیؒ کے ان مقالات و مضامین پر مشتمل ہیں، جو قیامِ پاکستان سے قبل، ہندوستان میں تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں، مسلمانوں کی راہنمائی کرتے ہوئے، ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے اعادہ شدہ ایڈیشن میں یہ خوبی بھی ہے کہ ابتدائی فہرستِ ابواب میں، ان شہور وسنین کو بھی درج کیا گیا ہے جن میں یہ مضامین و مقالات، پہلے پہل، ترجمان القرآن میں شائع ہوئے تھے۔ بہر حال، اس کتاب کے ذریعہ میرے مہمان نے، پرویز صاحب کی بعض واقعی خیانت کاریوں کو ثابت کر ڈالا۔

اس کے بعد میں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے جس کتاب سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش فرمائی ہے، وہ اصل کتاب نہیں ہے جس کا پرویز صاحب نے حوالہ دیا ہے بلکہ اس کا اعادہ شدہ ایڈیشن ہے۔ ممکن ہے کہ اصل کتاب اور اس کے اعادہ شدہ ایڈیشن کی عبارتوں میں فرق ہو۔ یہ اعتراض میں نے اس لیے کیا تھا کہ میں نے طلوعِ اسلام میں یہ پڑھ رکھا تھا:

> ''ان (مودودی صاحب) کے ہاں، بالعموم کتاب کے نئے ایڈیشن میں کافی رد و بدل کیا ہوتا ہے، اور اس کا ذکر نہیں ہوتا کہ اس میں اور سابقہ ایڈیشن میں فرق ہے۔ اس لیے حوالہ کے لیے سابقہ ایڈیشن کا دیکھنا ضروری ہے۔'' ❶

اس پر میرے مہمان نے مجھے اصل کتاب ارسال کرنے کا وعدہ فرمایا، لیکن ساتھ ہی میرے فوری اطمینان کے لیے، اس کتاب کے اعادہ شدہ ایڈیشن میں سے، مولانا مودودیؒ کی یہ عبارت بھی پیش کر دی:

> ''چونکہ یہ مضامین ..... خصوصاً اس کتاب کے جزو اول کے مضامین ..... برسوں

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۴

سے میرے خلاف معاندانہ پراپیگنڈے کے لیے خوب خوب استعمال ہوئے ہیں، اور ان کی باتوں کو سیاق وسباق سے الگ کر کے عجیب عجیب معنی پہنائے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں نے ترتیب ونظر ثانی کے وقت ان کی عبارات میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے۔ اگر کسی چیز کی تشریح کرنے یا کسی چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، تو اسے حاشیہ کی صورت میں درج کیا ہے، اور قدیم وجدید حواشی کے درمیان فرق کرنے کے لیے، قدیم یا جدید کے الفاظ لکھ دیئے ہیں، تاکہ کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو، اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ معترضین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے عبارتوں میں ردوبدل کر دیا گیا ہے۔"●

بہر حال، میرے مہمان نے اپنے گھر کی طرف واپسی سفر کے ہفتہ عشرہ بعد، مجھے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم" ارسال کر دی، جسے پڑھ کر مجھے شرح صدر ہو گیا، اور پرویز صاحب کے بارے میں میرا یہ تاثر کہ "وہ، بہر حال، مخلص اور دیانت دار قرآنی طالب علم ہیں"، متزلزل ہو گیا۔ پھر جوں جوں میں مطالعہ کرتا گیا اور پرویز صاحب کے ایسے ہی کرتب میرے سامنے آتے گئے، تو ان کے صدق واخلاص اور دیانت وامانت کی بابت، میرا تاثر قطعی زائل ہو گیا، کیوں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ قرآنِ کریم کی مخلصانہ خدمت کا یہ بھی کوئی تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرے، یا انہیں قطع وبرید کا نشانہ بنائے، یا ایک عام اور مطلق عبارت کو کسی خاص شخصیت پر چسپاں کر دے، یا ایسی ہی عدل وانصاف کے منافی کوئی اور حرکت کر ڈالے۔ ایسی حرکات کا صدور ہی اس بات کی وزنی دلیل ہے کہ ان کا مرتکب، صدق وخلوص، امانت ودیانت اور عدل وانصاف سے کوسوں دور ہے۔

خلوصِ نیت کا اہم تقاضا:

نبی اکرم ﷺ نے، جب یہ محسوس کیا کہ مکہ وطائف کی سنگلاخ زمین میں ایمان اور نیکی کا بیج جڑ نہیں پکڑ سکتا، تو آپ ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرما گئے، جہاں آپ کو یہ توقع تھی کہ

● تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصہ دوم، صفحہ ۲

ان کی دعوت برگ و بار لا کر رہے گی، کیونکہ اپنی دعوت کے ساتھ، خلوصِ نیت کا یہی تقاضا تھا۔ پاکستان بنتے ہی، اس میں، بقولِ طلوع اسلام، "ملا ازم" قائم ہو گیا، اور حکومتِ پاکستان کو ان "ملاؤں" کے دباؤ کے تحت، قراردادِ مقاصد کو منظور کرنا پڑا۔ یوں حکومت بھی ملوکیت کا روپ اختیار کرتی چلی گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وطنِ عزیز میں سراسر سرمایہ دارانہ نظام ہی برقرار رہا۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں ملوکیت، ملا ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کی سہ گونہ "لعنتیں" مسلط ہو جائیں، وہاں بھلا "قرآنی دین" کیوں کر قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن چین میں، "نفاذِ دین" کے راستے میں رکاوٹ بننے والی یہ تینوں "لعنتیں" ختم ہو چکی ہیں اور بقولِ پرویز صاحب، اہلِ چین، لا کی منزل سے گزر کر، الا کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ وہاں "قرآنی نظام" کا نفاذ، پاکستان کی نسبت، بہت آسان ہے۔ چنانچہ پرویز صاحب ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"اقبال نے نطشے کی فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں

تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس "مجذوبِ فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت، آج اس "سالکِ چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے، یہ اس لیے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامن گیر ہوتی ہیں، چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے۔ وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو خدا تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ یہ وہ حصہ لا ہے جسے طے کیے بغیر، انسان الا اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزلِ الا کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اسے اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے، اور وہ اس راستے کو اختیار کر لے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت، اس جہنم سے بچ سکتی ہے، جس میں اسے بصورتِ دیگر، نامعلوم کتنے عرصہ تک اور جتنا کے مصائب رہنا پڑے، اور اس سے نکلنے کے

لیے، خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں۔" ❶
جبکہ "قرآنی دین" کے نفاذ کے حوالہ سے ہر مسلم ملک کی سرزمین بنجر ہے، جہاں "قرآنی پروگرام" کا بیج، جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

"مسلم ممالک میں سے، اس وقت کوئی بھی، اس کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کردے۔ یہ ممالک، ابھی حصہ لا ہی سے نہیں نکلے، حصہ الا تک کیسے پہنچ سکیں گے۔" ❷

اور تو اور، خود پاکستان، جو اسلام ہی کے نام پر بنا تھا، اس میں بھی مذہبی پیشوائیت کے باعث، نفاذِ "دین" کے امکانات بعید سے بعید تر ہوتے جا رہے ہیں۔

"پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ "اس سے اسلام، اس ٹھپے کو مٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا"۔ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت، اپنے تسلط جما رہی ہے، اس کے پیش نظر، یہاں دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں۔" ❸

اب اس صورتِ حال میں، جہاں پاکستان میں "دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں" اور دیگر مسلم ممالک کی طرح خود پاکستان بھی، سوئے نصب العین چلتے ہوئے ابھی تک "حصہ لا ہی سے نہیں نکلا، تو حصہ الا اللہ تک کیسے پہنچ سکے گا"۔ جبکہ دوسری طرف "چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزل 'الا' کی سرحد پر کھڑا ہے" تو وہاں یقیناً "دین کے تمکن کے امکانات" بڑے روشن دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں خلوصِ نیت کا تقاضا کیا ہے؟ ...... اس پاکستان میں رہ کر، "قرآن کے انقلابی پروگرام" کے نفاذ کی جدوجہد کرتے رہنا، جہاں "دین کے تمکن کے امکانات بہت دور جا پڑے ہیں"؟ ...... یا ...... اس چین میں جا کر تگ و دو کرنا، جو "منفی منازل طے کر لینے کے بعد، دین کی منزل الا کی سرحد پر کھڑا ہے"؟ ......

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۹
❷، ❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۵

بالخصوص جب کہ پرویز صاحب اپنی "قرآنی بصیرت" کی روشنی میں خود فرماتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پروگرام، کسی طرح ماوزے تنگ تک پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے، تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نوعِ انسانی کی تقدیر بدل جائے۔" ❶

اگر کسی کو واقعی اپنے مقصد کے ساتھ عشق ہو، اقامتِ قرآن کا نصب العین اس کی منزلِ مقصود ہو، نفاذِ دین کی تڑپ میں وہ بے قرار ہو، قرآن کے انقلابی پروگرام کی عمل داری تو مرکز کرنے کا تہیہ کر چکا ہو، اور اس کے "دیدۂ تر کی بے خوابیاں"، اور اس کے "دل کی پوشیدہ بے تابیاں" اور اس کے "نالۂ نیم شب کے نیاز" اور اس کی "خلوت و انجمن کے گداز" کا مرکز و محور اور منتہیٰ و غایت، یہی نظامِ ربوبیت کا نفاذ ہو، تو اسے پاکستان میں جدوجہد کرنے کی بجائے، چین ہی کی سرزمین کو اپنی سعی و عمل کا مرکز بنانا چاہیے تھا کیونکہ مقصد کے ساتھ، اخلاص اور صدقِ نیت کا یہی تقاضا قرار پاتا ہے، جسے پسِ پشت ڈال دیا، وہ عمل ہے، جو اگر امام مالک جیسی ہستی سے بھی صادر ہو جائے، تو پرویز صاحب کے نزدیک وہ عمل، قابلِ اعتراض اور لائقِ نکیر بن جاتا ہے۔

امام مالکؒ کے طرزِ عمل پر اعتراضِ پرویز:

علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی اسرار و رموز میں، امام مالک کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے طلوعِ اسلام لکھتا ہے:

"ایک دفعہ ہارون الرشید نے (جس کے ہاتھوں رومی بادشاہ بھی کئی بار شکست کھا چکا تھا) امام مالکؒ سے کہا کہ آپ بغداد تشریف لائیے اور لوگوں کو درسِ حدیث دیجیے۔ امام مالکؒ نے کہا کہ میں نبی اکرمﷺ کی درگاہ کا خادم ہوں۔ میں مدینہ چھوڑ کر بغداد نہیں آ سکتا۔ مدینہ طیبہ کی خاک میرے لیے سامانِ زیست ہے۔۔۔ اور میرے لیے عشق کا فرمان یہ ہے کہ ملازمت، خواہ بادشاہ کی بھی کیوں نہ ہو، مت اختیار کرو، اس لیے میں تمہارا نوکر بن کر وہاں نہیں آنا چاہتا۔" ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۵

❷ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۳

امام مالکؒ کے اس جواب پر، جناب پرویز صاحب یوں نکیر فرماتے ہیں:

''امام مالکؒ کے جواب کا پہلا حصہ (اگر وہ انہی کا جواب ہے) تو کچھ ایسا وقیع نہیں تھا۔ معلم کو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کی تعلیم کے لیے کون سا مقام زیادہ مناسب، اور کون کی فضا زیادہ سازگار رہے، یا کون سے مقام پر اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس میں بغداد و بصرہ کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہیے۔'' ❶

کاش، جناب پرویز صاحب بھی، ''نفاذِ قرآن'' اور ''تعلیم قرآن'' کے لیے، چین کا رُخ فرماتے جس کی سرزمین، اس مقصد کے لیے زیادہ مناسب اور جس کی فضا زیادہ سازگار تھی، اور وہ کراچی، لاہور یا پنجاب کی تمیز نہ فرماتے۔

ظاہر ہے کہ امام مالکؒ کا یہ جواب، ان لوگوں کے لیے کیوں کر وقیع قرار پا سکتا ہے، جو مسلمان بادشاہ تو رہے ایک طرف، سات سمندر پار سے آنے والی طاغوتی حکومت کی چاکری کو، اپنا ''ذریعۂ معاش'' بناتے رہے ہیں۔

پرویز صاحب کے قول و عمل کا یہ تضاد کہ قلمی طور پر نظامِ طاغوت کے خلاف جہاد کرنا مگر عملی طور پر اس نظام کی مشینری کا کل پرزہ بن کر ''رزقِ حلال'' کمانا، مخالفین کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر مسخ و تحریف کا نشانہ بنانا، اپنے حریفوں کے خلاف تہمت طرازی اور بہتان تراشی کی روش اختیار کرنا، دوسروں کے کارناموں کو اپنے ذاتی کارنامے قرار دینا، علمی مباحث میں اپنے کمزور موقف کے مقابلے میں اگر مخالفین کا موقف قوی ہو تو اسے اپنے قارئین کی نگاہوں سے اوجھل رکھنا، قلب و زبان میں عدمِ موافقت کی بنا پر متضاد اور متناقض آراء و نظریات کو پیش کرتے رہنا، یگانوں اور بیگانوں کے لیے جداگانہ معیار اور متفرق پیمانے اپنانا، وغیرہ وہ باتیں ہیں جن کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے کردار میں، امانت و دیانت، عدل و انصاف، صداقت و اخلاص کی کوئی چھینٹ، خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی نظر نہیں آتی۔ آئندہ صفحات میں اس حقیقت کے شواہد قارئین کرام کو بکثرت مل جائیں گے۔

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۳

ایک اشکال اور اس پر کلام:

ممکن ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ پرویز صاحب، اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، کیا بعد از مرگ، ان کے فکر و عمل پر نقد و نظر ہو سکتی ہے؟

اس سوال کے دو پہلو ہیں: (۱)..... اُن کے افکار و نظریات پر تنقید۔ (۲)..... ان کے اُس طرز عمل کی جانچ پرکھ، جس میں وہ اپنے نظریاتی حریفوں کی مخالفت میں ایسا رویہ اپناتے رہے ہیں جو کسی دیانت دار اور انصاف پسند شریف شہری کو بھی زیب نہیں دیتا، کجا یہ کہ وہ رویہ کسی مفسر قرآن یا مفکر قرآن کے شایان شان ہو۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، اس کے بارے میں، خود طلوع اسلام نے یہ کہہ کر، اثبات میں جواب دیا ہے:

”اگر ایک شخص ایسے خیالات دنیا میں چھوڑ جاتا ہے جو اُس کے مرنے کے بعد بھی، دنیا کو متاثر کر سکتے ہیں، تو ان خیالات پر تنقید ضروری ہوتی ہے، تا کہ لوگ غلط خیالات کی اتباع سے تباہی کے راستے پر نہ چل نکلیں۔“ ❶

لیکن کیا ان کے عملی کردار کو بھی معرض تنقید میں لایا جا سکتا ہے؟ یہ سوال قدرے پیچیدہ ہے، کیونکہ اگر ایک پہلو سے ایسا کرنا ناجائز دکھائی دیتا ہے تو دوسرے پہلو سے اس کا جواز بھی نظر آتا ہے۔ عدم جواز کے پہلو سے، بعد از مرگ، ان کے عملی کردار کو زیر بحث لانا، اخلاقاً معیوب اور شرعاً ایک مفسدہ ہے، لیکن جواز کے پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا عملی رویہ ایسا نہ تھا جس کے اثرات، صرف ان کی ذات تک ہی محدود رہے ہوں، بلکہ ایسا تھا کہ یہ اثرات، دوسروں تک بھی متعدی اور وسیع تھے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کے خلاف ایسا گرد و غبار اٹھایا کہ اصل حقائق بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اپنی تحریروں سے ایسی فضا باندھی، جس سے لوگوں کے قلوب و اذہان شکوک و شبہات کے کانٹوں سے اٹ گئے، بعض لوگوں کے خلاف انتہائی نفرت کا زہر پھیلایا، بعض پر خوب کیچڑ اچھالا، اور مسخ حقائق سے کام لیا۔

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶۷

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں اسلام یہی کہتا ہے کہ اٹھا ہوا گرد و غبار، اب اٹھا ہی رہنا چاہیے؟ اسے ختم نہ کیا جائے؟ اور لوگوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات کے جو کانٹے چبھ گئے ہیں انہیں چبھے ہی رہنا چاہیے؟ وہ باہر نہ نکالے جائیں؟ اور جن کے خلاف نفرت کا زہر پھیلایا گیا ہے، اُن کے خلاف، اس زہر کو پھیلا (اور پھیلتے) ہی رہنا چاہیے؟ اس کا ازالہ نہ کیا جائے؟ اور جن پر کیچڑ اچھالا گیا ہے، انہیں کیچڑ سے لت پت ہی رہنا چاہیے؟ ان کا دامن صاف نہ کیا جائے؟ اور جن حقائق کو مسخ کر کے، ان پر پردہ ڈالا گیا ہے، وہ بدستور مسخ ہی رہیں؟ ان کا پردہ چاک نہ کیا جائے؟ کیا اسلام یہی کہتا ہے؟

جب ہم اس پہلو سے اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صورت حال کو جوں کا توں چھوڑ کر، غیر جانبدار بن کر بیٹھ رہنا، اور خاموش تماشائی بن کر رہ جانا، ایک عظیم تر مفسدہ دکھائی دیتا ہے، بہ نسبت اس مفسدہ کے، جو پہلے مذکور ہو چکا ہے، کیونکہ وہ عیوب و ذنوب جن کے اثرات، دوسروں تک بھی متعدی ہوں، ناقابل اغماض ہوتے ہیں۔ ان کے متعدی مضرات سے دوسروں کو بچانا، بجائے خود ایک نیکی ہے، اور جنہیں کیچڑ میں لت پت کیا گیا ہے، انہیں پاک صاف کرنا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں آلودۂ غلاظت رہنے دیا جائے۔ فلہذا، اس پہلو سے ہم مجبور ہیں کہ ''مفکر قرآن'' کے جس طرز عمل سے اب تک دوسروں کو نقصان پہنچ رہا ہے، اسے بھی میزانِ اسلام میں تول کر دیکھا جائے، کہ اس کا کیا وزن قرار پاتا ہے۔ یہاں بھی اھون البلیتین (Lesser Evil) کا تقاضا، اس امر کا متقاضی ہے کہ عظیم تر برائی سے بچنے کے لیے، چھوٹی برائی کو گوارا کیا جائے۔

اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں، مجھے اس بات کا پیشگی اندازہ (ہی نہیں، بلکہ پختہ یقین) ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ہمارے معاشرے کے تین مختلف طبقات کی طرف سے تین جداگانہ ردعمل ظاہر ہوں گے۔

(۱) وہ طبقہ جو قرآن و سنت کی حجیت کا قائل ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اطاعتِ خداوندی، اطاعتِ رسولؐ کے بغیر ممکن نہیں ہے، وہ اسے اپنے دل کی آواز سمجھے گا، اور ذہن و دماغ اور

قلب و روح کی پوری آمادگی کے ساتھ مصنف کی تائید کرے گا اور اس کے ہم قدم و ہم رکاب رہے گا۔

(۲) دوسرا وہ گروہ، جو طلوع اسلام کے لٹریچر کا سطحی اور یک طرفہ مطالعہ کر کے اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کر کے مطمئن ہو چکا ہے وہ اس کتاب کو پڑھ کر تذبذب کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہوگا کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ ایک طرف، اگر وہ پرویز صاحب کی شگفتہ تحریر سے متاثر ہو کر، "مفکر قرآن" کے خلوص قلب کا قائل ہو چکا ہے، تو دوسری طرف، اس کتاب کا حقائق پر مشتمل مواد، اس کی اُس عقیدت پر سخت چوٹ لگائے گا، جو پرویز صاحب کے لیے اس کے سویدائے قلب میں پیدا ہو چکی ہے۔ تذبذب کے اس دوراہے پر، کسی بھی راستے پر پیش قدمی کرنے سے پہلے، اگر اس نے تحقیق سے کام لیا، اور جن کتب و رسائل کے حوالے، اس میں دیے گئے ہیں، ان تک رسائی پا کر، حقیقتِ حال کو جاننے کی کوشش کی تو وہ مصنف کی تحقیق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بالآخر کرگسوں کی صحبت میں پلنے والا، یہ فریب خوردہ شاہین اپنے اصل مقام کی طرف پلٹ کر، رہ و رسمِ شہبازی اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔

(۳) تیسرا ٹولہ، اُن لوگوں پر مشتمل ہے، جو سالہا سال سے، طلوع اسلام کے لٹریچر کا یک رخا مطالعہ کر کے، ہر اُس جماعت اور ہر اُس فرد کے خلاف، اپنے سینوں میں کینہ و کدورت پیدا کر چکے ہیں، جس کے خلاف ایسا کرنا طلوع اسلام کا نصب العین بن چکا ہے۔ یہ لوگ اپنے مسلک کی حمایت میں اور اپنے فکری مخالفین کی مخالفت میں، اپنے قلوب و نفوس میں شدید حمیتِ جاہلیہ، سنگین تعصب اور سخت ضد پیدا کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اس کتاب کے مطالعہ کا وہی اثر ہوگا جو نزولِ قرآن نے مشرکینِ عرب کی ذہنیتوں پر کیا تھا (وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا) اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی چیخیں نکل جائیں گی، وہ چلائیں گے، شور مچائیں گے، سب و شتم اور دشنام طرازی پر اتر آئیں گے اور یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیں گے:

دیکھنا، لینا، پکڑنا، دوڑنا، جانے نہ پائے   نے چلا میری شکیبائی، وہ کافر، لے چلا

اور عین ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے، ان دوست نما دشمنوں کی سازشوں کے نتیجہ میں،
مجھے خداوندِ کریم مرتبہ شہادت سے نواز دے۔ حرمتِ رسولؐ کے دفاع میں! اگر یہ سعادت میسر
آجائے تو اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے۔

سر تیرے قدموں پہ ہو، اور قضا آجائے   ایسے انجام سے بہتر، کوئی انجام نہیں

اس لیے کہ حرمتِ رسولؐ اور عزتِ نبیؐ کے دفاع کا تقاضا محض نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے
اعمال سے پورا نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے تو اپنی جان کو فدا کرنا لازم ہے۔

نماز اچھی، روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھی، حج اچھا
مگر میں باوجود اس کے، مسلماں ہو نہیں سکتا

نہ جب تک کٹ مروں میں، خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

بہرحال، اس ٹولے کے افراد، کتاب میں مذکور واقعات و دلائل کو نظر انداز کرتے ہوئے،
الٹا یہ شور مچائیں گے کہ یہ پرویز صاحب کی کردارکشی ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ، خدا خوفی کے زیرِ سایہ
آخرت میں اپنی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے، کبھی تنہائی میں بیٹھ کر، ٹھنڈے دل و دماغ
سے، صبر و سکون کے ساتھ غور فرمائیں تو خود ان کا ضمیر، ان کے سامنے یہ سوال رکھے گا کہ
---- پرویز صاحب کا اپنے نظریاتی مخالفین کے ساتھ، کذب و زُور، تہمت طرازی اور بہتان
تراشی، خیانت و بددیانتی، مغالطہ دہی اور فریب کاری، دوسروں کی عبارات میں قطع و برید کی فن
کاری کو اپنائے رکھنا، اور ۱۹۳۵ء کے مقدمۂ بہاولپور کے سلسلہ میں، علماء کرام کی کارگزاری کا سہرا
اپنے سر باندھنا، کیا ان کے نظریاتی حریفوں کی کردارکشی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ لیکن
اگر واقعتاً یہ کردارکشی ہی ہے جو وہ عمر بھر علماءِ کرام کی کرتے رہے ہیں تو پرویز صاحب کے لیے اس
کا قرآنی جواز کیا ہے؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اگر پرویز صاحب، مذکورہ بالا جملہ پرویزی
ہتھکنڈوں کو کام میں لاتے ہوئے، اپنے فکری مخالفین کی "کردارکشی" کریں، تو یہ بجا اور درست

ہو، لیکن اگر کوئی دوسرا، اس "کردار کشی" کی حقیقت کو بے نقاب کر ڈالے، تو یہ عمل نہ جائز بلکہ الٹا کردار کشی قرار پائے؟ آخر یہ کیوں؟

ابھی سے سوچ لو، وگرنہ حشر کے روز میرے سوال کا تم سے جواب ہو کہ نہ ہو

مجھے یہ بھی پیشگی اندازہ ہے کہ اس کتاب کے مواد کے بارے میں، وابستگانِ طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ کہا جائے گا (جیسا کہ یہ اکثر کہا کرتے ہیں) کہ پرویز صاحب (یا طلوعِ اسلام) کی عبارات اور اقتباسات کو توڑ مروڑ کر لکھا گیا ہے۔ میں قارئینِ کرام سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ جو شخص، یہ بات کہے، اس سے کہیے کہ "جو اقتباسات اور حوالے، اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں، وہ ان سے متعلقہ کتب و مجلات کو لے آئے، اور اس کے بعد آپ کو بتائے کہ کہاں الفاظ کو توڑا مروڑا گیا ہے، اور کہاں عبارات کو غلط پیش کیا گیا ہے"۔ آپ اس کا شدت سے مطالبہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ فکرِ پرویز کی تردید میں، برسوں میرے مقالات و مضامین، مجلہ "محدث" میں شائع ہوتے رہے ہیں، طلوعِ اسلام کے کارپردازوں کو کبھی اس کی جرأت و ہمت نہیں ہوئی کہ میرے نقطۂ نظر کو اپنے ہاں صحت کے ساتھ نقل کر کے، اس کا جواب دے سکیں، اگرچہ وہ اپنی اس اخلاقی کمزوری کو، ہمیشہ اس پندار کے نقاب میں چھپاتے رہے ہیں کہ "ہم ان کے جواب کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس پر تبصرہ کیا جائے"۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ تاریکی کے ان کیڑوں جیسے ہوتے ہیں جنہیں ظلمت ہی راس آتی ہے اور وہ حقائق کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتے۔

اگر اب بھی وابستگانِ طلوعِ اسلام، اس کتاب کی تردید لکھنے کی جرأت و ہمت اپنے اندر پائیں، تو انہیں چاہیے کہ ہمارے موقف کو من و عن شائع کر کے، پھر اس پر جتنی چاہیں تنقید فرمائیں۔ اگرچہ میرا سابقہ تجربہ (جس کی ایک جھلک آپ گیارھویں باب کے مطالعہ سے پائیں گے) یہ واضح کر دیتا ہے کہ

نہ خنجر اٹھے گا، نہ تلوار ان سے یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

آخر میں میں اس کتاب کے قارئین کی خدمت میں یہ گزارش کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اس کتاب کو پڑھ کر محض اپنی الماری کی زینت بنا کر نہ رکھ دیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھائیں اور بالخصوص، ان سادہ لوح لوگوں کو، جو اپنی سادگیٔ طبع کے باعث، خلوصِ دل سے، پرویز صاحب کے دامِ ہم رنگِ زمیں کا شکار ہو چکے ہیں تا کہ ان پر "مفکرِ قرآن" کی دروغ گوئی، خیانت کاری، فریب دہی کی کارروائیوں سے یہ واضح ہو جائے کہ ان "اخلاقی فضائل" کے ساتھ، وہ جو تفسیرِ قرآن لکھ چکے ہیں، اس کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اور ان کی جن "قرآنی خدمات" کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، میزانِ عدل میں ان کا کیا وزن ہے؟

پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

باب اوّل

دل اور زبان میں عدمِ موافقت

جھوٹ کی مختلف صورتوں میں سے، ایک صورت یہ ہے کہ انسان کے دل اور زبان میں مغایرت پائی جائے۔ جو کچھ اُس کے دل میں ہو، وہ، زبانِ دہن یا لسانِ قلم پر نہ آئے، اور جو کچھ وہ اپنی زبان سے ظاہر کرے، وہ اس کے دل میں نہ ہو۔ اُس کی زبان و قلم، اُن نظریات و معتقدات کو پیش کرے، جن سے اس کا قلب و ذہن بیزار ہو، اور جن افکار و تصورات کو وہ اپنے دل میں راسخ کیے بیٹھا ہو، انھیں وہ کسی مصلحت کے باعث ظاہر کرنے سے گریزاں ہو۔ اس طرح قلب و لسان کی یہ عدمِ موافقت، بجائے خود، ایک جھوٹ ہے، خواہ الفاظ کی حد تک، جو کچھ بیان کیا جارہا ہو، وہ مطابقِ حقیقت ہی ہو۔ خود قرآن مجید، جن صورتوں پر کذب کا اطلاق کرتا ہے، اُن میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ زبان، دل کی رفیق نہ رہے۔

﴿ إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ ﴾[المنافقون: ۱]

"جب منافق آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ رسولِ خدا ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ آپؐ (واقعی) اُس کے رسول ہیں، اللہ گواہ ہے کہ یہ منافقین قطعی جھوٹے ہیں۔"

یہاں منافقین کی یہ شہادت کہ "آپؐ اللہ کے رسول ہیں" بالکل مطابقِ حقیقت ہے، کیوں کہ آپؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود، قرآن اور خدائے قرآن، منافقین کو دروغ گو قرار دیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں، وہ کچھ ان کے دل میں نہیں ہے، اور جو کچھ اُن کے دل میں ہے، اُسے ظاہر کرنے کی بجائے، وہ اسے چھپائے ہوئے ہیں۔ اس طرح اُن کی شہادت لفظاً اور قولاً، مطابقِ واقعہ ہونے کے باوجود بھی، صریح جھوٹ ہے،

کیوں کہ اس کے پس پردہ قلبی تصدیق مفقود ہے۔

ٹھیک یہی کیفیت، ہمارے "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز کی بھی ہے۔ قلب وزبان کی عدمِ رفاقت اگرچہ ان کی پوری زندگی پر محیط رہی ہے، لیکن اس کا سب سے نمایاں دور، وہ ہے جب وہ تقسیم برصغیر سے قبل، سنت نبویؐ سے اپنا اعتقادی رشتہ توڑ چکے تھے، لیکن وہ، اپنے قلم اور زبان سے، اُن ہی خیالات ونظریات کا اظہار کرنے پر مجبور تھے، جو ملت اسلامیہ میں مقبولِ عام تھے، حتی کہ ۱۹۳۵ء میں، مارچ اپریل کے۔ ماہنامہ معارف کے شماروں میں، پرویز صاحب نے منکرینِ حدیث کی تردید وابطال کرتے ہوئے، حدیث نبوی کی دینی حیثیت کا پرزور اثبات کیا تھا (مجلہ معارف، سید سلیمان ندویؒ کی زیرِ نگرانی، اعظم گڑھ، بھارت سے شائع ہوا کرتا تھا)۔ یہ بالکل وہی ٹیکنیک تھی، جو دعویٰ نبوت سے قبل، مرزا غلام احمد قادیانی نے اختیار کر رکھی تھی۔ بقول طلوع اسلام:

> "مرزا غلام احمد، ایک مناظر کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے، اور بہت مقبول ہو گئے، انہی موضوعات پر، انہوں نے اپنی کتاب "براہین احمدیہ" شائع کی جسے مسلمانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس کی تعریف کی۔" ❶

بالکل اسی طرح، جناب غلام احمد پرویز صاحب، منکرینِ حدیث کے خلاف، حامیٔ حدیث اور مدافعِ سنت ہونے کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اُن دنوں، ماہنامہ نگار کے ایڈیٹر، نیاز فتح پوری صاحب وہی کچھ کہہ رہے تھے، جو بعد میں، پرویز صاحب کا مستقل تکیۂ کلام بنا رہا، لیکن اُس دور میں، وہ نگار میں شائع ہونے والی تحریروں کے خلاف، خود مقالات ومضامین لکھا کرتے تھے، جو مختلف مجلات میں اشاعت پذیر ہوتے تھے، حالاں کہ وہ اس وقت بھی ذہناً سنتِ نبویہ سے منحرف اور حدیثِ رسولؐ کے خلاف تھے، لیکن، بہرحال، مسلمانوں میں ہر دلعزیزی (Popularity) حاصل کرنے، اور ان کی نگاہوں میں حامیٔ حدیث اور معتقدِ سنت قرار پانے

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۳۴

کے لیے مجبور تھے کہ منکرین حدیث کی تردید و ابطال کرتے رہیں۔ ان کا یہ رویہ طلوعِ اسلام کے اجراء تک ہی نہیں، بلکہ خود طلوعِ اسلام میں بھی ایک مدت تک باقی و برقرار رہا ہے، اور مسلکِ انکارِ حدیث کا کھلے بندوں دم بھرنے سے ایک عرصہ قبل تک، وہ معتقدِ سنت اور حامیٔ حدیث بن کر، اسی طرح مسلمانوں میں اپنی مقبولیت میں اضافہ کرتے رہے، جس طرح اُن کے ہم نام پیش رو، غلام احمد قادیانی، انکارِ ختمِ نبوت کا عقیدہ اپنانے سے قبل، ختمِ نبوت کے اجماعی عقیدہ کو پیش کرتے ہوئے، مقبولِ عام بنے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں چند اقتباساتِ پرویز ملاحظہ فرمایئے۔ جن میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت پر اعتقاد بھی موجود ہے۔

(۱)..... ''جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں، ان کے باہمی معاملات کا تصفیہ، ازروئے کتاب وسنت صرف مسلمانوں کی جماعت، ان کی اپنی مجلس شوریٰ، اور اس مجلس کا امیر، مرکزِ ملت ہی کر سکتا ہے۔ ❶

(۲)..... جناب رازی مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو، قرآن وسنت کی روشنی میں، کس حسن وخوبی سے حل کرتے ہیں۔ ❷

(۳)..... یہ چیز طلوعِ اسلام کے مقاصد کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا مسلک، حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے نورِ بصیرت کو عام کرنا، یعنی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق، ہر مسئلہ کا حل، کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کرنا ہوگا۔'' ❸

ضمناً، یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ علامہ اقبال کا مسلک، جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے، کتاب وسنت ہی ہے، اُن کے نورِ بصیرت کو عام کرنے کا مطلب، اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسائلِ حیات کا حل، کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد، جب پرویز صاحب نے کھلے بندوں مسلکِ انکارِ حدیث کو اپنایا، اور ''قرآن وسنت'' کی بجائے، فقط ''قرآن'' کی رٹ لگانا شروع کی، تو مسلکِ اقبال کو بھی، پرویز صاحب نے اپنے

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۸
❷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۹۰
❸ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲

حالیہ ظاہر کردہ عقائد کی بھینٹ چڑھا دیا، اور یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ علامہ اقبال ''پکے از منکرینِ حدیث'' تھے۔ اس سے یہ واضح ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب، علامہ اقبال کے افکار کی تشریح و تفسیر پیش کیا کرتے تھے یا ترمیم و تغییر۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب، علامہ اقبال کے نام کی آڑ میں، اپنے افکارِ باطلہ کے کھوٹے سکوں کو، اُسی طرح سُوقِ علم میں لایا کرتے تھے، جس طرح یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکہ، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر، اپنے معتقداتِ باطلہ کو منڈی کا مال بنا کر پیش کیا کرتے تھے، اور پھر قرآن کریم کو، اُن کی تردید میں یہ کہنا پڑا کہ مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. آج ہم بھی یہ حقیقت واشگاف کرنے پر مجبور ہیں کہ علامہ اقبال کا مسلک، مسلکِ انکارِ حدیث ہرگز نہ تھا، بلکہ قرآن و سنت ہی اُن کا مسلک تھا، اور یہ کشفِ حقیقت بھی، ہم کسی اور ذریعے سے نہیں، بلکہ طلوعِ اسلام ہی کے ذریعے سے کر رہے ہیں کہ:

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

اس ضمنی وضاحت کے بعد، زیرِ بحث مسئلہ کے ضمن میں مزید اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

(۴)..... اس مسئلہ (یعنی مسئلہ قومیت) کے متعلق، مولانا (مودودیؒ) صاحب کا مسلک وہی ہے جس کی تائید، کتاب و سنت سے ہوتی ہے، اور جس کی اشاعت کی سعادت، طلوعِ اسلام کو بھی حاصل ہے۔'' ❶

(۵)..... ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹ حضرات کی واقفیت کے لیے سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کے حوالوں سے بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے، اور اس کے بعد، ان حضرات کے لیے، جو یہ معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک اس نظام کی کیا قدر و قیمت ہے، یہ عرض کریں کہ کتاب و سنت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۳

❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۴

(۱۴) .... حیرت ہے کہ یہ حضرات، اگر کتاب و سنت کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں، تو کیا روز مرہ کے واقعات بھی، ان کے سامنے نہیں آتے۔ ❶

مشتے نمونہ از خروارے، یہ چند اقتباسات ہیں، جن میں قرآن کے ساتھ سنت رسول اللہ ﷺ کو بھی قوانین اسلام اور احکام دین کا ماخذ قرار دیا گیا۔ ان سب حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سنت کے متعلق، پرویز صاحب کے دل میں خواہ کچھ بھی ہو، مگر ان کا قلم، ان دنوں قرآن و سنت کا وکیل، حامی، مؤید اور معتقد تھا، لیکن پھر جوں جوں طلوع اسلام کا حلقہ قارئین، بڑھتا چلا گیا، اور پرویز صاحب، قرآن مجید کے ساتھ، سنت کا بالالتزام، نام لیتے لیتے "پاپولر" بنتے چلے گئے، تو پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا نقاب اٹھانا شروع کیا، اور پھر وہ وقت بھی آ گیا، جب بلی مکمل طور پر تھیلے سے باہر آ گئی، اور وہ کھل کر مسلک انکار حدیث کا دم بھرنے لگے، بالکل اسی طرح، جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی، ایک عرصہ تک اپنی خدمات اسلام کے ذریعے، اہل اسلام کے قلوب میں، اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے، عقیدۂ ختم نبوت کا راگ الاپتے رہے، اور پھر یکایک ختم نبوت کے عقیدہ کو پس پشت ڈال کر، خود دعویٰ نبوت پر اتر آئے مگر اس فرق کے ساتھ، کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے معاملہ میں، عقیدۂ ختم نبوت کے انکار و اقرار کے درمیان، کوئی ایسا "عبوری دور" نہیں تھا، جس میں انہوں نے کسی لمبے چوڑے تدریجی عمل کو اختیار کرتے ہوئے، ایک عقیدہ کی جگہ، دوسرے عقیدہ کو اپنایا ہو، مگر پرویز صاحب نے ایسا کرنے میں تدریج کو اپنایا، جس میں ایک "عبوری دور" ایسا بھی گزرا ہے، جو غالب عامیانہ انداز میں، حدیث و سنت کے بعض پہلوؤں پر، شکوک و شبہات کے اظہار کا دور تھا، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعہ ایسے جملہ اوہام و شبہات کا ایسا کافی، شافی، وافی اور اطمینان بخش ازالہ کر چکے تھے، جو پیاسے کے لیے سیرابی اور مضمحل کے لیے شفایابی کا باعث تھا، لیکن پرویز صاحب، ذہنی طور پر جہاں تھے، وہیں کے وہیں رہے۔ کیوں؟ اس کا جواب، ڈاکٹر منظر احمد صاحب کا مندرجہ ذیل اقتباس فراہم کرتا ہے۔

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۱

"سب سے پہلے مسٹر پرویز نے بعض احادیث کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات پیش کیے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن میں ان شبہات کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا۔ لیکن پرویز صاحب کے شبہات، ایک جویائے حق اور مخلص قلب کی کھٹک نہ تھی جو افہام و تفہیم کے ذریعہ دور ہو جاتی۔ ان کے یہ شکوک، ایک برخود غلط قلب کے شکوک تھے، جو رفتہ رفتہ بشاخ در شاخ اور پختہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ ان کو سنتِ رسولؐ سے عناد پیدا ہو گیا۔"●

بہرحال، پرویز صاحب، اپنے شکوک و شبہات کے سلسلہ کو طول دیتے ہوئے، تدریجاً انکارِ سنت کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہ عبوری دور، اور اس سے قبل کا زمانہ، جس میں پرویز صاحب، اعتقاد برحدیث ہی نہیں، بلکہ دفاعِ سنت کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے ہیں، دراصل، ان کا وہ عہدِ زندگی ہے جس میں ان کی زبان، دل کی رفیق نہیں رہی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں، اسلم جیراج پوری (جو اپنے وقت میں مسلکِ انکارِ حدیث کے علم برداروں میں سے تھے) کی صحبت اختیار کرنے سے قبل ہی، وہ ذہنی طور پر، حدیث و سنت سے منحرف ہو چکے تھے، لیکن مسلم عوام میں "پاپولیریٹی" پا لینے کی خاطر، وہ، قرآن کے ساتھ، سنت کا نام لینے پر بھی مجبور تھے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ممکن ہے کہ ۱۹۳۹ء کے پیش کردہ مندرجہ بالا اقتباسات کے بارے میں، کوئی شخص، یہ محسوس کرے کہ ...... "اس دور میں، ہو سکتا ہے کہ، پرویز صاحب، خلوصِ قلب کے ساتھ، قرآن کے ساتھ ساتھ، سنت کے بھی معتقد ہوں، اور بعد میں ان کے نظریات بدل گئے ہوں، آخر یہ اصرار کیوں کیا جائے کہ اس زمانہ میں وہ قلباً سنت سے منحرف تھے" ...... تو اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ۱۹۳۹ء سے گیارہ سال قبل، ۱۹۲۸ء میں، جب انہوں نے صرف اور صرف قرآن کی بنیاد پر، انسائیکلو پیڈیا لکھنے کا منصوبہ بنایا، تو اس سلسلہ کی پہلی کڑی، معارف القرآن جلد اول تھی، جسے طلوعِ اسلام نے یوں متعارف کروایا:

● قرآن کی معنوی تحریف، صفحہ ۸۲

"جناب پرویز صاحب نے سلسلۂ معارف القرآن کی ابتدا ۱۹۳۸ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا اللہ، جو بعد میں من ویزداں کے نام سے شائع ہوئی۔"❶

اس کتاب کو "قرآن وسنت" کی بجائے، "خالص" قرآن کی اساس پر لکھا جارہا تھا، خود پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"معارف القرآن میں وہی کچھ لکھا گیا ہے جو میں نے خالص قرآن کریم سے سمجھا ہے کہ یہی اصول، اس کتاب کا نقطۂ ماسکہ ہے۔"❷

اس حقیقت پر (کہ ۱۹۳۸ء تک، وہ سنتِ نبویؐ سے کٹ کر محض قرآن ہی کی حجیت وسندیت ہو چکے تھے)، اُن کا یہ اقتباس بھی شاہد ہے۔

"رواں سال کے شمارے، میں، ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو، اپنی عمرِ رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں جس کا خصوصیت کے ساتھ، طلوعِ اسلام کے صفحات پر ذکر کیا جاتا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں، پچاس سال پورے کر رہا ہوں، عام اصطلاح میں، اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔"❸

اس سے یہ قطعی واضح ہے کہ ۱۹۷۸ء سے پچاس سال قبل، یعنی ۱۹۲۸ء میں، وہ سنتِ رسولؐ سے دامن کش ہو کر، صرف قرآن ہی کی سندیت اور حجیت پر ایمان لا چکے تھے، اور فرقۂ اہلِ قرآن سے وابستہ ہو کر، پختہ "قرآنی ذہن" بن چکے تھے، لیکن اپنے ضمیر کے خلاف، مقالات ومضامین میں، وہ مصلحتاً قرآن کے ساتھ، سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبیؐ کا ذکر کرنے پر مجبور تھے۔ اس سلسلہ میں، اس سے قبل، طلوعِ اسلام ۱۹۳۹ء کے شماروں میں سے اقتباسات پیش کیے جا چکے ہیں۔ اب چند مزید وہ اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں، جو ۱۹۳۸ء کے بالکل ابتدائی شماروں سے ماخوذ ہیں۔

(۱)... طلوعِ اسلام کا نصب العین، ان تمام سوالات کے حل، کتاب وسنت کی

---

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳
❷ معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۵۳ ❸ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱

روشنی میں پیش کرتا ہے۔ ❶

(۲)..... ہمارا دعویٰ ہے، اور علیٰ وجہ البصیرت یہ دعویٰ ہے کہ قرآن وحدیث وآثار و تاریخ میں کہیں ایک سند بھی، اس چیز کے اثبات میں نہیں ملے گی کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے انفرادی طور پر، دوستی اور تولّی کے تعلقات قائم کیے ہوں، اگر کسی کو اس میں شک ہو تو اپنے دعویٰ کے اثبات میں کوئی ایک سند پیش کرے۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ❷

(۳)..... کتاب وسنت کی ان تصریحات کو سامنے رکھیے، اور پھر دیکھیے کہ اگر مسٹر جناح یا کوئی اور مسلمان یہ کہہ دے کہ: (۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحادِ عمل کی صرف یہی صورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان من حیث الجماعت معاہدہ ہو، اور: (۲) ایک فریق کو مسلمانوں کی نمایندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور دوسرے فریق کو غیر مسلموں کی نمایندہ جماعت ...... تو کہیے کہ اس نے کون سا جرم کیا؟ ❸

(۴)..... ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن وسنت کی رو سے صرف یہی راستہ، صراطِ مستقیم ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں طلوعِ اسلام، قرآن وسنت برابر پیش کر رہا ہے، جو قومیت پرست اس مسلک کو غلط سمجھتے ہیں، وہ خدارا، قرآن وسنت سے، اپنے دعویٰ کے اثبات میں کوئی دلیل پیش کریں۔ ❹

(۵)..... ایک صاحب فرماتے ہیں کہ: ...... "طلوعِ اسلام کا مسلک، جمہور کا مسلک ہے، لیکن چونکہ یہ ضروری نہیں کہ جمہور کا مسلک، ہمیشہ حق وعدل کا مسلک ہو، اس لیے طلوعِ اسلام کا مسلک غلط ہے"...... لیکن ان کے ہم مشرب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ...... "طلوعِ اسلام کا مسلک جمہور کا مسلک نہیں ہے اور چونکہ صحیح مسلک جمہور کا ہوتا ہے، اس لیے طلوعِ اسلام کا مسلک صحیح نہیں"......

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۱

❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۲

❸ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۵

❹ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۹

حالانکہ طلوعِ اسلام کا مسلک، صرف کتاب و سنت ہے۔'' ❶

(۱)...... آیئے! ہم بتائیں کہ حصولِ آزادی کے متعلق، کتاب و سنت کی رو سے مسلمانوں کا مسلک کیا ہو سکتا ہے، یہ وہ مسلک ہے جس کے ہم داعی ہیں، اور علی وجہ البصیرت مدعی ہیں۔ ❷

اور بعض اوقات، سنت کی بجائے، ''اسوۂ رسولؐ'' کی ترکیب بھی استعمال کی جاتی تھی، اور اسے قرآن مجید کے بعد، دوسرا ماخذِ شریعت مانا جاتا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

''اپنے ماحول کو مدنظر رکھ کر، قرآن و اسوۂ حسنہ کی روشنی میں جو مسائل، انہوں نے مستنبط کیے تھے، آج کے ماحول میں، ویسے ہی دساتیر و قوانین، آج بھی مرتب کیے جا سکتے ہیں، جن کا سرچشمہ وہی اصولِ دین ہوں۔ وہی شمعِ ہدایت اُن کے لیے تھے، وہی آج ہمارے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں پھر ان کی تکفیر کیسی؟ اور تنقیص کیا؟'' ❸

الغرض، اُن دنوں، پرویز صاحب کا تصورِ قرآن، (قطع نظر اس کے کہ ان کے دل میں کیا تھا) زبان و قلم کی حد تک، سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبیؐ سے منقطع نہ تھا، بلکہ وہ قرآن کریم سے، اسوۂ رسولؐ کے انقطاع کو، فرقۂ اہلِ قرآن کی ضلالت اور غوایت کا سبب قرار دیا کرتے تھے۔ نیز اُس وقت، انہوں نے کبھی یہ نظریہ پیش نہیں کیا تھا کہ سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبیؐ، سب کچھ قرآن ہی میں ہے، خارج از قرآن نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعد میں، اُن کا وظیفۂ لسان و قلم بنا رہا)۔ چنانچہ وہ اہلِ قرآن کی ضلالت کو، اُس دور میں، بایں الفاظ واضح کیا کرتے تھے۔

''جو اہلِ قرآن ہونے کے مدعی ہیں، وہ قرآن و رسولؐ کے باہمی تعلق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے، قرآن سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں، لہٰذا تمسک بالکتاب کسی گروہ بندی سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تو ضرورت ہے کہ تمام انسانی مرکزوں سے منہ موڑ کر، احکامِ قرآنی کو، اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے،

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۴ ❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۷

❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۴۳

واجب الاتباع سمجھا جائے۔''❶

۱۹۴۰ء میں، ''قرآنی احکام کو، اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے واجب الاتباع سمجھے'' جانے کی تاکید تھی، لیکن پاکستان بننے کے بعد، پرویز صاحب نے الٹی زقند لگائی، تو پھر یہ کہا جانے لگا کہ: ''اسوۂ حسنہ تو صرف قرآن ہی میں محدود و محصور ہے، نہ کہ قرآن سے الگ، لہٰذا اس اسوہ کا انکار، قرآن کریم کے انکار کو مستلزم ہے۔''

''حضورؐ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے، جسے خدا نے اسوۂ حسنہ کہا ہے۔ اس اسوہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص، مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر، اللہ تعالیٰ نے، اس اسوہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا۔''❷

اگر اسوۂ رسول، خارج از قرآن ہو بھی، تب بھی حکمِ پرویز یہی ہے کہ صرف قرآن ہی کے بیان کردہ، اسوہ کو قبول کیا جائے۔

''رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کو، جسے قرآن نے بیان کیا ہے، شمعِ راہ بنایا جائے۔''❸

اور ایک مقام پر بڑی وضاحت سے یہ فرمایا:

''سنت بھی کتاب کے اندر ہے، باہر نہیں ہے۔''❹

بہرحال، قرآن و سنتِ رسولؐ کو، ان دونوں، باہم ناقابلِ انقطاع قرار دینا، اور ''احکامِ قرآنی'' کو ''اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے، واجب الاتباع سمجھنا''، اور قرآن اور اسوۂ حسنہ، دونوں کو، اسلاف صالحین کی طرح ادلۂ شرعیہ اور ماخذ قانونِ اسلامی قرار دینا، ''تقلیدی دور ہی کے وہ عقائد'' ہیں، جنہیں پرویز صاحب، صرف اس لیے (۱۹۴۸ء کے بعد) اپنے ضمیر کے خلاف پیش کرتے رہے ہیں کہ امتِ مسلمہ اور ملتِ اسلامیہ کی حمایت و ہمنوائی کی آڑ میں، اپنے

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۵

❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۱ء، صفحہ ۵۱

❸ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۷

❹ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۱ء، صفحہ ۲۱

اعتماد و وثوق کی ایک فضا پیدا کی جائے تاکہ اسے اپنے حصولِ مفاد کے لیے، بعد میں، بطورِ زینہ استعمال کیا جا سکے۔ اس دور میں، وہ سکہ بند منکرِ حدیث ہونے کے باوجود بھی، سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبی کا نام لینے پر مجبور تھے۔ جو کچھ ان کے دل میں تھا، اُسے وہ اپنی زبان پر لانے سے گریزاں تھے، اور جو کچھ وہ زبان و قلم سے کہہ رہے تھے، وہ اُن کے مافی الضمیر کے خلاف تھا۔ وہ اپنی تقریر و تحریر میں انتہائی محتاط تھے کہ مبادا، ان کی زبان سے بے ساختہ اصل قلبی معتقدات ظاہر ہو جائیں، لیکن اس شدتِ احتیاط کے باوجود، کبھی حزم و احتیاط کا دامن، ان کے ہاتھ سے چھوٹ بھی جاتا تھا۔

جمعہ کا خطبہ، پرویز اور چپڑاسی کی جرأتِ ایمان:

اس کی بہترین مثال، دہلی سکریٹریٹ کی مسجد میں، پرویز صاحب کے خطبۂ جمعہ کا وہ واقعہ ہے، جس میں جوشِ خطابت میں، وہ اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رکھ سکے، اور اپنے باطنی اور منحرف خیالات کو بھی پیش کرنا شروع کر دیا۔

> ”تحریر کے ساتھ، پرویز صاحب، جمعہ کے خطبہ میں بھی اپنے بدلتے ہوئے خیالات کو پیش کرنے لگے۔ شروع شروع میں یہ باتیں، استعاروں اور کنایوں میں پیش کی گئیں، پھر استعارات و کنایات کے پردے بھی اٹھنے لگے۔ سیکریٹریٹ کے پڑھے لکھے لوگ تو سوچتے ہی رہے کہ اس فتنہ کو کس مصلحت اور حکمت کے ساتھ بند کیا جائے، مگر موسیٰ نام کے ایک چپڑاسی نے جرأت کر کے مداخلت کی، اور پرویز صاحب کو سختی کے ساتھ ٹوکا۔ بس اس دن کے بعد، دہلی کی سکریٹریٹ کی مسجد میں پرویز صاحب خطبہ نہ دے سکے، اور ایک غیرت مند چپڑاسی کی جرأت نے اس فتنہ کا سدِ باب کر دیا۔“●

الغرض، یہ پوری بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ ”مفکرِ قرآن“ صاحب، ۱۹۲۸ء سے

● قرآن کی معنوی تحریف، صفحہ ۸۳

لے کر اجرائے طلوعِ اسلام کے بعد بھی، ایک عرصہ تک، اپنے ضمیر سے لڑ کر، وہ کچھ لکھتے رہے ہیں جو ان کے دل میں نہ تھا، اور جو کچھ فی الواقعہ ان کے دل و دماغ میں رچا بسا ہوا تھا، اسے وہ، مصلحتاً، چھپائے رکھنے پر مجبور تھے۔ یہ طرزِ عمل محض جھوٹ ہی کی ایک شکل نہ تھی، بلکہ ذہنی خیانت اور فکری بددیانتی بھی تھی، اور جب وہ، سنتِ نبویہ سے قلباً منحرف ہوتے ہوئے، قلماً اس کی حمایت اور ہمنوائی میں مختلف رسائل و مجلات میں اپنے مضامین و مقالات شائع کروا رہے تھے تو اس وقت وہ عامۃ الناس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، انہیں دھوکہ و فریب میں مبتلا کر رہے تھے، تاکہ اپنی اس دغابازانہ کارروائی سے معتقدینِ سنتؐ کے دلوں میں اپنے لیے ہردلعزیزی (Popularity) پیدا کر سکیں۔

باب ۲

خارزارِ تضاداتِ پرویز

دنیا میں ایک معقول انسان سے جن باتوں کی توقع کی جاتی ہے، غالباً ان میں سے سب سے پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں تناقض نہ ہو۔ ایک معمولی عقل کا گنوار آدمی بھی جب کسی شخص کو ایسی باتیں کرتے دیکھتا ہے، جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہوں، تو فوراً ٹوک دیتا ہے، کیوں کہ اس کی نہایت موٹی عقل بھی، متناقض باتوں کی غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جن باتوں کی توقع، کسی گھٹیا سے گھٹیا ذی عقل انسان سے نہیں کی جا سکتی، اُن کی توقع، اُس خدا سے کی جاتی ہے، جو خود عقل کا خالق اور حکمت کا مالک ہے، اور اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ خدا سے انتہائی نامعقویت کی توقع رکھنے والے کوئی جاہل، اَن پڑھ اور کودن دماغ لوگ نہیں ہیں، بلکہ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، جو خدا کی کتاب کی تفسیر و تشریح، عقل و دانش کی روشنی میں کرنے کے مدعی ہیں۔ ان کی فضائے دماغی میں اٹھنے والا ہر جھونکا، مرغِ بادنما کی طرح، ان کا رخ موڑ دیتا ہے، اور ہر سال بدل جانے والی دو ٹکے کی جنتری کی طرح، ان کی تفسیری آرا بھی بدل جاتی ہیں، اس کے نتیجہ میں، تضادات و تناقضات کا ایک وسیع و عریض خارزار پیدا ہو جاتا ہے، اور یوں اس الزام کا مورد، مفسر کی بجائے، ذاتِ خداوندی قرار پا جاتی ہے۔

ہمارے ''مفکرِ قرآن'' اور ''مفسرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب نے قلم تھامنے کے وقت سے لے کر، مرتے دم تک، اس قدر تناقضات و تضادات پیش کیے ہیں کہ

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

تضاداتِ پرویز کی وجوہ کا کھوج لگایا جائے، تو ان میں سے ایک بنیادی وجہ، اُن کی ابتدائی عمر کا وہ دور بھی ہے، جس میں وہ تصوف سے اچھا خاصا شغف رکھتے تھے، پھر تصوف کے فلسفۂ ہمہ اوست نے، انہیں ایسا وسیع المشرب بنا دیا تھا کہ جس جذب و شوق سے وہ میلاد کی محفلوں میں

شریک ہوا کرتے تھے، اُسی سوز و گداز کے ساتھ، وہ عزاداری کی مجالس میں بھی حاضری دیا کرتے تھے، اور اس پر مستزاد یہ کہ قوالی تو خیر تھی ہی جزوِ عبادت۔ اس قسم کے اضداد کا مجموعہ تھا، اُن کا بچپن اور شباب کا زمانہ۔ اہلِ تشیع کی مجالسِ عزاداری میں شرکت کے عمل نے، تصوف کے ساتھ مل کر، پرویز صاحب کو کس ذوق و مزاج سے ہم کنار کیا تھا؟ وہ خود، اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"ویسے بھی صوفی آدھا شیعہ ہوتا ہے۔" ❶

اور بہر حال، تشیع اور تقیہ لازم و ملزوم ہیں۔ تقیہ (قطع نظر اس کے جواز و عدمِ جواز کے) قلب و زبان میں مغائرت ہی کا دوسرا نام ہے۔ شاید اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کی بعد کی زندگی، پوری کی پوری، تقیہ ہی کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے، جس کا نمایاں اور منطقی نتیجہ، ان کے وہ تضادات و تناقضات ہیں، جو ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، اور جن کے اوپر، سونے پر سہاگے کا کام، ۱۹۲۸ء تا قیامِ پاکستان کے اُس دور نے بھی کیا ہے، جس میں اُن کی زبان، ان کے دل کی رفیق نہ رہی تھی، اور وہ اپنے ضمیر سے لڑ کر، مسلک و افکار پیش کر رہے تھے، جن پر اُن کا اعتقاد نہیں تھا، اور جو کچھ وہ پیش کر رہے تھے، وہ اُن کے قلبی معتقدات کے خلاف تھا۔

آیئے! اب ہم "مفکرِ قرآن" جناب پرویز صاحب کے اُس خارزارِ تضادات میں قدم رکھیں، جس میں داخل ہوتے ہی آبلہ پائی کا شکار ہونا، اگرچہ تکلیف دہ ہے، لیکن اگر اسے حقیقت رسی اور تلاشِ حق کے جذبہ کے تحت کیا جائے، تو یہی عمل فرحت بخش اور مسرت خیز بن جاتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ‏ ‏ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

طلوعِ اسلام، ذخیرۂ تضادات:

"مفکرِ قرآن" کے یہ تضادات، یوں تو ان کے پورے لٹریچر میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا ذخیرہ، طلوعِ اسلام کی فائل میں موجود ہے۔

طلوعِ اسلام کے اجراء کے دو دور ہیں، ایک دور وہ تھا جس میں یہ مجلہ، جناب نذیر نیازی کے زیرِ اہتمام جاری ہوا تھا، جبکہ دوسرا دور وہ تھا، جب اس کا اجراء، جناب غلام احمد پرویز اور اُن کے

❶ شاہکارِ رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۴۹

رفقا کے ہاتھوں ہوا تھا۔

"نیازی صاحب نے "طلوع اسلام" کے نام سے، ایک ماہوار مجلہ، اکتوبر ۱۹۳۵ء میں، دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہ پرچہ لاہور میں منتقل ہوگیا، لیکن ۱۹۳۶ء میں، جب کہ اس کے کل چھ پرچے شائع ہوئے تھے، وہ بند ہوگیا۔ موجودہ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۸ء میں، نئے انتظامات کے تابع شائع ہوا۔" ❶

طلوع اسلام...... افق پاکستان پر:

متحدہ ہندوستان میں، جس طلوع اسلام کی اشاعت، مئی ۱۹۳۸ء سے جون ۱۹۴۲ء تک برقرار رہ کر، جولائی ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک تعطّل کا شکار رہی، وہ پاکستان میں جنوری ۱۹۴۸ء سے دوبارہ اشاعت پذیر ہوا، اور نہ صرف وفاتِ پرویز تک، بلکہ اب تک جاری وساری ہے۔ قیام پاکستان سے قبل، اس کا اجراء وآغاز دہلی سے ہوا تھا، جب کہ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد، اس کا مصدر ومخرج کراچی قرار پایا۔ ۱۹۵۵ء میں، اسے ماہنامہ مجلہ سے، ہفت روزہ طلوع اسلام میں بدل دیا گیا۔ اس ہفت روزہ رسالے کا پہلا شمارہ، ۵ فروری ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا، جب کہ آخری شمارہ ۷ جنوری ۱۹۵۶ء کا پرچہ تھا، جو اسلم جیراج پوری کی وفات پر، بطور خصوصی شمارہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۵۶ء سے، اس نے پسپائی اختیار کی اور اسے اپنی حیثیت بطور ماہنامہ ہی کو اپنانا پڑا، لیکن اپریل مئی ۱۹۵۸ء سے، کراچی سے نقل مکانی کے بعد، یہ لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا، اور آج تک لاہور ہی سے اس کی اشاعت کا سلسلہ برقرار ہے۔ اگرچہ پرویز صاحب فروری ۱۹۸۵ء میں فوت ہوگئے تھے مگر اس کی اشاعت میں کبھی تعطل واقع نہ ہوا۔ پرویز صاحب کے بعد، ان کے فکر سے وابستہ احباب، اب تک، اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

طلوع اسلام کے بدلتے ہوئے افکار ونظریات:

لیکن قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے "طلوع اسلام" میں نمایاں فرق تھا۔ متحدہ

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۱

ہندوستان میں ابو تمنا اور پرویز صاحب امت مسلمہ کے جن افکار و نظریات کی اپنے شعور کے
خلاف حمایت یا مخالفت کیا کرتے تھے، اب وہی نظریات "مصلحت" کی دیمک کا شکار ہو گئے۔
اب وہ ملت اسلامیہ میں مقبول عام اصول و دستور کی تردید و ابطال پر اتر آئے اور اپنے قلب و
دماغ میں مکتوم و مستور افکار و نظریات کو ایک ایک کر کے تدریج کے ساتھ علانیہ بیان کرنے لگے۔
اور ایسا کرتے ہوئے پرویز صاحب کے لب و لہجہ میں بھی تبدیلی واقع ہوتی چلی گئی۔ طلوع اسلام
کے قبل اور بعد کے نظریات میں واضح فرق و تفاوت کی بہت سی مثالوں میں سے چند ایک
ملاحظہ فرمایئے:

پہلی مثال... حجاب نسواں:

متحدہ ہندوستان میں طلوع اسلام، خواتین کے حجاب و نقاب کا نہ صرف یہ کہ قائل تھا بلکہ عقلی
دلائل سے اس کا ثبوت بھی دیا کرتا تھا۔

"نظام فطرت، جن فرائض کی انجام دہی عورت سے چاہتا ہے، ان کے پیش نظر یہ
نہایت کافی ہے کہ ایک لڑکی ذمہ دارانہ زندگی میں قدم رکھنے سے قبل امور خانہ
داری، اصول حفظان صحت، نوشت و خواند، حسب ضرورت حساب کتاب اور روزمرہ
کے مسائل دینیہ سے واقف ہو۔ اور ظاہر ہے کہ گھرانوں کے لیے یہ تعلیم و تربیت
بالکل کافی ہے اور اس کی تحصیل میں پردہ کسی طرح مانع نہیں ہو سکتا۔ اول تو اس قدر
تعلیم ہر گھر میں خود ماں دے سکتی ہے یا باپ اور بھائی دے سکتے ہیں۔ اگر آج نہیں
تو دو ایک پشتوں کی کوشش کے بعد ہماری مائیں یقیناً اس قدر تعلیم دے سکیں گی۔ لیکن اگر
گھروں میں کسی وجہ سے بالکل ہی ناممکن ہو تو نیک اور لائق عورتوں کی نگرانی میں ہر محلہ
اور بستی میں پردہ دار مدارس قائم کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ قدیم زمانہ میں رواج تھا اور
اب بھی اکثر مقامات پر ہیں۔ دولت مند اور صاحب استطاعت گھرانوں میں
مزید تعلیم کو اور بھی بلند کیا جا سکتا ہے اور لڑکیوں کو فن ادب، تاریخ، سیاسیات،
دینیات وغیرہ بھی پردہ کے معقول انتظام کے ساتھ سکھائے جا سکتے ہیں۔ لہذا جہاں

تک ضروری علم و ہنر کی تحصیل کا سوال ہے، پردہ کی وجہ سے کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل نے، جو یقیناً ''فاضل دیو بند'' نہیں ہیں، حال ہی میں اپنی ایک تقریر میں صاف طور پر اعلان فرمایا کہ ریاست میں پردہ کی وجہ سے تعلیم نسواں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔'' ●

تب کا طلوع اسلام، مغرب کے ترکِ حجاب و نقاب (یا بالفاظ دیگر، بے پردگی) کے عمل کو، طنزاً، اس کے یکے از ''کارہائے نمایاں'' قرار دیا کرتا تھا۔

''تہذیب مغرب کا سب سے بڑا معرکۃ الآراء کارنامہ عورتوں کو پردہ سے آزاد کرانا ہے، لیکن اس مسلک میں بھی، ان کی وہی افراطی حالت جلوہ فرما ہوئی، پردہ اتار پھینکا تو اس زور سے کہ ستر و حیا کے لباس بھی ساتھ ہی الجھے ہوئے ایک طرف جا پڑے۔'' ●

لیکن پاکستان بنتے ہی، اس کے افق پر، جب ''طلوع اسلام'' ہوا تو پردہ کی یوں مخالفت کی گئی۔

''عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا، جرم فحش کی سزا ہے۔ لہٰذا ہمارا مروجہ پردہ، جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر قید رکھا جاتا ہے، نہ صرف منشائے قرآنی کے خلاف ہے بلکہ جرم ہے، کیوں کہ کسی بے گناہ کا حبس بے جا (illegal Detention) عرفاً و شرعاً جرم ہے۔'' ●

دوسری مثال...... گانے اور گویے کی شرعی حیثیت:

قبل از قیام پاکستان، وہ گانے کو امر معیوب اور گانے کے رسیا کو، علما سلف و خلف کی ہم نوائی میں مردود الشہادہ سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ متحدہ ہندوستان میں یہ تبلیغ کیا کرتے تھے کہ واردھا تعلیمی سکیم میں موسیقی کا داخلِ نصاب ہونا، ہندو تہذیب کے مطابق ہو تو ہو، لیکن اسلامی تہذیب

● طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۴

● طلوع اسلام، جون ۱۹۴۱ء، صفحہ ۵۲

● طاہرہ کے نام، صفحہ ۱۹۸

سے قطعی منافی ہے۔ اس سکیم کے ایک مرتب ڈاکٹر ذاکر حسین تھے، اس وقت "طلوعِ اسلام" نے لکھا تھا:

"موسیقی چونکہ ہندوؤں کی تہذیب کا ضروری جزو ہے، اس لیے اسے بھی داخل نصاب کیا جاتا ہے، ہم بادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر اس کا نام "اشتراکِ عمل" ہے تو پھر اطاعت کی کیا تعریف ہوگی! کیا نبی اکرمؐ سے لے کر اس وقت تک کسی اسلامی نظامِ تعلیم میں کبھی یہ اجزا بھی شامل ہوئے تھے! دوسروں کو چھوڑیے، کیا خود جامعہ کے نصاب میں بھی اس سے پیشتر یہ اجزا موجود تھے، جامعہ ایک آزاد درسگاہ ہے اس کے نظام و نصاب کی باگ ڈور، خود انہی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہے جو واردھا رپورٹ کے مرتب کرنے والے ہیں، اگر ان کے نزدیک، صحیح اسلامی تعلیم یہی ہے کہ اہنسا کو ہسا پر فوقیت ہے، ادیانِ عالم، بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں اور موسیقی ایک عمدہ جوہر ہے تو انہوں نے اپنے ہاں ان چیزوں کو اب تک کیوں رائج نہ کیا، کیا اس سے پیشتر، خود انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ صحیح اسلامی تعلیم کیا ہے، اور اب مہاتما جی کے سمجھانے سے معلوم ہوا کہ اسلام کی روح یہ ہے۔"❶

اُس وقت، طلوعِ اسلام، گانا گانے والا تو رہا ایک طرف، محض گانا سننے والے کو مردود الشہادہ قرار دینے کا یہ واقعہ، اسلامی تاریخ میں سے پیش کیا کرتا تھا۔

"اسی طرح کا ایک واقعہ، قاضی شریف الدین بن عین الدولہ کا ہے، جو مصر میں قاضی تھے، ان کی عدالت میں ملک کامل، سلطانِ مصر، کسی مقدمہ میں شہادت میں طلب ہوا، وہ چونکہ روزانہ ایک مغنیہ کا گانا سنا کرتا تھا، اس وجہ سے قاضی موصوف نے اس کی شہادت لینے سے انکار کر دیا، اس پر اس نے قاضی کی شان میں سخت کلمہ استعمال کیا، قاضی نے کہا کہ یہ عدالت کی توہین ہے اور اسی وقت اپنی برطرفی کا

---

❶ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۱

اعلان کر کے مسند سے اٹھ کر چلے آئے، سلطان نے مجبوراً جا کر معافی چاہی اور ان کو راضی کیا، کیوں کہ اس کو اپنی بدنامی اور نامقبولیت کا خطرہ ہوا۔"❶

ان دنوں واردھا کی تعلیمی اسکیم کے تحت، ہندو اطفال کے ساتھ جب مسلمان بچوں اور بچیوں کو راگ تال کی تعلیم تجویز کی گئی تو "طلوع اسلام" نے یہ کہہ کر مخالفت کی تھی:

"اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لیے راگ کا نصاب رکھا جائے تو انہیں عین مسرت ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے۔"❷

اس وقت، سیرت سرور عالم ﷺ کا یہ واقعہ بھی، طلوع اسلام کے اوراق کی زینت بنا کرتا تھا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ:

"جن محفلوں میں باجہ اور راگ ہوتا تھا، ان میں کبھی نہیں جاتے تھے۔"❸

لیکن جب افق پاکستان پر طلوع اسلام ہوا تو راگ تال اور موسیقی کے متعلق، یہ سب تصورات بدل کر رہ گئے، اور تو اور، خود "مفکر قرآن" جناب پرویز صاحب، بہترین گوش نغمہ شناس ٹھہرے، یہاں تک کہ فلمی مغنیہ، روشن آرا بیگم کے گانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ خصوصی کاوش فرمایا کرتے تھے۔

"Pervez Sahib made special efforts to listen to Roshan Ara Begum, of whom he had a very high opinion."❹

اور چونکہ پرویز صاحب کو قرآن کریم سے بہت "پیار" تھا، اس لیے انہوں نے جب اور جہاں بھی، اپنے نظریات میں الٹی زقند لگائی، قرآن کو بھی اپنی زقندِ معکوس میں شامل رکھا، چنانچہ

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۴۸ء، صفحہ ۶۷

❷ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۸ء، صفحہ ۷۷، ۷۸

❸ طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۴۴

❹ طلوع اسلام، مارچ اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۱۶

راگ تال اور موسیقی، جس کی تعلیم مسلمان بچوں اور بچیوں کو ہندوستان میں دینا معیوب تھی، اور وہ محفلِ راگ و باجہ، جس میں شرکت سے حضور اکرم مجتنب رہا کرتے تھے، اس کا "ثبوت" اب قرآن ہی سے برآمد کر لیا گیا، پھر اس "مطابقِ قرآن عمل" کا "تائیدی ثبوت" تحریف شدہ تورات سے بھی تجویز لیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام بخود باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے:

"اس میں شبہ نہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے لیکن ہم موسیقی کے متعلق اس بیان کو اس لیے قابلِ قبول سمجھتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ہے تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤد نے اس فن کی تہذیب و تزئین کی ہوگی۔" ❶

پرویز صاحب کا طریقِ واردات یہ تھا کہ وہ تہذیبِ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، جس فکر یا عمل کو "ثابت" کرنا چاہتے تھے، اسے قرآنی مفردات میں ٹھونس کر، بطور "قرآنی حقیقت" پیش کر دیا کرتے تھے، اور پھر دنیا جہان کی خواہ کتنی ہی گری پڑی کتاب میں وہ فکر یا عمل مذکور ہو، اسے یہ کہہ کر قبول کر لیتے تھے کہ یہ "مطابقِ قرآن" ہے۔

رہا وہ قرآنی لفظ، جس میں "جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں" کا تصور ٹھونس کر "ثبوت" فراہم کیا گیا ہے، وہ یُحْبَرُوْنَ کا لفظ ہے۔

﴿ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُوْنَ ﴾ [۳۰/۱۵]

"سرسبز و شاداب باغات میں، نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں۔" ❷

حقیقت یہ ہے کہ یُحْبَرُوْنَ کا معنیٰ "موسیقی کی محفلیں" دنیائے علم میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا، نہ ہی کتبِ تفسیر میں اور نہ ہی کتبِ لغات میں۔ اس لفظ کے جو معانی، اہلِ علم کے ہاں معروف و متداول ہیں، وہ یہ ہیں:

"ان کو خوش کیا جائے گا۔ (ابوعبیدہ)

ان کی عزت کی جائے گی۔ (ابن عباس)

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۹ ❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۷

ان کو آرام دیا جائے گا، نعمتیں دی جائیں گی۔ (مجاہد)

جنت میں نغمات سنائے جائیں گے۔" (یحییٰ بن ابن کثیر بروایت اوزاعی) ❶

شاید پرویز صاحب نے آخری معنی "نغمات سنائے جانے" سے "موسیقی" کا معنی کشید کیا ہے، حالاں کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ نغمات کا یہ سماع، آلاتِ غنا اور مزامیر موسیقی ہی کے ساتھ مقرون ہو، پھر دعویٰ یہ کہ تصریفِ آیات کے ذریعہ، قرآن کی تفسیر، قرآن ہی سے کی جاتی ہے لیکن عمل یہ کہ قرآنی مفردات کے اصل معانی سے انحراف کر کے خود ساختہ معانی کی آڑ میں، ایک "قرآنی حقیقت" گھڑی جاتی ہے اور پھر تورات محرفہ سے، اس کے حق میں "تائیدی شہادت" کشید کی جاتی ہے۔

قرآن کریم، جنت میں، جن نغمات کے سنائے جانے کا ذکر کرتا بھی ہے تو وہ، دراصل، وہ نغمات ہیں جو مزامیر غنا اور آلاتِ موسیقی کے بغیر، محض تحمیدِ خداوندی، تسبیح الٰہیہ، اور اہل جنت کے لیے سلامتی و تہنیت کے نغمات ہیں، دورِ حاضر کے وہ نغماتِ اخلاق سوز، جو بے خدا تہذیب کے ہاتھوں "آرٹ اور فنون لطیفہ" قرار پا چکے ہیں، ہرگز مراد نہیں ہیں۔ چند آیات، جو اس حقیقت پر شاہد ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ﴿ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝ ﴾ [الغاشیہ: ۱۰،۱۱]

"(وہ لوگ) بلند باغ میں ہوں گے اس میں کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔"

(۲) ﴿ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۝ ﴾ [مریم: ۶۲]

"وہ اس میں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے مگر صرف سلامتی کی دعائیں۔"

(۳) ﴿ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۝ ﴾ [الواقعہ: ۲۵]

"وہ اس میں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے اور نہ ہی کوئی گناہ کی بات۔"

(۴) ﴿ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ۝ ﴾ [النبأ: ۳۵]

"وہ اس میں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی کوئی جھوٹی (خرافات۔)"

❶ لغات القرآن، ج: ۶، صفحہ ۲۰ (از مولانا عبدالرشید نعمانی و مولانا عبدالدائم الجلالی)

(۵) ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ﴾ [الرعد:۲۳،۲۴]

"اور فرشتے ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) تم پر سلامتی ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، پس خوب ہے آخرت کا گھر۔"

(۶) ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝ ﴾ [ابراہیم:۲۳]

"وہ اس میں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے، اس میں ان کا تحفۂ ملاقات "سلام" ہوگا۔"

(۷) ﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ ﴾ [الحجر:۴۶]

"تم ان (باغات اور چشموں) میں سلامتی کے ساتھ، بے خوف وخطر داخل ہو جاؤ۔"

(۸) ﴿ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [النحل:۳۲]

"وہ (فرشتے) کہیں گے تم پر سلامتی ہو، تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(۹) ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝ ﴾ [یٰسین:۵۸]

"(ان اہل جنت پر) مہربان پروردگار کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔"

(۱۰) ﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝ ﴾ [ق:۳۴]

"اس (جنت) میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔"

(۱۱) ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [یونس:۱۰]

"اس (جنت) میں ان کی دعا ہوگی "اے اللہ! تو پاک ہے"۔ اور سلیقۂ ملاقات "سلام" ہوگا اور خاتمۂ دعا یہ الفاظ ہوں گے "تمام تعریفیں، اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔"

یہ ہے حقیقت، ان نغماتِ تسبیح وتحمید کی اور ان ترانہ ہائے تہنیت وسلامتی کی، جواز روئے قرآن، جنت میں سنے اور سنائے جائیں گے۔

بہرحال، اس مختصری بحث سے یہ بات واضح ہے کہ پرویز صاحب، جس قرآن کی بنیاد پر، متحدہ ہندوستان میں موسیقی اور راگ تال کو معیوب کہا کرتے تھے، پاکستان بننے کے بعد، اُسی قرآن سے اس کی اباحت اور جواز کو کشید کر ڈالا گیا اور یوں ان کی زنبیلِ تضادات میں ایک اور ترکش کا اضافہ ہو گیا۔

تیسری مثال..... مصوری وتمثال سازی کی شرعی حیثیت:

موسیقی اور راگ ورنگ ہی نہیں، بلکہ مغربی تہذیب کے دیگر اجزاء فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری اور تمثال کے بارے میں بھی، پرویز صاحب کے کل کے اور آج کے نقطۂ نظر میں یکسر اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، متحدہ ہندوستان میں، طلوعِ اسلام، مغربی ثقافت کے ان جملہ اجزا کو، اسلامی تعلیم کے سراسر منافی قرار دیا کرتا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد، یہ سب کچھ عین مطابق اسلام قرار پا گیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل، ان کا موقف یہ تھا:

> ”اس نظامِ تعلیم میں، انگریزی ادب کی بدولت، ایک نہایت ہی گمراہ کن نظریہ پیدا ہو گیا ہے، اس کی بنیاد انگریزی شاعری میں رومانی (Romantic) دور سے پڑی ہے، آگے چل کر فنِ تعمیر، مصوری اور تمام فنونِ لطیفہ کو مقصود بالذات قرار دے کر حقائقِ زندگی کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا گیا ہے، اس نظریہ کا اثر ونفوذ، اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ عصرِ رواں کی تہذیب میں زنا جیسی ہلاکت آفریں معصیت کاری کو محض افراد کی ”خوش وقتی“ (Having A Good Time) کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے، اور تمام راگ ورنگ اور عیش ونشاط کی محفلوں کو ذوقِ جمالیات (Aesthetic Taste) کا مظہر سمجھ کر سراہا جاتا ہے، غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، ان کے ”اعصاب پر ہمیشہ عورت سوار رہتی ہے“۔ پھر ہمارے نوجوان مصوری، تمثیل اور گل وبلبل کی شعر وشاعری کی طرف، فن برائے فن (Art for

(Art's Sake) کے لیے عملاً نہ جذبہ کی بدولت منہمک نظر آتے ہیں، حالاں کہ یہ تعلیم، اسلام کے سراسر منافی ہے۔"❶

لیکن راگ تال ہو یا موسیقی، مصوری ہو یا تمثال سازی، مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آتے ہی، یہ سب کچھ مطابق اسلام اور موافق قرآن قرار پا گیا:

"حضرت سلیمانؑ کے متعلق، خود قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کے نادرہ کار صناع، اپنے ہاں اکٹھے کر رکھے تھے ﴿ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ ﴾ (۱۳/۳۴) جو حضرت سلیمانؑ کی منشاء کے مطابق ان کے لیے بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور ان میں مجسمے تراشتے...... یا تصاویر بناتے تھے، تماثیل، مجسمے اور تصاویر دونوں کے لیے آ سکتا ہے۔

آرٹ (یعنی فنون لطیفہ) میں چار اصناف ہی بنیادی شمار کی جاتی ہیں۔ مجسمہ سازی، تصویر کشی، موسیقی، اور شاعری۔ پہلی تین کا ذکر آ گیا ہے، شاعری کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔"❷

اور لطف کی بات یہ ہے کہ پرویز صاحب، اپنے تضادات کو، قرآن کا نام لے کر ہی پیش کیا کرتے تھے، اب ہر شخص، خود سوچ سکتا ہے کہ قرآن ہی مختلف اوقات میں متضاد نظریات پیش کرتا ہے؟ یا پھر یہ ذہن پرویز کی خلاقی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنے نہاں خانہ دماغ میں چھپے ہوئے ہر تصور کو، مرورِ ایام کے ساتھ، قرآن کے نام پر بدلتے رہا کرتے تھے، قرآن کے الفاظ تو بہرحال، چودہ سو سالوں سے وہی ہیں، لیکن پرویز صاحب کے، قرآنی اساس پر پیش کیے جانے والے افکار، ہمیشہ بدلتے ہی رہے۔

چوتھی مثال..... ملکیت زمین کی شرعی حیثیت:

متحدہ ہندوستان میں جاری ہونے والا "طلوع اسلام"، زمین کی ذاتی ملکیت کا قائل تھا،

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۷

❷ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۹

خواہ یہ ملکیت خرید و فروخت کے ذریعہ حاصل ہو، یا کسی بنجر و بے آباد زمین کو قابلِ کاشت بنا کر حاصل ہو، ثانی الذکر صورت کے متعلق، اس دور کا "طلوعِ اسلام" یہ کہا کرتا تھا:

"بے شک اگر پانی کے چشمہ سے کوئی شخص مشک میں پانی، یا جنگل سے لکڑی کا گٹھا، یا کان سے ایک بوری نمک اٹھا کر لائے تو وہ اس کی شخصی ملکیت قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی اپنی محنت سے زمین کو قابلِ کاشت یا اپنے کسی عمل سے کارآمد بنائے تو اس پر اس کی ملکیت تسلیم کی جائے گی۔" ●

رہی خرید و فروخت کے ذریعہ سے ملکیت اراضی، تو کون نہیں جانتا کہ جناب ابوبکر صدیقؓ نے، اپنی اس زمین کو فروخت کر کے، اس کی ملکیت، خریدار کو سونپ دی جس کی قیمت اس لیے بیت المال میں جمع کرا دی گئی، کہ آپ بیت المال سے اخذ شدہ حق الخدمت واپس کر دینا چاہتے تھے۔

لیکن جب پاکستان بنا تو اس کے افق پر جو طلوعِ اسلام ہوا، اس میں نہ صرف یہ کہ زمین کی شخصی ملکیت ناجائز، بلکہ کفر و شرک قرار پا گئی۔ اب طلوعِ اسلام کے توپ خانۂ تکفیر سے یہ فتویٰ (با تکرارِ بسیار) داغا جانے لگا:

"قرآن کریم کی رو سے وسائل رزق (ارض یعنی زمین) خدا کے پیدا کردہ ہیں اور خدا ہی ان کا مالک ہے، لہٰذا ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا ہے، شرک ہوگا۔ ●

اس (اللہ) نے تمہارے لیے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا، اوپر فضا میں گڑے بکھیر دیے، پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لیے سامانِ رزق پیدا ہو، ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے، اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا

● طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۲ء، صفحہ ۴۹ ● تفسیر مطالب الفرقان، ج: ۱، صفحہ ۲۹۷

کیا تو یہ جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ اور خدا کفر قرار دینے کے مترادف ہوگا۔" ❶

پانچویں مثال..... ذاتی و شخصی ملکیت در رنگِ وا اسلام:

قیام پاکستان سے قبل، طلوع اسلام اور جناب پرویز صاحب کے، اشتراکیت کے بارے میں مضامین میں یہ کہا جاتا تھا:

"اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔" ❷

لیکن یہی طلوع اسلام جب دہلی سے پاک سرزمین پر آیا، تو ذاتی ملکیت کے بارے میں اسلام کا نظریہ بھی بدل گیا، اور اب بڑی بلند آہنگی اور تکرار بسیار کے ساتھ، یہ کہا جانے لگا:

"قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔" ❸

چھٹی مثال..... ضبط تولید، کل اور آج:

تہذیب مغرب، اپنے جلو میں جن آفات و بلیات کو لے کر آئی ہے، ان میں سے ایک ضبط تولید یا برتھ کنٹرول بھی ہے، طلوع اسلام، متحدہ ہندوستان میں، چونکہ اس کے خلاف تھا، اس لیے بڑے اہتمام کے ساتھ، ان اشعار کو اپنے صفحات میں جگہ دیا کرتا تھا، جن میں اس کی مخالفت پائی جاتی تھی، چنانچہ ایک مقام پر، محترم نعیم صدیقی کی مندرجہ ذیل رباعی کو "ضبط تولید" کے زیر عنوان شائع کیا گیا ہے:

ہے نئی تہذیب میں بھی جاہلیت کا اثر — نوجوانوں کا گناہوں کی طرف ہے ربطِ نفس
آدمیت کی نظر سے دیکھ کر، فرمایئے!! — ضبطِ تولید آپ کو مطلوب ہے یا "ضبطِ نفس" ❹

مغرب کے ہاں، مرد و زن کی ایک ہی تعلیم اور وہ بھی مخلوط انداز میں دیے جانے سے، جو

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵۲
❷ طلوع اسلام، فروری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۹
❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۷
❹ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۲

خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کے بارے میں طلوعِ اسلام نے، تقسیم ملک سے قبل، یہ لکھا تھا:

''یہ نظامِ تعلیم، جنسِ لطیف کے لیے، اس کی زندگی کے مطابق نصاب پیش نہیں کرتا بلکہ اصولاً ان کے لیے، وہی نصابِ تعلیم ہے جو لڑکوں کے لیے پیش کیا گیا ہے، اس نظام کے بدترین اثرات، طلباء اور طالبات دونوں طبقوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، جب مرد و زن کے واجباتِ زندگی الگ الگ ہیں تو ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ ان کے فرائض کی بجا آوری کے لیے حسب حال نظامِ تعلیم مرتب فرماتے، لیکن افسوس کہ انہوں نے ان جنسی اختلافات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ایک ہی نظامِ تعلیم تجویز کر دیا، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جو خرابیاں اس نظام سے پیدا ہوگئی ہیں وہ الم نشرح ہیں، یہ دونوں طبقے اپنے وظیفۂ زندگی کو نبھانے سے عاری ہیں، عورت چراغِ خانہ ہونے کی بجائے شمعِ بزم ہونے پر فخر محسوس کرتی ہے افزائشِ نسلِ انسانی کی بجائے، ضبطِ تولید کو رواج دیا جا رہا ہے، وہ عورت، جس کی آغوش، مردِ غیور و حق پرست کے لیے اولین تربیت گاہ تھی وہ اپنے فرائض سے متنفر ہو رہی ہے۔''[1]

ایک اور مقام پر، طلوعِ اسلام نے ضبطِ تولید کو، فطرت کے خلاف، مقابلہ بازی قرار دیا تھا:

''کیا انسان کے لیے اپنے طبعی رجحانات کو، اقتضائے فطرت سمجھ کر، رہبرِ حیات بنا لینا چاہیے، یا ان کو کسی اور معیار سے جانچ لینا ضروری ہے؟ اس بارے میں اسلام کا فیصلہ تو صاف ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس قدر تعلیم و ترقی کے باوجود، مغرب کی مادی تہذیب ابھی تک کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ سکی، کیوں کہ دیکھا یہی گیا ہے کہ بعض امور میں تو انسانیت کا خاص تصور پیش کر کے فطرت کا مقابلہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے مثلاً ضبطِ تولید۔ اور بعض باتوں میں حیوانوں کی پیروی کرنے کو عین اتباعِ فطرت ٹھہرایا جاتا ہے، مثلاً تحریکِ عریانی۔''[2]

لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد کل کا خوب، آج کے ناخوب میں بدل

---

[1] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۷۰، ۷۱ [2] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۴۸ء، صفحہ ۸۰

جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے تو یہ بات کہی کہ "غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر"... لیکن طلوعِ اسلام پر حصولِ آزادی کا الٹا اثر ہوا، دورِ غلامی میں جن افکار کو تجدد کا روپ چڑھایا کرتے تھے آزادی پاتے ہی ان سے رفتہ رفتہ دست کش ہوتے چلے گئے، چنانچہ ضبطِ تولید کے معاملہ میں بھی طلوعِ اسلام نے پینترا بدلا، اور تقلیدِ مغرب میں اسے جائز قرآن سے ہی کھینچ نکالا، اور اس کے لیے اصول کی جس کمال کو استعمال کیا گیا وہ یہ ہے کہ قرآن نے اس کی کہیں مخالفت نہیں کی، لہٰذا:

"قرآن کی رو سے یہ چیز قابلِ اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لیے افزائشِ نسل پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لیے ہے کہ اسے افزائشِ نسل پر کنٹرول رہے۔" ❶

دوسرا اصول، جسے ضبطِ ولادت کی تحریک کا جواز تراشنے کے لیے استعمال کیا گیا وہ ملک کے مجموعی معاشی حالات، تنگیٔ رزق اور وسائلِ پیداوار کو پیشِ نظر رکھنا ہے، چنانچہ طلوعِ اسلام اس اصول کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتا ہے:

"اگر تمام حالات کا جائزہ لیجئے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لیے پوری کوشش کے بعد بھی صورت ایسی ہو جس میں آبادی کی تحدید ناگزیر ہو جائے تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہو گا۔" ❷

یاد رہے کہ یہ مسئلہ، پاکستان کے فوجی حکمران، صدر ایوب خان کے عہد میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ ایوب خان تقلیدِ مغرب کی راہ پر چلتے ہوئے ضبطِ تولید کی اس تحریک کو "خاندانی منصوبہ بندی" کے نام سے اپنے ڈکٹیٹرانہ اختیارات سے پوری مملکت پر مسلط کرنے پر تلا ہوا تھا، لیکن پبلک کا دینی مزاج حائل ہو رہا تھا۔ ملک کا مغرب پرست طبقہ جن "عقلی اور نقلی دلائل" کی بنا پر اس تحریک کا علمبردار تھا، ان کا تار و پود مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ بکھیر چکے تھے، اپنی ایک کتاب "اسلام اور ضبطِ ولادت" میں مغرب سے اٹھنے والی اس تحریک کی پوری تاریخ کو، اس کے

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۰ء صفحہ ۹۱
❷ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۸۳

پس منظر کو، اور اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور طبی مضرات کو، مغربی مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کر چکے تھے، علاوہ ازیں، مولانا مودودیؒ کا ایک پمفلٹ۔ "اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی"۔ نہایت سائنٹیفک انداز میں، پرزور استدلال کے ساتھ منظر عام پر آیا، اس نے حکومتی استدلال کے غبارہ سے ساری ہوا نکال دی، مولانا محترم کی ان تحریروں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص، جس کے سر میں ذرا سی بھی عقل ہو اور جس کے دیدوں میں معمولی سی بھی بصارت ہو، وہ یکسو ہو کر، اس تحریک کی مخالفت کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی پشت پر صالح فکر کی بجائے، خالص مادہ پرستانہ اور اباحیت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہو، چنانچہ مولانا مودودیؒ کے اس پمفلٹ کا مقابلہ، ایوبی حکومت نے یوں کیا کہ اسے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ضبط کر لیا۔

چونکہ حکومتی صفوں میں کوئی مائی کا لال ایسا نہ تھا جو سید مودودیؒ کی پرزور اور مدلل تحریروں کا جواب دے پاتا، اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کی سرکاری تحریک کے حق میں، پرویز صاحب، "قرآنی دلائل" کے ساتھ آگے بڑھے، یہ "قرآنی دلائل" کس قسم کے تھے؟ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ..... ﴾ [۲/۲۲۳]

"میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے مقصود، افزائشِ نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمہاری بیویوں کی مثال کھیتی کی سی ہے، جس طرح کسان، اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اگانا مقصود ہو، اسی طرح تم بھی اس وقت، اپنی "کھیتی" میں جاؤ، جب تم (اولاد پیدا کرنا) چاہو۔" ❶

سید مودودیؒ نے، اس افلاطونی دلیل کا جو جواب دیا ہے، ایک نظر، اس پر بھی ڈال لیجیے:

"ایک صاحب نے اس آیت سے ضبطِ ولادت کے حق میں استدلال کرتے ہوئے یہ نرالا نکتہ پیدا کیا ہے کہ کھیتی کے ساتھ کسان کا تعلق صرف پیداوار کی خاطر ہے،

❶ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۳، صفحہ ۳۷

جب ملک کو پیداوار کی ضرورت ہو تو کسانوں کو کھیتی میں جانا چاہیے ، جب پیداوار کی ضرورت ہی نہ ہو تو ان کو سرے سے اپنی کھیتیوں میں جانے کا حق ہی نہ ہونا چاہیے، نیز جتنی پیداوار درکار ہو، بس اسی حد تک کسانوں کو کاشت کرنی چاہیے ، اس سے زیادہ نہیں۔

اس عجیب و غریب تفسیر کی رو سے اولاً تو بانجھ مرد یا بانجھ بیوی کی باہم مقاربت حرام قرار پاتی ہے، ثانیاً، استقرارِ حمل کے بعد زوجین کی باہمی مقاربت اس وقت تک کے لیے حرام ہو جاتی ہے جب تک کہ پھر ایک بچے کی ولادت مطلوب نہ ہو، ثالثاً، میاں اور بیوی کا تعلقِ زوجیت بھی ریاست کے کنٹرول میں چلا جاتا ہے، جب ریاست اعلان کر دے کہ اب ہمیں بچوں کی ضرورت نہیں ہے تو تمام مرد، اپنی بیویوں سے الگ ہو جائیں اور جونہی ایک سرکاری اعلان شائع ہو کہ اب بچوں کی ضرورت ہے تو یک لخت شوہروں اور بیویوں کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے، پھر حکومت کو رپورٹ دی جاتی رہنی چاہیے کہ کتنی عورتیں حاملہ ہو چکی ہیں، مطلوبہ تعداد میں حمل قرار پاتے ہی حکومت سرخ جھنڈی ہلائے گی اور شوہروں کے لیے بیویوں کے پاس جانا ممنوع ہو جائے گا۔

یہ "نظامِ ربوبیت" کی ہمہ گیر منصوبہ بندی کا وہ نقشہ ہے جو ابھی تک کمیونسٹوں کو بھی نہیں سوجھا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ بھی قرآن سے برآمد کر لیا گیا حالاں کہ اگر زوجین کے باہمی تعلق "کسان اور کھیتی" کی تشبیہ کو تشبیہِ تام ہی مان لیا جائے، تب بھی آج تک کسی صاحبِ عقل کے دماغ میں یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ تخم ریزی کے بعد کسان کا کھیتی میں جانا حرام ہو جاتا ہے۔"[1]

بہر حال، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، جو دورانِ بحث ضمناً آ گیا، اصل بحث یہ ہو رہی تھی کہ پرویز صاحب، برصغیر کی تقسیم سے قبل، تحریکِ ضبطِ تولید کو خلافِ اسلام قرار دیا کرتے تھے، لیکن

[1] اسلام اور ضبطِ ولادت (مودودیؒ) صفحہ ۵۸

بعد میں متضاد روش اپناتے ہوئے، اس کے جواز کو قرآن ہی سے کشید کر ڈالا۔

ساتویں مثال ..... خلیفۃ اللہ کا تصور:

قیامِ پاکستان سے قبل، طلوعِ اسلام، خلافتِ الٰہیہ کا قائل تھا، اور انسان کو، اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا کرتا تھا، اور اس حوالے سے وہ افرادِ مسلمین کو بھی اور امتِ مسلمہ کو بھی بحیثیتِ مجموعی، ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا کرتا تھا، چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

(۱)... مسلمان اس پیغام کا حامل ہے جو خالقِ ارض و سماوات کا آخری پیغام ہے، مسلمان، اس دین کا سرمایہ دار ہے جس کی تعریف میں ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ آچکا ہے۔ جب تک اسلام کی بعثت کا مقصد وہی ہے جو اسلام کے داعی نے بتایا ہے، جب تک مسلمانوں کا وظیفۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، جب تک اسلام کا مقصد اولین و آخرین خلافۃ اللہ فی الارض کا قیام ہے مسلمان کے لیے وہی ضابطۂ حیات رہے گا جو اس کے اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ [1]

(۲)... مسلمان ہو تو صحابہ کے سے مسلمان ہو۔ نبی ﷺ کی مدینہ والی مجاہدانہ زندگی اختیار کرو، اور خلیفہ الٰہی کا تاج جو تم سے چھن گیا ہے، اس کو واپس لو۔ [2]

(۳)..... کائنات کی ساری قوتیں، اسی لیے اس کی اطاعت و فرماں برداری پر مامور و مجبور کر دی گئی ہیں کہ وہ وسعتِ شش جہات میں، خدا کی نیابت کر کے جہانِ ناتمام کی تکمیل کر سکے، خلافتِ الٰہی کا قیام ہی انسان کی منزل ہے۔ [3]

(۴)..... وحی و الہام کا سلسلہ خلافتِ الٰہی کو قائم کرنے والے سپاہی تیار کرنے کے لیے تھا، قومی اور انفرادی تربیت کے بعد، جو شے سب سے زیادہ اہم تھی وہ تمام انسانوں کی مرکزی اور اجتماعی تربیت تھی۔ [4]

---

[1] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۵۳
[2] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۴۰ء، صفحہ ۵۷
[3] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷۹
[4] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸۳

(۵)...اس تائید و ترغیب کا مقصود بھی وحدتِ بر توحید اجتماعیت، اخوت اور مساوات قائم کرنا تھا، جس کے بغیر اللہ کی خلافت، قائم نہیں ہو سکتی۔ ❶

(۶)...عام طور پر معروف کا ترجمہ "نیکی" اور منکر کا "برائی" کیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے، لیکن اگر قرآن کریم کی روشنی میں عالم انسانی کی اصلی منزل اور پھر ساری امتوں میں ملت بیضا کے مقام اور اس کے مشن پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی، ہر وہ کام ہے جو خلافت الٰہی کے قیام پر منتج ہو، اور برائی ہر وہ کام ہے جو فرا یا جماعت کو اس منزل سے دور کر دے! صداقت، امانت، عدل، علم پروری، عفت، غریب نوازی وغیرہ اگر نیکیاں ہیں تو اسی لیے۔ جھوٹ، خیانت، ظلم، جہالت، بت دھری وغیرہ اگر برائیاں ہیں تو اس لیے کہ ان سے اجتماعی حیات کا نشو و نما رک جاتا ہے، جو اللہ کی حکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے، امت مسلمہ کی فضیلت کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ وہ خلافت الہیہ کے قیام کے لیے اٹھی ہے۔ اس کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونا یہی ہے اور انہی معنوں میں وہ افضل ترین امت ہے۔ ❷

یہ چھ اقتباسات، ان متعدد اقتباسات میں سے ہیں، جو صرف طلوع اسلام بابت سال ۱۹۴۰ء میں سے ماخوذ ہیں، ورنہ اگر مکمل احصا کیا جائے تو بہت سی مزید عبارات بھی درج کی جا سکتی ہیں، ان اقتباسات سے یہ بالکل واضح ہے کہ طلوع اسلام، اپنے ابتدائی دور میں، جمہور علماء امت کی ہم نوائی میں، خدا کی زمین پر، خدا کے بندوں کی خلافت الٰہیہ کا قائل تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد، یکایک یہ انکشاف ہوا کہ خلافت اللہ فی الارض کا تصور، غیر اسلامی اور غیر قرآنی تصور ہے۔ ملاحظہ فرمایے، طلوع اسلام کا یہ بدلا ہوا موقف بھی:

(۱) اصل یہ ہے کہ اس قسم کے باطل تصورات کا بنیادی سبب وہ عقیدہ ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ خدا نے انسان کو "اپنا خلیفہ" بنایا ہے، یہ عقیدہ قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ ❸

---

❶ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸۴
❷ طلوع اسلام، جون ۱۹۴۳ء، صفحہ ۱۹
❸ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۷

(۲)...... یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے، قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، یہ عیسائیت کا تصور ہے۔ ❶

(۳)... ملوکیت مسلمانوں میں آئی تو اسی باطل تصور نے " السلطان ظل الله علی الارض " (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے) کا روپ دھار لیا۔ اب امت بچاری دُہرے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ دنیاوی امور میں بادشاہ، خدائی اختیارات کا حامل اور مذہبی امور میں مذہبی پیشوا۔ اس کی سند میں یہ کہا گیا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، اور انسانوں سے مراد ہیں اس کے منتخب بندے، .... سلاطین اور علماء.... حالانکہ خدا نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ ❷

(۴).... ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ بھی رائج ہے کہ انسان، دنیا میں " خدا کا خلیفہ " ہے (خلیفۃ اللہ فی الارض۔) یہ تصور بھی قرآن کے خلاف ہے، اللہ نے کہیں بھی انسان کو " اپنا خلیفہ " نہیں کہا۔ آدم کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ: ﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (۲/۳۰) اپنا خلیفہ نہیں کہا۔ ❸

یہ چند اقتباسات، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ خلافت الٰہیہ کے بارے میں طلوع اسلام کا نظریہ، جب کہ وہ ہندوستان میں اشاعت پذیر تھا، اس نظریے سے مختلف بلکہ متضاد ہے جسے اس نے قیام پاکستان کے بعد پیش کیا ہے۔

آٹھویں مثال... وقتِ موت مقرر ہے یا نہیں؟:

کیا موت کا وقت مقرر ہے یا نہیں؟ طلوع اسلام نے اس سوال کے جواب میں بھی متضاد رویہ اختیار کیا ہے، تقسیم ہند سے قبل، طلوع اسلام کا موقف یہ تھا کہ موت کا وقت، مقرر ہے اور وہ بھی ایسا کہ ایک لمحہ کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے:

" یہ خیرات اس موت کی مصیبت کو ٹالنے کے لیے ہے جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ

---

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۸ ❷ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۷

❸ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۲، صفحہ ۴۲

ہے کہ اس کے وقتِ معین میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔'' ❶

لیکن جس طلوع اسلام کا اجراء پاکستان بننے کے بعد، کراچی سے اور پھر لاہور سے ہوا، اس کے نزدیک، موت کا وقت ہرگز مقرر نہیں ہے، چنانچہ وہ نظریہ تعیینِ وقتِ موت پر بایں الفاظ نقد کرتا ہے:

''اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر آنا ہے تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی، قرآن کہتا ہے کہ مرض اور موت کے بھی قانون مقرر ہیں، یہ چیزیں انہی قوانین کے مطابق آتی ہیں اور انہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں، لہٰذا، ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے، سورۂ فاطر میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں یہ فرمایا کہ: ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ (۱۱/۳۵) نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔'' ❷

طلوع اسلام کے اس مضمون کو جب کتابی شکل میں ڈھالا گیا تو اس میں مندرجہ ذیل جملے کا اضافہ ہو گیا جس سے یہ تضاد اور بھی نمایاں ہو گیا۔

''یاد رکھیے! موت کا وقت نہیں، قانون مقرر ہے۔'' ❸

پرویز صاحب کا سابقہ موقف کہ ''موت کا وقت مقرر ہے'' ان کے بعد کے اس موقف کے ساتھ متصادم ہے کہ ''موت کا قانون'' مقرر ہے۔

نویں مثال..... انسانی فطرت ہے یا نہیں؟

فکر و نظر کے اعتبار سے، قیام پاکستان سے پہلے کے اور بعد کے طلوع اسلام میں جن امور میں فرق و تفاوت واقع ہوا ہے، ان میں سے ایک امر، انسانی فطرت کے وجود یا عدم وجود سے متعلق ہے، پاکستان بننے سے قبل، طلوع اسلام، انسانی فطرت کے وجود کو تسلیم کیا کرتا تھا بلکہ

---

❶ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶۷

❷ طلوع اسلام فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۴، ۶۵

❸ قرآنی فیصلے، ج: ۱، صفحہ ۲۹۳

اس سے آگے بڑھ کر وہ، فطرتِ صحیحہ اور فطرت سلیمہ و فاسدہ کے متضاد وجود کا بھی قائل تھا، بعض چیزوں کو، وہ "خلافِ فطرت" اور بعض کو "مطابق فطرت" بھی قرار دیا کرتا تھا۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

"گویا انسان کو اس کے صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی فطرت اگر بالکل فراموش کر دی گئی ہے تو اس کی یاد تازہ کر دی جائے، اگر وہ خارجی اثرات کے پردوں میں چھپ کر غافل ہو چکی ہے تو اسے بیدار کر دیا جائے، اگر وہ اخلاقِ فاسدہ کے امتزاج سے نحیف و کمزور ہو چکی ہے تو اس میں دوبارہ قوت پیدا کر دی جائے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرے کون؟" ❶

ایک مقام پر طلوع اسلام، فطرت سلیمہ اور فطرت صحیحہ کا ذکر، ان الفاظ میں کرتا ہے:

"سب سے بڑی چیز، جو انسان کو صحیح راستہ پر چلنے سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جذبات، عقل یا فطرتِ سلیمہ پر غالب آ جاتے ہیں، جذبات کا قائم رہنا بھی ضروری ہے اور ان کا قائم رکھنا بھی۔ لیکن اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ انہیں فطرت سلیمہ کے تابع رکھا جائے، ان پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ قرآن کریم نے مثلاً اسی لیے مومنین کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ کاظم الغیظ ہوں گے یعنی غصہ کو دبا لینے والے، فنا کر دینے والے نہیں، اسے فطرت صحیحہ کے تابع رکھنے والے۔" ❷

اُن دنوں طلوع اسلام، انسانی فطرت کا اثبات، قرآنی آیات سے کیا کرتا تھا، صرف ایک مقام کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"فطرت صحیحہ، باوجود ان تمام زنجیروں کے خطرے سے آگاہ ضرور کرتی رہتی ہے، جونہی جذبات (نفس امارہ) ابھرنے شروع ہوئے انسان کا قدم صحیح راستہ سے ڈگمگایا اور اسے (نفس لوامہ نے) للکارا۔ لیکن اگر جذبات غالب آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اس کی آواز بھی دب جاتی ہے اور اگر ایک مدت تک یہ کیفیت جاری رہے تو یہ

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸ ❷ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۶

بے چاری بھولی بسری ہو جاتی ہے، اس حالت کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں فسق ہے فرمایا: ﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾ "اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے (اس جرم کے فطرتی نتیجہ کے مطابق) ان کی فطرت (نفس) کو بھلا دیا (فطرت صحیحہ بھولی بسری ہو گئی) یہ لوگ فاسقین ہیں۔"●

اس وقت، طلوع اسلام کو، خلاف فطرت، امور کا بھی اعتراف تھا:

"تمہاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے، یہ غلط ہے اور خلاف فطرت انسانی۔"●

لیکن یہی طلوع اسلام، جب متحدہ ہندوستان سے پاکستان پہنچا تو فطرت انسانی کے انکار پر اتر آیا اور یہ کہنا شروع کر دیا:

"یہ تمام خصوصیات انسان کی حیوانی سطح زندگی کی ہیں، ذہن انسانی کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے ان جذبات کو انسانی فطرت (Human Nature) قرار دے دیا، حالاں کہ انسانی سطح زندگی (Human Level) اس سے یکسر الگ اور ممتاز ہے۔ یاد رکھیے! یہ انسان کے حیوانی جذبات ہیں (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا) انسان کی نہ کوئی "فطرت" ہو سکتی ہے، اور نہ "فطرت" ہے۔"●

آگے چل کر، انسانی فطرت، کا پھر انکار کیا گیا ہے:

"حیوانی سطح زندگی پر انسان کے جبلی تقاضے تو ہیں لیکن انسانی سطح پر اس کی کوئی فطرت (Nature) نہیں۔"●

اب انسانی فطرت کو ماننا، محض ضلالت ہی نہیں بلکہ سب سے بڑی گمراہی قرار پایا:

● طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸

● طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۹

● طلوع اسلام، نومبر و دسمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰۳

● طلوع اسلام، نومبر و دسمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰۷

''انسانی ذات کے تذکرہ کے بعد ہم ان چند ایک نظریات کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ''انسانی فطرت'' کا ہے۔'' ❶

اب یکایک پاکستان میں ان پر یہ انکشاف بھی ہوا:

''فطرتِ انسانی کا عقیدہ، وحی کے منکرین نے وضع کیا، لیکن اس کی تبلیغ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔'' ❷

یہ کہتے ہی پرویز صاحب کے جذبات غیظ وغضب میں تحرک پیدا ہوتا ہے، غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، چہرہ چیں بچیں ہو جاتا ہے، اور پھر وہ انسانی فطرت کے قائلین پر یوں برسنا شروع ہو جاتے ہیں:

''حرام جو یہ لوگ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور ایسا کہنے کے اثرات اور نتائج کیا ہیں، بس بھیڑوں کی ایک قطار ہے جو صدیوں سے اس راستے پر چلی جا رہی ہے جس پر کبھی کوئی پہلی بھیڑ چلی تھی: ﴿ كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۲/۱۷۱)'' ❸

لیکن انسانی فطرت کا یہ پہلو بڑا ہی تابناک اور حیرت انگیز ہے، کہ اس نے بالآخر، ان لوگوں سے بھی اپنے وجود کو تسلیم کروا ہی لیا جو اس کے منکر تھے، اور اسے منکرین وحی کا وضع کردہ عقیدہ قرار دیتے نہیں تھکتے تھے، چنانچہ وہ اس ساری ژاژ خائی کے بعد، مولانا مودودیؒ کی فطرت کے متعلق یہ فرماتے ہیں:

''اگر مودودی صاحب میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے کہ مجھ سے اپنے سمجھنے اور کہنے میں غلطی ہوگئی تھی جس کے لیے میں نادم ہوں، لیکن اپنی غلطی کا اعتراف تو ان کی فطرت میں نہیں۔'' ❹

---

❶ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۲، صفحہ ۳۴

❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۸

❸ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۸

❹ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۳۵

اس کے بعد، پرویز صاحب، کم و بیش، چودہ برس تک زندہ رہے، مگر حرام ہے جو کبھی انہوں نے سوچا ہو کہ جب انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں ہے اور سید مودودیؒ بہر حال، انسان اور بشر ہی تھے، تو مولانا مودودیؒ کی فطرت کا وجود کہاں سے ٹپک پڑا۔ کیا انکارِ فطرت کے بعد، اور اسے منکرینِ دین کا وضع کردہ عقیدہ قرار دینے کے بعد، پرویز صاحب وہ پہلی بھیڑ کا کردار ادا نہیں کر رہے تھے جس کے نقشِ قدم پر بعد میں آنے والی بھیڑوں کو چلنا پڑتا تھا؟

دسویں مثال ...... دین یا مذہب؟!

دین اور مذہب عرفِ عام میں، ہم معنی الفاظ ہیں، دین کی جگہ مذہب اور مذہب کی جگہ دین کا استعمال بکثرت ہر وقت اور ہر جگہ ہوتا رہتا ہے، لیکن پرویز صاحب نے پاکستان بننے کے بعد، یہ نرالی اُپج اختیار کی، کہ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے، حالانکہ دین و مذہب دونوں مترادف المفہوم الفاظ ہیں، لیکن پاکستان میں اختراع پذیر ہونے والے اس نظریے کی وضاحت کو، ۱۹۶۷ء میں، اس طلوعِ اسلام کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا، جو ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا، چنانچہ پرویز صاحب نے ایک تقریر کے دوران یہ انکشاف فرمایا:

> ”حضرت علامہ کی وفات کے بعد، دین اور مذہب کے اس فرق کو نمایاں کرنے کی سعادت، اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی تھی، اور طلوعِ اسلام کے اجراء سے یہی مقصود تھا۔“ ❶

کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ انسان کے سچ کی تو کوئی حد ہوتی ہے، لیکن جھوٹ کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی، جس وقت، جو چاہے، انسان اپنی زبان سے نکال دے اور قلم سے اچھال دے، کون پوچھنے والا ہے، آزادی کا یہی تو معنی ہے، کہ آدمی جتنا چاہے جھوٹ بولتا چلا جائے، کیونکہ وہ اب آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو چکا ہے۔

آئیے! اب اس بات کا جائزہ لیں کہ طلوعِ اسلام جب جاری ہوا تھا تو اس نے دین و مذہب کے اس خود ساختہ فرق کو واضح کیا تھا یا ان دونوں الفاظ کو ہم معنی جان کر، (بغیر کسی معنوی

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۱

فرق کے) ایک دوسرے کا متبادل لفظ سمجھ کر استعمال کیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں، یہ دونوں الفاظ، ایک ہی مفہوم کے حامل تھے، اور خود پرویز صاحب نے، (بعد کے خود ساختہ باہمی فرقِ معانی اور تفاوتِ مفاہیم کو واضح کرنے کی بجائے) ان دونوں الفاظ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا تھا، ذیل میں طلوعِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور کے وہ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں، جو کبھی خود پرویز صاحب ہی کے قلم سے برآمد ہوئے تھے:

(۱)...... ''دنیا کے کسی حصہ میں اور تاریخِ عالم کے کسی دور میں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک، جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہیں مذہب وجہِ جامعیت نہیں ملتا، قرآن کریم میں قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ بنی اسرائیل، قومِ فرعون، سب اقوام میں وجہِ مشترک نسل یا وطن تھا، وہ عام طور پر قبائلی زندگی کا زمانہ تھا، انسانیت کی طفولیت کا وقت تھا، قوموں میں وجہِ جامعیت نسل یا وطن ہی ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ خود حضراتِ انبیاء کرام کی بعثت بھی انہی قوموں کی طرف ہوئی تھی ﴿ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ﴾ (۱۱/۵۰) ﴿ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ﴾ (۱۱/۶۱) وغیرہ، عاد کی طرف، ان کے بھائی ہودؑ اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ ۔ دوسری دنیا میں آ جایئے تو یونانی، رومی، مصری، ایرانی، تورانی، ساسانی وغیرہ سب اقوام میں وجہِ جامعیت نسل اور وطن ہی تھا، مذہب نہ تھا، آریہ ورت میں تو قوم چھوڑ کر ورنوں کی تقسیم بھی نسل سے ہوتی چلی آئی ہے، مذہب وجہِ جامعیت کہاں ملتا ہے؟ اس کا جواب تو ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہی دنیا میں وہ قوم تھی جس میں وجہِ جامعیت مذہب تھا۔''❶

اس اقتباس سے ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ مذہب کو دین ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے،

ایک اور مقام پر، پرویز صاحب، سورۃ المائدہ کی آیت (۵۴) کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''یعنی جو تمہارے دین میں سے نکلتا جائے گا، دوسری قوم بنتا جائے گا اور ایسے لوگوں کے خلاف، اللہ ایسی قوم پیدا کر دے گا جن میں ایمان والوں کی خصوصیات

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۵

ہوں گی، دیکھیے وجہ جامعیت مذہب ہے، وطن نسل وغیرہ کچھ نہیں۔"❶

اس اقتباس کے آغاز میں جس معنی و مفہوم کے لیے دین کا لفظ بولا گیا ہے ٹھیک اسی معنی و مدلول کے لیے آخر میں مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ذرا اور آگے چل کر پھر لفظ مذہب کو دین ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے:

"اگر وطن ہی وجہ جامعیت ہو تو ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا غرض کہ ایک افریقی مسلمان پر کیا بیت رہی ہے، ان دونوں کے درمیان تو وجہ جامعیت مذہب ہی ہے جس نے انہیں ایک جسم کے دو اعضاء بنا دیا ہے کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا لگ جائے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آئے۔"❷

یاد رہے کہ اب تک کے یہ تینوں اقتباسات، اسی طلوع اسلام کے بالکل پہلے شمارے (مئی ۱۹۳۸ء) سے ماخوذ ہیں جس کے بارے میں ۱۹۷۲ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ اس کے اجراء کی غرض و غایت، دین و مذہب میں فرق و تفاوت کو نمایاں کرنا تھا، ان تین اقتباسات کے بعد اب اگلے پرچے (یعنی جون ۱۹۳۸ء کے شمارے) کے اقتباسات پر بھی ملاحظہ فرمائیے:

"ہم سچے اس دعوے کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی مذہب ہے، با توفیق الٰہی، کتاب و سنت، آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں۔"❸

اب ہم اسی مسلم قوم پرست طبقے کے امام مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہب ہے جماعتی مذہب ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب انہوں نے ابھی "قوم پرستی" کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

۱۹۳ء کا ذکر ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں "سیاسی" تقریریں کرنے کی اجازت نہیں، اس پر مولانا آزاد نے اپنے

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۸

❷ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۵

❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۹

رسالہ الہلال میں چار مبسوط اور مفصل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے جس میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ، جو ذہنِ قوم پرستی سے پیشتر، ان کی نمایاں خصوصیت تھی، انہوں نے کتاب وسنت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کفر ہے، شرک ہے، جہالت ہے۔''❶

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہو کہ پرویز صاحب نے یہاں مذہب کا لفظ، صرف اس لیے تبعاً استعمال کیا ہے کہ مولانا آزاد (جن کی تردید میں پرویز صاحب نے یہ مقالہ لکھا تھا) نے اس لفظ کو اپنے اقتباسات میں استعمال کیا ہے، لیکن دو وجوہ سے یہ بات غلط ہے اولاً اس لیے کہ خود مولانا آزاد نے مذہب کے لفظ کو چند مذہبی مراسم عبودیت تک محدود رکھنے کی بجائے ''پوری انسانی زندگی کا نائحہ عمل'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے، لہٰذا ان کے تتبع میں بھی اگر اس لفظ کو پرویز صاحب نے استعمال کیا تھا، تو پھر بالیقین یہ لفظ وہی وسیع مفہوم رکھتا ہے جسے بعد میں پرویز صاحب نے لفظ دین کا خاصہ و لازمہ قرار دیا تھا، ثانیاً اس لیے کہ خود پرویز صاحب نے، اپنے اقتباسات میں بھی، لفظ مذہب کو دین ہی کے معنی استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

''مسلم قومیت'' کا تصور، جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک منظم مذہب (Organised Religion) ہے، اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے، اس کے برعکس، ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دیتے ہیں، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔''❷

۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام کے ابتدائی شماروں میں سے تیسرا شمارہ، جولائی کا شمارہ تھا، اب اس کے اقتباسات بھی ملاحظہ فرمایئے، اور اس سوال کا جواب بھی ان عبارات میں واضح ہے کہ اسلام مذہب ہے یا دین؟ نیز یہ بھی کہ کیا طلوعِ اسلام نے مذہب اور دین کے فرق کو ملحوظ رکھتے

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۷ ❷ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۹

ہوئے دین کا ''مناسب'' لفظ اختیار کیا ہے؟ یا مذہب کا ''غیر مناسب'' لفظ؟

''اس پر شاید یہ کہا جائے کہ جو اشتراکیت، آئندہ حکومت کا خاکہ تیار کرے گی اور اشتراکیت کی بنیاد پر تعمیر کا نقشہ بنائے گی، اس کو پہلے خود مذہب سے آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ مذہب کے خلاف نبرد آزما ہو سکے، حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثریت خود ایک مستقل مذہب کی علم بردار ہے اور اس کو اپنا مذہب اتنا ہی عزیز ہے جتنا مسلمانوں کو اپنا مذہب اسلام۔'' ❶

''بلاشبہ اشتراکیت، خدا اور مذہب کی دشمن ہے، اخلاق اور روحانیت کے منافی ہے، مگر ہندو ''مذہب'' کے خلاف نہیں ہے۔'' ❷

کیا پاکستان بننے کے بعد، پرویز صاحب، اسلام کے لیے جس لفظ کو استعمال کیا کرتے تھے، اس کا استعمال، وہ ہندوستان میں نہیں کیا کرتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی ''جھوٹ'' اختیار کرتا ہے تو خواہ کتنی ہی احتیاط برتے، اس کو دوام کے ساتھ نباہ نہیں سکتا، اب دعویٰ تو پرویز صاحب کا یہ تھا کہ طلوع اسلام کے اجراء کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ دین و مذہب میں فرق و تفاوت کو واضح کرے، لیکن جملہ اقتباسات پرویز، نہ صرف یہ کہ اس فرق کو واضح نہیں کرتے، بلکہ ان دونوں الفاظ کو ہم معنی اور ایک ہی مفہوم کا حامل قرار دیتے رہے ہیں۔ اب مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے:

''اب تصور کیجیے ایسی حکومت کا جو خدا کی منکر ہو، مذہب کی دشمن ہو، اخلاق کے لیے سم قاتل ہو، انسانوں کو قوم و وطن کے دائرہ میں محبوس کرنے والی ہو اور جس کا مذہب اور نصب العین صرف روٹی اور مادی دنیا کی چند روزہ خوش حالی ہو، اور پھر تصور کیجیے اسلام جیسے پاکیزہ اور مقدس مذہب کا، جس کی بنیاد خدائے تعالیٰ کا وجود ہو، جس کی اساس مکافات عمل یعنی آخرت کا عقیدہ ہو، جس کا ستون مکارم اخلاق اور تزکیہ نفس ہو اور جو بہمہ وجوہ اس قدر مکمل اور جامع ہو کہ دین اور دنیا کی سعادتیں اس میں

---

❶، ❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۸

جمع ہوگئی ہوں، اس پر اشتراکی حکومت کی بدولت کیا گزرے گی۔" ❶

آگے چل کر، پھر پرویز صاحب، "مذہب" کو اسلام ہی کے مفہوم میں بطور "دین" پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ ہیں وہ وجوہ و اسباب جو مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے روکتے ہیں اور ان کو اپنی علیحدہ تنظیم اور اپنی علیحدہ مرکزیت کے قیام کی طرف توجہ دلاتے ہیں ورنہ حریت عمل اور استقلالِ حیات کا جذبہ مسلمان کا مذہب اور ایمان ہے اور وہ ہندو سے زیادہ آزادی کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔" ❷

مسلمان جب تک مذہب اسلام پر قائم ہے وہ ایک انچ بھی جو دوہ مذہب سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ: ﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴾ کے حکم خداوندی میں جکڑا ہوا ہے وہ بازار سیاست میں "کچھ لو اور کچھ دو" کی بنیاد پر کوئی سودا بازی نہیں کر سکتا، وہ یہ کہہ کر اپنے اصولوں سے منحرف نہیں ہو سکتا کہ "سیاسی مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں اور سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں"۔ اس کے نزدیک حرف آخر صرف قرآن و سنت کے احکام ہیں، اور جہاں کہیں خدا یا رسول کا حکم آ گیا وہاں:

"مسلمان اس مقام پر مجبور ہو جاتا ہے، فریق مقابل، اس کی مجبوری کو نہیں سمجھتا اور کہہ دیتا ہے کہ "دیکھو صاحب! ہم معاملہ کے تصفیہ پر آمادہ ہیں، لیکن یہ حضرت عجیب قسم کے واقع ہوئے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں، ان سے معاملہ طے کیسے ہو، بات تو جب ہو کہ کچھ ہم بڑھیں کچھ یہ گھٹیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اتحاد و مفاہمت چاہتے ہی نہیں، یہ تو انگریزوں کے پٹھو ہیں، یہ تو جنگ آزادی کے راستے میں سنگ گراں بن کے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں"۔ مسلمان یہ سب کچھ سنتا ہے اور متعجب ہو کر رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! میں نے وہ کون سی خطا کی ہے جو اس قسم کی سب و شتم کا نشانہ بنایا جا رہا ہوں، وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ "بھائی! یہ میرے مذہب کا معاملہ ہے، میں

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۹ ❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۲

اس میں مجبور و بے بس ہوں'' تو اس پر پھر ایک شور بلند ہو جاتا ہے کہ ''لو بھئی! اب کونسل کی نشستوں میں بھی مذہب آ گھسا، بندے ماترم کا گیت بھی مذہبی مسئلہ بن گیا، اور ہندی کا جھگڑا بھی دین کا معاملہ ہو گیا''۔ مسلمان پھر یہ سب کچھ سنتا ہے اور کہنے والوں کا منہ تکتا رہ جاتا ہے اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ:

یا رب! وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لہٰذا برادرانِ وطن جب تک مسلمان کی اس مجبوری کو نہیں سمجھیں گے، ملکی معاملات نہیں سلجھ سکتے، جب تک انہیں اس بات کا یقین نہیں آ جائے گا کہ ایک مسلمان کے لیے پولنگ اسٹیشن پر جا کر صحیح ووٹ دینا بھی ایسا ہی مذہبی فریضہ مقدس ہے جیسا کہ نماز پڑھنا۔ سیاسی مسائل سے اختلافات کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ہم ایک نشست میں اتنا تو نہیں کر سکتے کہ اسلام کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے لا کر یہ بتا دیں کہ بساط سیاست کے جن جن گوشوں کو ہندو خالص دنیاوی اور ملکی مسائل سمجھتا ہے وہ مسلمان کے نزدیک عین دینی اور مذہبی معاملات ہیں۔'' ❶

اسی مقالہ میں آگے چل کر، یہ اقتباس بھی موجود ہے:

''ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے، یا وہ بحیثیت مسلمان، مذہب کی رو سے ایسا کہنے اور کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر تو وہ ان کا اپنا خیال ہے تو اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ''خیال'' نہیں بلکہ قرآن حکیم کا حکم ہے تو پھر تو جب تک ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، وہ اس بنیادی اصول سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا، ساری دنیا اس کی مخالفت کرے، اسے فرقہ پرست کہے، ضدی قرار دے، ''غدار وطن'' اس کا نام رکھے، جو جی میں آئے کہتی جائے، وہ فیصلے میں تبدیلی تو ایک طرف، تبدیلی کا خیال تک بھی نہیں لا سکتا۔'' ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۰، ۵۱

❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۲

چند صفحات کے بعد، اسی مقالہ میں، یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

"مسلمان فی ذاتہٖ ایک مستقل قوم (Nation) ہے اور یہ کسی مخلوط قوم (Nation) کا جزو بن ہی نہیں سکتے۔ مذہباً یہ ناممکن ہے، یہ جب تک مسلمان رہے گا، ایک قوم، ایک جماعت کی حیثیت سے رہے گا، جب کسی مخلوط قوم میں جا کر مل جائے گا، اسلام کے دائرے سے باہر چلا جائے گا۔"❶

آگے چل کر، کانگریس کے متعلق (جو ہندوؤں اور بعض مسلمانوں پر مشتمل، بھارت کی سیاسی پارٹی تھی)، یہ واضح کیا جاتا ہے:

"اسلام کے نزدیک چونکہ مسلم یا غیر مسلم کی مخلوط جماعت کا تصور ہی باطل ہے، اس لیے مسلمانوں کے نزدیک یہ جماعت غیر مسلموں کی جماعت ہی رہے گی، مسلمان ایسا سمجھنے، ایسا ماننے اور ایسا کہنے پر، اپنے مذہب کی رو سے مجبور ہے، اس میں نہ کسی سیاسی مصلحت کو دخل ہے، نہ کسی ذاتی رائے کو۔"❷

یہ جملہ اقتباسات، اس امر پر کھلی کھلی دلیل ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل، دین سے مراد وہی کچھ تھا جسے مذہب کہا جاتا ہے اور مذہب سے مفہوم بھی وہی کچھ تھا جسے دین کہا جاتا ہے، دین اور مذہب دونوں باہم مترادف اور ہم معنیٰ الفاظ تھے، اور اسلام کے لیے دونوں الفاظ کا استعمال خود پرویز صاحب کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، اُن دنوں، وہ، اسلام کے لیے دین اور مذہب (دونوں الفاظ) کا استعمال نہ صرف یہ کہ جائز سمجھا کرتے تھے بلکہ عملاً ان دونوں کا اطلاق بھی کیا کرتے تھے، لیکن قیام پاکستان کے بعد، ان پر یہ انکشاف ہوا کہ دین کسی اور چیز کا نام ہے اور مذہب کسی اور ہی شے کو کہتے ہیں۔ پھر دین و مذہب کی یہ تفریق طے کر ڈالنے کے بعد، مذہب کے لفظ کا اطلاق، ان تعلیمات پر بالالتزام کیا جانے لگا جو اسلام کے حوالے سے علما کرام پیش کیا کرتے ہیں اور دین کا لفظ، انہوں نے خود اپنے بیان کردہ تصورات و اعمال کے لیے مخصوص کر دیا، علما امت کے پیش کردہ دین کو "عجمی سازش" کے نام سے مطعون کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور خود اپنے

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۷ ❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۲

بیان کردہ مذہب کو "قرآنی دین" کے طور پر سراہنے لگے، اس طرح دین اور مذہب کے دونوں الفاظ میں معنوی مغایرت پیدا کرتے چلے گئے۔ پھر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ انہوں نے یہ اعلان کر ڈالا:

"حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے، قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا، قرآن نے مسلمانوں کو مذہب نہیں دیا، دین عطا فرمایا ہے، اور دین کے معنیٰ آج کی اصطلاح میں نظام معاشرت (Social Order) یا نظام مملکت (System of State) ہیں۔" ❶

اسی صفحہ پر نیچے حاشیہ میں پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"اہل مغرب، قرآنی زندگی سے واقف نہیں تھے، اس لیے انہوں نے اسلام کے لیے بھی (Religion) کا لفظ اختیار کیا۔" ❷

چونکہ مذہب (Religion) کا لفظ اہل مغرب نے اختیار کیا تھا، اس لیے پرویز صاحب نے بڑی ذہانت اور فطانت سے کام لیتے ہوئے، اس لفظ کو علمائے کرام کی طرف منسوب کر دیا بلکہ ان کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے لیے دین کا لفظ اختیار کر لیا، اور پھر علما پر یہ طنز کرنا شروع کر دیا کہ "مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے" اور خود یہ بات بھول گئے کہ طلوع اسلام کے ہر شمارہ کے سرورق کی پیشانی پر "نظام ربوبیت" کا جو لفظ لکھا جاتا ہے وہ کون سا قرآنی لفظ ہے، لیکن: ؎

غیر کی آنکھوں کا تنکا، تجھ کو آتا ہے نظر دیکھ اپنی آنکھ کا، غافل! ذرا شہتیر بھی!

ایک اور مقام پر، دین اور مذہب میں، (اپنے خودساختہ) فرق و تفاوت کی وضاحت، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے "مذہب" اور "دین" کے بنیادی فرق کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔ مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان، خدا کے ساتھ، اپنا پرائیویٹ رشتہ جوڑے، اپنی نجات کی فکر کرے، اس کے لیے خدا

---

❶، ❷ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۱

کی "پرستش" کرتا رہے۔ باقی رہے دنیاوی امور اور اجتماعی مسائلِ حیات، سو انہیں اپنی صوابدید کے مطابق خود حل کرے، مذہب کا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس، دین سے مقصود یہ ہے کہ:...... ●"

حقیقت یہ ہے کہ اس اقتباس میں "مذہب" کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ اہلِ مغرب کا تصور ہے، جیسا کہ خود پرویز صاحب کو بھی تسلیم ہے، اسلام کا تصور، خواہ اسے دین کہیے یا مذہب، وہی ہے جو قرآن و سنت پر مبنی نظامِ معاشرت یا نظامِ مملکت کہلاتا ہے اور جسے متحدہ ہندوستان میں خود پرویز صاحب بھی اور مولانا مودودیؒ بھی پیش کیا کرتے تھے، البتہ پاکستان بننے کے بعد، پرویز صاحب نے اسلام کو (i) مبنی بر قرآن و سنت کہنے کی بجائے، فقط قرآن ہی پر اساس پذیر کہنا شروع کیا اور (ii) پھر اسلام کے لیے لفظ دین کو اپنی خودساختہ تشریحات کے لیے خاص کر لیا، لیکن مولانا مودودیؒ نے قرآن و سنت پر مبنی نظامِ حیات کو، (خواہ دین کہا یا مذہب) اسلام ہی قرار دینے کی روش کو برقرار رکھا۔ ملاحظہ فرمایئے، ان کا ایک اقتباس، جس میں وہ "مذہب کا اسلامی تصور" کے زیرِ عنوان، فرماتے ہیں:

"محمد ﷺ جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصور پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اس کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنٰی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے، ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے پیش کرنا ہی غلط ہے، حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوتِ محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی

● طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۱ء، صفحہ ۷

طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لا متناہی سفر میں، جو دنیا سے لے کر، آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی وسعادت کے ساتھ گزار دے۔ اسی مذہب کا نام اسلام ہے، یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے، یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا مقصد، انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترتیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔" ❶

الغرض، اسلام کو خواہ دین کہا جائے یا مذہب، وہ پوری زندگی پر حاوی نظام فکر و عمل کا نام ہے۔

اب مولانا مودودیؒ کا ذکر آ گیا ہے، تو "مفکر قرآن" صاحب کے چند تضادات، ان کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمائیے:

مزاجِ پرویز کا ایک خاص پہلو:

بعض لوگوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے، کہ وہ محبت یا نفرت کے ہر دو جذبات سے مغلوب ہو کر، افراط و تفریط کی انتہائی حدوں کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ، عقیدت و محبت میں کسی کی حمایت پر اتر آئیں، تو حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں نفرت و عداوت میں شدت پیدا ہوئی تو دوسری انتہا کو لڑھک گئے، کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا، بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا۔ اگر ایک طرف، انہیں، کسی بخیل و کنجوس فرد کو حاتم طائی پر، اور کسی بزدل و ڈرپوک شخص کو رستم و سہراب پر فضیلت دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، تو دوسری طرف، کسی سے رنج پہنچ جائے، تو اس کی پاکیزہ زندگی پر دھبہ لگانے، اس کی عزت پر خاک ڈالنے، اور اس

---

❶ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، جلد اول، صفحہ ۹۵ تا ۹۶

کے حسب ونسب پر طعن کرنے میں بھی ذرا شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اپنی ممدوح شخصیت میں، انہیں وہ خوبیاں نظر آتی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن اپنی مبغوض ہستی کے فضائل و کمالات بھی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' جناب پرویز صاحب، ایک ایسے ہی غیر متوازن اور جذباتی انسان تھے۔ انہیں، اگر ایک طرف، قائد اعظم کی ذات میں، یہ فرضی اور خود ساختہ خوبیاں دکھائی دیتی ہیں، کہ انہوں نے ''اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا'' اور وہ ''قرآن کریم کے حقائق پر غائر نگہی'' کا وصف رکھتے تھے، اور یہ کہ ''قرآنی حقائق اور اصول و اقدار، اُن کے قلب کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے تھے''، اور طلوع اسلام نے ''قرآنی بصیرت کے نہج سے، ہر ایک کو ان سے کمتر پایا تھا'' تو دوسری طرف، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے واضح کمالات، نمایاں اوصافِ جلیلہ، شاندار خوبیاں، اور علمی فضائل، پرویز صاحب کی نگاہ سے قطعی طور پر اوجھل تھے۔ انہیں مولانا مودودیؒ کی ذات میں، صرف عیوب و نقائص ہی نظر آیا کرتے تھے، جنہیں وہ بار بار، اعادہ و تکرار بسیار کے ساتھ، مختلف پیرایوں میں، متفرق اسالیب و انداز میں خوب اچھالا کرتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے

''یہ ٹھیک ہے کہ ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر۔'' ●

لیکن ایک زمانہ تھا کہ:

یہی دل سوز ہے جو رہ چکا ہے دل نشیں برسوں

یہی مولانا مودودیؒ، جنہیں آج پرویز صاحب، ''نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر''، کبھی ان کی ممدوح و محبوب ہستی تھے، اور جب تک پرویز صاحب، ان سے بگڑ نہیں بیٹھے تھے، وہ، خود اُن کے اور ان کے مجلّہ ترجمان القرآن کے متعلق لکھا کرتے تھے:

''ترجمان القرآن، ایک ماہانہ مجلّہ ہے، جو چھ سال سے مسلسل اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشر و تبلیغ کر رہا ہے۔ جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے، اُن کے لیے بس یہ کہنا ہی

● طلوع اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶

کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مولانا موصوف کو، اس زمانہ میں اسلام کی خدمت اور سنت کی تجدید کے لیے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے، اور وہ شرح صدر، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے، جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے، قرآن کریم کی روشنی میں، ہر مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے، ترجمان القرآن کا موضوع، قرآن حکیم ہے، ایک طرف وہ قرآن حکیم کی روشنی میں تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے، اور دوسری طرف، فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے، مغربی فلسفہ کا رعب دلوں سے نکال رہا ہے۔ قرآن کریم کو منشاءِ الٰہی کے مطابق صحیح سمجھنا، صحیح اصولوں پر اس کی نشر و اشاعت کرنا، اسلام کے خلاف باطل سرچشموں کا پتہ لگانا، اور ان کو عقل سلیم کی حجت سے بند کرنا، اسلام کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مخالفت سے مرعوب نہ ہونا، ذہنیتوں میں یکسر انقلاب پیدا کر دینا، اور وقت کی مناسبت سے جملہ مشکلات کا حل، قرآن کریم سے پیش کرنا وغیرہ وہ خصوصیات ہیں، جو بحمد اللہ رسالہ ترجمان القرآن کو حاصل ہیں۔ ہندوستان میں آج کل سیاست کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی بھی فرما رہے ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ، ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے، خصوصاً ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کے لیے جو فلسفۂ جدیدہ، سائنس اور مغربی حکماء کی دانش فروشیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں، اور جنہوں نے مذہب کو عقل و دانش اور ترقی کے خلاف سمجھ لیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبا اور اساتذہ کو اس رسالہ کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیے، بلحاظ نصب العین اور مسلک، ترجمان القرآن اور طلوع اسلام کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں سمجھئے۔"❶

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۷۲

مَا ابعد الیوم من الامس:..... پرویز صاحب کے آج اور کل میں کس قدر بونِ بعید اور تفاوتِ شدید ہے۔ کل تک وہ، جس شخص کو تفقہ فی الدین، اسلامی بصیرت، شرحِ صدر، اسلام کی صحیح ترجمانی اور اس کی صحیح خدمت کرنے، قرآن کریم کی روشنی میں ہر مرض کا تریاق مہیا کرنے، اور نُورِ قرآن سے تاریک دلوں کو منور کرنے پر، خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے، آج وہ، اُسی شخص کے متعلق یہ فتویٰ داغتے ہیں:

"یہ صاحب قرآنی حقائق و تصورات کی ابجد تک سے لابلد ہیں۔" ●

کل تک، جس شخص کو "اللہ تعالیٰ نے اسلام کی خدمت اور ملت کی تجدید کے لیے بہرۂ وافر عطا فرمایا" تھا، آج وہی شخص، پرویز صاحب کے نزدیک، اسلام کو مسخ کرنے کی سازش کا بانی ہے:

"پاکستان کا خطۂ زمین، اس عظیم مقصدی تجربہ گاہ بننے کے لیے حاصل کیا گیا تھا، لیکن اسے ہماری سوختہ بختی کہیے کہ یہاں بھی اس قسم کی سازش کارفرما ہوگئی جس قسم کی سازشوں نے اسلام کے تابندہ چہرے کو مسخ اور حضورؐ کی سیرتِ تابدار کو (معاذ اللہ) داغ دار کیا تھا۔ اس سازش کے بانی ہیں، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔" ●

کل تک متحدہ ہندوستان میں، جو شخص، "قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشرو تبلیغ کر رہا" تھا، آج وہی شخص، "مفکرِ قرآن" کے نزدیک، اُن لوگوں میں شامل ہے، جنہیں، قرآن مجید سے چڑ ہے:

"قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے، کیوں کہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے، ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس قدر چڑ ہے، اس کا اندازہ، ایک واقعہ سے لگایئے۔...." ●

کل تک، جو شخص ابوابِ فتنہ ہائے باطل کو "عقلِ سلیم کی حجت سے بند کر رہا" تھا، اور "بڑی

● طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۱

● طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۲

● طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۳

سے بڑی مخالفت سے بھی مرعوب نہیں" ہوتا تھا، اور "ذہنیتوں میں تلسر انقلاب پیدا کر رہا" تھا، آج اس کے متعلق، یہ اعلان کیا جاتا ہے:

"اُن کا واحد مشن نفرت پھیلانا ہے۔" ❶

مولانا مودودیؒ کے بارے میں، "مفکر قرآن" (یا طلوع اسلام) کے کل کے اور آج کے متضاد بیانات، اور پھر ان میں پائے جانے والے لب ولہجہ کو دیکھ کر، ہر شخص، پرویز صاحب کی جذباتی اور غیر متوازن شخصیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اور پھر حقد و حسد، کینہ و عناد اور مخالفت و عداوت اس پر مستزاد ہے۔ اس وقت بے ساختہ میرے سامنے، یہودی مزاج کو مبرہن کرنے والا وہ واقعہ آ رہا ہے، جس میں ایک یہودی عالم، حضرت عبداللہؓ بن سلام، خدمت نبویؐ میں اسلام قبول کرتے ہی، یہ عرض کرتے ہیں:

"یہود ایک افترا پرداز قوم ہیں، اور میں عالم ابن عالم اور رئیس ابن رئیس ہوں، آپ ان کو بلا کر میری نسبت دریافت کیجیے، لیکن میرے مسلمان ہو جانے کی خبر نہ دیجیے گا۔ آنحضرت ﷺ نے یہود کو طلب فرما کر اسلام کی دعوت دی، اور پوچھا کہ عبداللہ بن سلام کون شخص ہیں؟ بولے، ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں۔ فرمایا، وہ مسلمان ہو سکتے ہیں؟ جواب ملا کبھی نہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام، مکان کے ایک گوشہ میں چھپے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے آواز دی، تو کلمہ پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے، اور یہودیوں سے کہا "ذرا خدا سے ڈرو، تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ رسولؐ ہیں اور ان کا مذہب سچا ہے، اور باایں ہمہ ایمان لانے پر تم آمادہ نہیں ہوتے"۔ یہود کو خلاف توقع جو خفت نصیب ہوئی، اس نے ان کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے غصہ میں کہا کہ "تم جھوٹے ہو، اور ہماری جماعت کے بدترین شخص ہو، اور تمہارا باپ بھی بدتر تھا۔" ❷

پرویز صاحب نے، ماشاءاللہ، طابق النعل بالنعل، قوم یہود کی پیروی کرتے ہوئے

---

❶ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۷ء، صفحہ ۲

❷ سیر الصحابہ، ج ۳، سیر انصار، دوم، صفحہ ۲۰۳

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ کی واضح تصویر پیش کی ہے۔

تضاداتِ پرویز، قیامِ پاکستان کے بعد:

ہر وہ شخص، جو خالی الذہن ہو کر، قرآن کا مطالعہ، طلبِ ہدایت کی نیت سے، نہ کہ الٹا قرآن کو ہدایت دینے کی غرض سے کرتا ہے، اپنے اظہارِ مافی الضمیر میں تضادات وتناقضات سے بالاتر ہوتا ہے، مگر وہ شخص، جس کے قلب و دماغ پر، وقت کی غالب لیکن ملحدانہ تہذیب کے افکار و نظریات مستولی ہوں، اور وہ غیر اسلامی ثقافت کے اصول واقدار کی دماغی اسیری اور ذہنی غلامی کا شکار ہو، وہ اگر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے، تو قدم قدم پر، قرآنی اور غیر قرآنی تمدن کے اقدار واطوار میں مغایرت بلکہ تصادم پاتا ہے۔ چونکہ اس کے دل و دماغ میں غیر اسلامی افکار واقدار راسخ ہوتے ہیں، اس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے قلبی معتقدات اور قرآنی نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے، اس تگ ودو میں، کبھی وہ ایک طرف لڑھکتا ہے، اور کبھی دوسری طرف۔ اور یہی رویہ اس کے تضادات وتناقضات کو جنم دیتا چلا جاتا ہے، شہنشاہِ تضادات اور رئیس التناقضات، "مفکرِ قرآن" جناب پرویز صاحب کو ہم اسی کیفیت میں مبتلا پاتے ہیں۔ زیر بحث تضاداتی امور کا تعلق، خواہ منصبِ نبوت ورسالت سے ہو، یا تاریخی حقائق سے، قرآن کے ترجمہ و مفہوم سے ہو یا اس کی تفسیر وتاویل سے، اصولِ فقہ سے ہو یا تاریخ فقہ سے، ہر معاملہ میں "مفکرِ قرآن" صاحب نے تضادات وتناقضات کے ریکارڈ قائم کر دیے ہیں۔ یہ جملہ تضادات، اس شخص کی نگاہ سے مستور و مخفی نہیں ہیں جس نے قیامِ پاکستان سے قبل سلسلۂ معارف القرآن کی ہر کڑی اور طلوعِ اسلام کے ہر شمارہ کا تقابلی مطالعہ، ان کی بعد کی نگارشات کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہو۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد میں، ان کے بدلتے ہوئے نظریات کے باعث، پیدا ہونے والے تناقضات و تضادات کی بعض مثالیں پہلے گزر چکی ہیں، اب چند وہ امثلہ ملاحظہ فرمایئے، جن میں تضادات کا ماخذ، ۱۹۴۷ء کے بعد کی نگارشاتِ پرویز ہیں:

پہلی مثال: اشتراکیت بمقابلہ سرمایہ دارانہ نظام:...... جس شخص کا دل، کسی سے عشق،

محبت میں اور کسی سے نفرت و عداوت میں حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جائے، تو اس کی ایک سے مذموم محبت اور دوسرے سے شدید نفرت، کبھی اس کی زبان سے کلمۂ حق برآمد نہیں ہونے دیتی۔ ایسے شخص کا قلب و دماغ مداری کی ایسی پٹاری بن جاتا ہے جس میں تضادات و تناقضات کا وافر ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اور وہ حسبِ ضرورت (یا بقولِ پرویز صاحب، "نظریۂ ضرورت" کے تحت) جس وقت جو چیز چاہتا ہے، پیش کر دیتا ہے۔ ٹھیک یہی کیفیت "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی تھی، وہ ایک مقام پر، اشتراکیت کو، جسے انہوں نے قرآنی ٹھپہ لگا کر، قرآن کا معاشی "نظامِ ربوبیت" قرار دے رکھا تھا، خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، انسانیت کے لیے آیۂ رحمت قرار دیتے ہیں:

"اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لیے آیۂ رحمت ہے، (اور یہ واقعہ بھی ہے۔)" ❶

اور ایک دوسرے مقام پر، جہاں "نظریۂ ضرورت" کا تقاضا معکوس ہو جاتا ہے، وہاں، وہ، یہ فرماتے ہیں:

"سوشلزم، نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر قرار پاتا ہے۔" ❷

اور اگلے ہی صفحہ پر پھر اس کا اعادہ، یوں کرتے ہیں:

"سوشلزم کا نظام، نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔" ❸

کس کا یقین کیجئے، کس کا یقیں نہ کیجئے　　لائے ہیں بزمِ ناز سے، لوگ خبر الگ الگ

یہاں اسی تضاد کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، اوپر، پرویز صاحب کی کتاب "نظامِ ربوبیت" سے یہ اقتباس دیا گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں، اشتراکیت کا نظام، انسانیت کے لیے آیۂ رحمت ہے، اور خود "مفکرِ قرآن" نے بھی، بین القوسین، یہ کہہ کر کہ "اور یہ

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۸۔ نظامِ ربوبیت، صفحہ ۲۹۸

❷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۹ء، صفحہ ۵۰

❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۱

واقعہ بھی ہے" اس کی تصدیق و تصویب کی ہے، یہ بات قارئین کے لیے موجب حیرت ہوگی کہ "مفکر قرآن" نے اسی کتاب کے ابتدائی صفحات میں، یہ بھی لکھا ہے کہ تحریک اشتراکیت:

"انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام کہیں ساری دنیا پر مسلط ہو گیا تو اس سے وہ کس عذاب الیم میں مبتلا ہو جائے گی۔" ❶

اب غور فرمایئے، ایک ہی کتاب میں، اس کے ایک مقام پر، اشتراکیت کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا ہے، اور دوسرے مقام پر، اسے، انسانیت کے لیے آیۂ رحمت کہا گیا ہے، اور اس کتاب میں اور بھی کئی تضادات موجود ہیں، پھر لطف کی بات یہ کہ ایسی متضاد مواد رکھنے والی کتاب کے متعلق، پرویز صاحب ہی کا یہ فتویٰ ہے:

"تضاد" تو تصنیف کا ایسا نقص ہے کہ اگر کسی کتاب میں دو باتیں بھی باہم دگر متضاد ہوں تو علمی طبقہ میں اس کتاب کا کوئی وقار ہی نہیں رہتا۔ ❷

دوسری مثال: رسول ﷺ کا اختیار تشریع و تقنین :.... حضور نبی اکرم ﷺ خدا کی طرف سے مامور شارع اور قانون ساز تھے یا نہیں؟ قبل اس کے کہ اس کا جواب دیا جائے، پہلے ایک لطیفہ سن لیجیے:

ایک گاؤں میں کسی پنچایتی جج کے سامنے فریقین مقدمہ پیش ہوئے۔ ایک فریق نے بیان دیتے ہوئے جو کچھ کہا، اس پر جج صاحب نے صاد کرتے ہوئے فرمایا "تم ٹھیک کہتے ہو"۔ جب دوسرے فریق نے بیان دیتے ہوئے، اپنے مدمقابل کے بالکل الٹ موقف پیش کیا، تب بھی جج صاحب کے یہی الفاظ تھے "تم بجا کہتے ہو"...... اس پر حیران ہو کر موجود لوگوں نے کہا کہ "یہ آپ نے کیا کیا؟ دونوں کے موقف کو درست اور بجا قرار دیا، حالاں کہ دونوں کے موقف باہم متضاد اور متناقض ہیں"۔ جج صاحب نے اسی لب و لہجہ میں برجستہ جواب دیا "تم بھی ٹھیک کہتے ہو"۔

❶ نظام ربوبیت، صفحہ ۲۲ ❷ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۰

ہمارے ''مفکر قرآن'' کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔

ایک مقام پر، قائداعظم محمد علی جناح صاحب، یہ فرماتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ عظیم مصلح تھے، عظیم ترین راہنما تھے، عظیم واضع قانون تھے۔'' ❶

اور دوسرے مقام پر ایک ریٹائرڈ جسٹس پی زیڈ کیکاؤس، یہ لکھتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ کو ذرہ برابر قانون سازی کا اختیار نہیں تھا۔'' ❷

اور ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، دونوں کو ''بجا ارشاد فرماتے ہو'' کی سند عطا فرماتے ہوئے، دونوں کو خراج تحسین پیش فرماتے ہیں اور ان کی متضاد عبارات کو (تردیداً نہیں) بلکہ تائیداً اور تحسیناً پیش فرماتے ہیں۔

تیسری مثال: معاویہ رضی اللہ عنہ چٹھی نویس یا کاتبِ وحی؟ ...... حضرت معاویہؓ کاتب وحی تھے؟ یا کچھ اور؟ طلوع اسلام اس سوال کے دو متضاد جواب دیتا ہے۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود ایک جلیل القدر صحابی تھے، ان کا شمار، اُن کاتبانِ وحی میں ہوتا ہے، جن کو ﴿ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾ (خوش نویس، شرافت کے مجسمے، اور نہایت نیکوکار) کے القاب سے خود قرآن نے یاد کیا ہے۔'' ❸

ایک دوسرے مقام پر، یہی طلوع اسلام، یہ لکھتا ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (جو کسی زمانہ میں حضورؐ کے خطوط لکھا کرتے تھے اور جنہیں لوگوں نے غلطی سے کاتبِ وحی مشہور کر دیا ہے) کامیاب ہو گئے۔'' ❹

چوتھی مثال: سلمان رضی اللہ عنہ فارسی، تاریخی شخصیت؟ ...... طلوع اسلام، صحابی رسول، حضرت سلمانؓ فارسی کی تاریخی شخصیت کا انکار، بایں الفاظ کرتا ہے:

''اگر داعی صرف بنو ہاشم سے وابستہ رہتے تو روحِ ایران جلوہ ریز نہ ہوتی، اور زنادقہ کا اصلی مقصد فوت ہو جاتا، اس لیے ایک شخصیت، سلمان فارسی کے نام سے،

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۳، مارچ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۲ ❷ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۲

❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۲ء، صفحہ ۳۹ ❹ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۶

احادیث کے ساتھ گھڑی گئی، یہ کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔"❶

اور پھر دوسرے مقام پر، انہیں نہ صرف ایک تاریخی شخصیت قرار دیتے ہوئے، بلکہ واجب الاحترام اور لائق تعظیم صحابئ رسول کہہ کر بایں الفاظ ان کا ذکر کرتا ہے:

"آخر میں ہم حضرت سلمان فارسیؓ جیسے مستند و معظم صحابی کا قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔"❷

ایک وضاحت:

تیسری اور چوتھی مثال میں، جو تحریری ثبوت پیش کیے گئے ہیں، وہ اگرچہ پرویز صاحب کے الفاظ میں نہیں ہیں، کسی اور کی عبارات ہیں، لیکن ان کے متعلق طلوع اسلام (یا خود پرویز صاحب) نے کسی اختلافی رائے کو ظاہر نہیں کیا، اس لیے انہیں پرویز صاحب ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیوں کہ خود ان ہی کا یہ اصول ہے کہ کسی چیز کو بلا اختلافی نوٹ کے شائع کرنا، دلیل موافقت قرار پاتا ہے، چنانچہ مولانا مودودیؒ کے ترجمان القرآن میں، جب مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا مضمون شائع ہوتا ہے، تو اس پر ترجمان القرآن کی طرف سے، اختلاف نہ کرنے کی بناء پر، اسے ترجمان القرآن ہی کے موقف کی موافقت قرار دیتے ہوئے، خود طلوع اسلام نے یہ اصول، ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

"یہ مضمون مولانا امین احسن اصلاحی کا تھا، لیکن ترجمان القرآن نے بلا اختلافی نوٹ کے شائع کیا تھا۔"❸

ایک اور مقام پر، اسی اصول سے تمسک کرتے ہوئے، یہ لکھا گیا ہے:

"فروری ۱۹۳۴ء کے معارف (اعظم گڑھ) میں "علامہ حمید الدین فراہی اور علم حدیث" کے متعلق، ان کے شاگرد مولوی امین احسن اصلاحی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس پر سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا تھا،

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۹
❷ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۰
❸ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۶۳

جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ان خیالات سے متفق تھے۔" ●

مزید براں، پرویز صاحب نے اپنی زندگی میں، طلوع اسلام کے "لکھاڑیوں" پر اس مجلہ میں لکھنے کے لیے صرف ایک شرط عائد کی تھی، اور وہ بھی بقول طلوع اسلام:

"صرف اس پابندی کے ماتحت، کہ جو کچھ لکھا جائے، وہ ہماری بصیرت کے مطابق، قرآنی تعلیم کے مطابق ہو، ﴿ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ﴾" ●

چنانچہ ان اقتباسات کا طلوع اسلام میں بلا اختلافی نوٹ کے شائع ہو جانا ہی اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ یہ طلوع اسلام کی قرآنی تعلیم اور پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت کے عین مطابق ہیں، اس لیے ان اقتباسات کو طلوع اسلام یا جناب پرویز صاحب کی طرف منسوب کرنا کوئی بے جا بات نہیں ہے، بالخصوص جب کہ پرویز صاحب، طلوع اسلام سے، خود اپنے تعلق کو ناقابل انقطاع بلکہ لازم وملزوم بھی قرار دیتے رہے ہیں۔

"جس طرح طلوع اسلام اور محترم پرویز صاحب لازم وملزوم ہیں، اسی طرح تحریک پاکستان اور طلوع اسلام کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔" ●

پانچویں مثال: صدر اول کا تحریری ریکارڈ:

"منکر قرآن"، جناب چودھری غلام احمد پرویز صاحب پر ہمیشہ یہ دھن سوار رہی کہ قرن اول کی تاریخ کو "مطابق قرآن" ہونا چاہیے، کیوں کہ تاریخ میں جو حقائق مذکور ہیں وہ "منکر قرآن" صاحب کے نزدیک، قطعی "خلافِ قرآن" ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر، وہ اپنے عالم خواب وخیال کے، جن اوہام وظنون کو "دلائل" کی نقاب اوڑھانا چاہتے تھے، انہیں پہلے ماضی شکیہ کے صیغوں میں (یعنی: ہوگا، رہوں گے، رہوں گی) پیش کیا کرتے تھے۔ یہ ان کے "قرآنی دلائل" کی پہلی منزل ہوتی ہے، اور پھر وہ انہیں، دوسری منزل میں "دلائل" کے روپ میں پیش کرتے ہیں مثلاً اسی زیر بحث مسئلہ میں، وہ خلافتِ راشدہ کے حکومتی نظم ونسق کا ذکر کرتے

● مقام حدیث، صفحہ ۱۵۵ ● طلوع اسلام مئی ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۰

● طلوع اسلام، جون ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵۹

ہوئے فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے لیے نظم و نسق کے لیے کوئی سیکریٹیریٹ ہوگا۔ تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے۔ دستاویزات ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔ مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ، خط و کتابت ہوتی ہوگی۔ دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حساب رکھے جاتے ہوں گے۔ اس سیکریٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔'' ❶

اب اگلی منزل میں، یہی ماضی شکیہ کے خواب و خیال اور گمان و سراب، ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ''ٹھوس قرآنی دلائل'' بن کر، ''مفکرِ قرآن'' کے قلم سے یوں ٹپک پڑتے ہیں:

''امورِ مملکت کی انجام دہی کے لیے، حضرت عمرؓ نے سیکریٹیریٹ قائم کیا، تو ہر شعبہ کے لیے الگ الگ دفاتر اور ہر دفتر میں مختلف امور سے متعلق الگ الگ رجسٹر تیار کروائے، مملکت کا تمام کاروبار تحریری ہوتا تھا، اور اہم واقعات و حوادث اور اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا، دوسری مملکتوں کے ساتھ جس قدر بھی معاہدات کیے جاتے تھے اور مفتوحہ علاقوں کے ذمیوں کو جس قدر بھی ضمانتیں دی جاتی تھیں، ان کے متعلق دستاویزات، امیر المومنین کی اپنی حفاظت میں رہتی تھیں۔

یہ تھا امورِ مملکت کے متعلق طریقِ کار۔ اس مقام پر ایک نہایت اہم سوال سامنے آتا ہے، اسلامی مملکت رسول اللہ کے زمانے میں قائم ہوئی، عہدِ صدیقؓ میں اس میں وسعت ہوئی، حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں اس کی وسعتیں قریب ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر پھیل گئیں، اس تمام اثناء میں، بلکہ خلافتِ عثمانی میں بھی مدینہ اس مملکت کا دارالخلافہ رہا۔ عہدِ فاروقی میں کاروبارِ مملکت کے متعلق دفاتر بھی قائم ہو گئے، ان میں فائلیں بھی کھل گئیں، دستاویزات محفوظ رکھی گئیں، خط و کتابت کا ریکارڈ رکھا گیا، اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب کیے گئے۔

---

❶ قرآنی فیصلے، حصہ دوم، صفحہ ۲۹۸

لیکن کیا یہ چیز انتہائی حیرت کا موجب نہیں کہ اس دور کا ایک پرزۂ کاغذ بھی کہیں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، ہر بلائے ارضی و سماوی سے محفوظ رہا، نہ اس میں کوئی سیلاب آیا، نہ زلزلہ، نہ کوئی ایسی بڑی آگ لگی جس سے شہر تباہ ہو گیا ہو، نہ کسی قوم نے یورش کی کہ اس نے وہ سارا ریکارڈ ضائع کر دیا ہو، اس تمام عرصہ میں یہ بلد طیب مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا، اور اس کا تقدس اور احترام ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں۔ اس کے بعد، کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس تمام ریکارڈ کو آخر ہوا کیا؟ وہ گیا کہاں؟ اسے کون لے گیا؟ کس نے اسے تلف کر دیا؟ اور تلف بھی اس طرح کیا کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔" ❶

یہ اقتباس، پرویز صاحب کی افسانہ نگاری کی ان صلاحیتوں کو واضح کر دیتا ہے جن کی بنا پر، وہ اپنے خیال و گمان میں پائے جانے والے اوہام کو عالم واقعہ کے "ٹھوس حقائق" بنا ڈالتے ہیں۔ وہ خود اس دور میں پیدا ہوئے جس میں دفتری ریکارڈ کو محفوظ رکھنا رواج پذیر تھا (اور اب بھی ہے)، پھر اتفاق یہ کہ وہ خود سول سیکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے، اور وہاں کی وہ پوری فضا ان کے حواس و مشاعر پر چھا گئی جس میں ہر کاغذی کاروائی کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے، اور مختلف شعبہ ہائے امور کی فائلیں کھل جاتی ہیں، اور ہر فائل، ایک میز سے دوسری میز تک منتقل ہونے کے لیے تحریری کاروائی کے لمبے چوڑے سلسلہ میں سے گزرتی ہے، جہاں کوئی شخص کسی درخواست کو وصول کرتا ہے، اور اسے وصولیٔ درخواست کے رجسٹر میں درج کرتا ہے، کوئی دوسرا شخص اس کا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کے مندرجات کو بصورتِ خلاصہ، اپنے دستخطوں کے ساتھ، افسر مجاز کو پیش کرتا ہے، پھر اس پر عمل درآمد کا حکم دیا جاتا ہے، اور کوئی صاحب، درخواست دہندہ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے، چٹھی کا متن تیار (Drafting) کرتا ہے۔ پھر نیچے سے اوپر تک اور بالائی افسروں سے زیریں عملہ تک، تحریری کاروائی کے طویل و عریض سلسلہ میں سے گزرتی ہوئی یہ چٹھی منظوری پا کر، دفترِ روانگی (Dispatch Office) میں درج ہو کر، درخواست گزار کی طرف

❶ شاہکار رسالت، ص: ۲۴۷

راہ پاتی ہے۔ دورِ حاضر کے سیکریٹریٹ کے اس سارے نقشے کو، جب ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اپنے خیالات و تصورات کی دنیا سے نکال کر، صدرِ اول کے عالمِ واقعہ میں منتقل کرتے ہیں، تو وہ منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے جسے اقتباسِ بالا میں ظاہر کیا گیا ہے۔

کسی قابلِ اعتماد تاریخی شہادت کے بغیر، محض اپنے گمان و قیاس کی بنا پر، یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی، عصرِ حاضر کا سا دفتری نظام ہوگا جس میں ہر چھوٹے بڑے فیصلہ کا ریکارڈ رکھا جاتا ہوگا، اور پھر اس بناءِ فاسد پر ایک اور فاسد کا رڈا یوں چڑھایا جاتا ہے کہ ''دشمنوں اور سازشیوں نے یہ سارا ریکارڈ ختم ہی کر دیا''..... سیکریٹریٹ کا ملازم، اگر اسی فضا اور ماحول میں رہ کر، عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو بھی، اس پر قیاس نہ کرے، تو آخر تہذیبِ جدید کا وہ مقلد کرے بھی کیا؟

ہم اپنے دل کے حال کو معیار جان کر اوروں کے دل کا حال یونہی جانتے رہے

ضمناً:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر واقعی پرویز صاحب کی یہ بات درست ہے کہ ''دشمنوں اور سازشیوں نے سارے تحریری ریکارڈ کو تلف کر دیا تھا، تو پھر قرآن کیسے محفوظ رہ گیا؟ کیوں کہ کتابت شدہ مواد کو تو اس طرح تلف کر دیا گیا کہ ''اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا'' اور آج ہمیں ''اس دور کا ایک پرزہ کاغذ بھی کہیں موجود نہیں'' لہٰذا۔ لامحالہ حفاظتِ قرآن کا واحد ذریعہ، حفظ ہی قرار پاتا ہے۔ اب اگر قرآن، بذریعہ حفظ ہی محفوظ رہا (بذریعہ کتابت نہیں) تو حدیث کے بذریعہ حفظ، محفوظ رہنے سے انکار کیوں؟ اور اس بات پر اصرار کیوں کہ احادیث لکھی نہیں گئیں؟ (حالاں کہ وہ لکھی بھی گئی تھیں)۔ جس طرح قرآن، کتابت شدہ ہونے کے باوجود، تلف ہو گیا، اور کتاب اللہ محض حفظ کی بنیاد پر ہی محفوظ رہی، تو اسی طرح ہر سلیم الفطرت شخص کے نزدیک، حفاظتِ حدیث کی علت بھی، کتابت نہیں بلکہ حفظ فی الصدور ہی ہے۔ اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ جن ذرائع سے قرآن محفوظ رہا، بالکل انہی ذرائع سے روایاتِ حدیث بھی محفوظ رہیں۔

رہی دفتری ریکارڈ کی بات، تو امر واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں، اس کا رواج ہی نہ تھا، اس کا ثبوت، اگر کسی اور ماخذ سے پیش کیا جائے تو "مفکر قرآن" کے اندھے مقلد، اسے تسلیم نہیں کریں گے، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ طلوع اسلام ہی کا ایک اقتباس پیش کر دیں۔ یہ عبارت ایک طرف ان کے موقف کی تغلیط پر شاہد ہے، اور دوسری طرف، تضاد کا منہ بولتا ثبوت بھی فراہم کر ڈالتی ہے:

"چونکہ اس زمانہ میں، دفتری نظام اس قسم کا نہیں تھا کہ ہر چھوٹا بڑا فیصلہ کتاب میں درج ہو جاتا، اور سرکاری گزٹ میں اس کا اعلان کر دیا جاتا۔ نہ ہی رسول اللہ صلعم نے اپنے فیصلوں کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے یا مرتب کرا کے پیچھے چھوڑا تھا، اس لیے یہ دیکھنے کے لیے، کہ فلاں مسئلہ اس سے پیشتر زیر بحث آ چکا ہے یا نہیں، لوگوں کی شہادات طلب کی جاتی تھیں، چنانچہ تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی یہی راہ اختیار کی۔" ●

نگارشاتِ پرویز میں تضادات و تناقضات کی ان مثالوں سے یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرے گا، کہ "مفکر قرآن" صاحب، اس قسم کی متضاد باتیں کیوں اور کیسے کہہ جاتے تھے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ان کی ساری ٹیکنیک ہی یہی تھی۔ ان کا مقصد سستی شہرت حاصل کرنا تھا، ہوسِ شہرت، ان کی رگ رگ میں رچی بسی تھی، وہ عامۃ الناس کے لیے واعظانِ داستان گو کے افسانے بھی اپنے خریطے میں رکھتے تھے، یقین نہ آئے تو "طاہرہ کے نام" کتاب میں...... صابرہ کی دکھ بھری داستان، شفقت کی بیچارگی، اور شاکرہ کی شادی، اُس کے لیے پیغامِ موت...... کا مطالعہ کر لیجیے، رہا تعلیم یافتہ طبقہ، تو ان کے لیے، ان کے لٹریچر میں ادبی چٹخارہ بھی پایا جاتا ہے، گویا ہر ایک کے ضیافتِ طبع کا سامان موجود ہے۔

معشوقِ مابہ شیوۂ ہر کس برابر است　　باما شراب خورد، و بازاھد نماز کرد

آپ یقیناً متعجب ہوں گے کہ "مفکر قرآن" نے اپنے وسیع لٹریچر میں، جگہ جگہ ایسی باتیں کی ہیں جو ان کی سابقہ یا بعد کی عبارتوں کے صریحاً خلاف بلکہ متضاد ہیں، لیکن اس پر تعجب یا

● طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۲ء ص: ۴۴

حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ان ہی کے ایک ہم نام مرزا غلام احمد قادیانی کے الفاظ میں، ایک چیز مداری کی پٹاری ہوتی ہے جس میں موافق ومخالف ہر چیز موجود رہتی ہے، اور جس وقت جس چیز کی ضرورت پڑی، اسے نکال کر پیش کر دیا۔ جناب پرویز صاحب کا ذہن اور پھر اس سے برآمد ہونے والا لٹریچر، مداری کی پٹاری اور تضادات وتناقضات کا کباڑ خانہ ہی ہے۔ اُن کا قرآنی مسلک، مرغ بادنما کی طرح، فضاء وماحول میں اٹھنے والے ہر جھونکے کے ساتھ بدل جایا کرتا ہے، اور قرآن سے نچوڑا ہوا ہر فکر، ان کی مصلحتوں اور مفاد پرستیوں کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ یہ صاحب، قرآن کے نام پر، خود قرآن کے لیے کس قدر مہیب خطرہ ہیں، اور سیدھے سادے مسلمانوں کو قرآن کے نام پر کس کس انداز سے دھوکے دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قومِ رسولِ ہاشمی کو، ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ان کا فتنہ کسی صورت بھی قادیانی فتنے سے کم خطرناک نہیں، بلکہ اس سے کچھ زیادہ سنگین اور خطرناک ہے، غلام احمد قادیانی نے تو ادعاءِ نبوت ورسالت کے ساتھ، ایک حقیقی کی حیثیت سے، منصب نبوت پر براجمان ہو کر، احادیثِ رسول پر ہاتھ پھیرا تھا، لیکن ان صاحب نے بڑی احتیاط کے ساتھ، دعویٰ نبوت کی حماقت سے گریزاں ہوتے ہوئے، اور ''قرآن قرآن'' کی رٹ لگاتے ہوئے، منصبِ رسالت کی کرسی پر تسلط پا کر، احادیث کے ساتھ ساتھ، قرآن کریم کو بھی، اپنی اُس بصیرت کا نشانہ بنایا ہے، جو مغربی تہذیب اور اشتراکی نظام سے مستعار لی گئی ہے، تاکہ چودہ صدیوں پہلے، نازل ہونے والا قرآن اور اسلام ''عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ'' ہو سکے۔

خارزارِ تضاداتِ پرویز:

تضاداتِ پرویز کی یہ دس پندرہ مثالیں، اُن بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالوں میں سے چند ایک ہیں جنہیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں وہ تضادات شامل نہیں ہیں جو ترجمۂ آیات یا مفہومِ آیات سے متعلق ہیں۔ ان تضادات کو بھی یہاں نظر انداز کیا گیا ہے جو ان کے تفسیری مواد سے متعلق ہیں، نیز ان میں وہ تضادات بھی، ہماری دانستہ چشم پوشی کا شکار

ہوئے ہیں، جن میں انہوں نے منفی بن کر، یگانوں اور بیگانوں سب کو نشانہ بنایا ہے۔ ان تمام تضادات کو اگر جمع کیا جائے، تو اچھا خاصا موسوعہ (انسائیکلو پیڈیا) تیار ہو جائے۔ لیکن حیرت بالائے حیرت تو یہ ہے کہ طلوع اسلام اپنے ان تضادات کے باوجود بھی، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، یہ اعلان کرتا ہے..... اور اعلان بھی اپنے مخالفین کو مطعون کرتے ہوئے تحدی کے ساتھ بتکرار و اعادہ کرتا ہے:

> ''مفاد پرستوں کے خود ساختہ اسلام کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے انہیں اس طرح چاٹا کہ ان کا ایک حرف بھی زمانہ کے صفحہ پر دکھائی نہیں دیتا، لیکن تغیرات کی ان آندھیوں میں اور انقلاب کے ان جھکڑوں میں ایک طلوع اسلام ہے کہ جس میں آپ کو نہ کہیں تضاد ملے گا، نہ تخالف نظر آئے گا۔''❶

....''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد'' ..... کے الفاظ، ایسے ہی مواقع پر بولے جاتے ہیں۔ اپنے تضادات سے چشم پوشی کرتے ہوئے، دوسروں کی تصانیف سے خوردبینی مطالعہ کے ذریعے، تناقضات کو تلاش کرنا اور عدم دستیابی کی صورت میں، ذہنی چابک دستی سے، انہیں ''پیدا کر ڈالنا'' اور پھر انہیں مسلسل چھاپتے اور اچھالتے چلے جانا، فقط اس لیے ہے کہ قارئین، دوسروں کے تضادات کی آڑ میں، خود اس کے اپنے تضادات کو نظر انداز کر دیں، اس معاملہ میں، طلوع اسلام کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے۔ وہ مولانا مودودیؒ کی عیب جوئی اور ان پر حرف گیری میں صرف اس لیے شدت اختیار کرتا رہا ہے کہ خود اس کے (یا پرویز صاحب کے) اپنے عیوب و نقائص، اس کی آڑ میں چھپے رہیں۔ چالاک اور عیار و مکار لوگ، اپنے عیبوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے مسلسل دوسروں پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کی یلغار کرتے رہتے ہیں، اس نفسیاتی حقیقت کو خود طلوع اسلام نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے ہم، اُسی کے الفاظ کا آئینہ، خود اُسی کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں، تا کہ:

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۹

"وہ اپنی اس روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے تا کہ اپنی مہمل انکاری ڈھکی رہے، اور اسے چھپانے کے لیے اس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔"❶

• طلوع اسلام اور پرویز صاحب، اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت اور خوش نصیب تھے کہ انہیں، ایسے اندھے مقلدین کا ٹولہ میسر آ گیا جنہیں یا تو یہ صریح تضادات نظر ہی نہیں آتے، یا پھر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ "مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے انہیں چاٹ کر" فی الحقیقت کالعدم کر دیا ہے، اور اب تضادات، انہیں دکھائی ہی نہیں دیتے، اور وہ یہ ڈھنڈورہ پیٹنے میں، خود کو "حق بجانب" سمجھتے ہیں:

"پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں، اور نہ ہی ان میں کہیں تضاد واقع ہوتا ہے، یہ اس لیے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں لکھتے ہیں، اور قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس کے حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے۔"❷

لیکن بیچارے اندھے مقلدین کے متعلق تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ پرویز صاحب اور طلوع اسلام کے برسوں پر پھیلے ہوئے تضادات پر ان کی نگاہ حاوی نہ ہو سکی ہو، اس لیے وہ تضاداتِ پرویز کی نفی کرنے کے اعلان میں معذور ہوں، لیکن خود پرویز صاحب پر تو، بہر حال، یہ بات عیاں تھی کہ وہ کس قدر متناقض الکلام اور تضاد گو واقع ہوئے تھے، اس لیے انہیں تو دنیا بھر کو یہ تحدی پیش کرتے ہوئے شرمانا چاہیے تھا:

"اس کی اشاعتوں کے انبار میں سے آپ کوئی سے دو پرچے اٹھا لیجیے، جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے، آپ کو ان میں کوئی تضاد کوئی تخالف نہیں ملے گا۔"❸

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۳

❷ طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۶

❸ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۲

لیکن اس شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، پرویز صاحب، نہ صرف یہ کہ اپنے تضادات کے عدمِ وجود کا اعلان کیا کرتے تھے، بلکہ وہ اپنے ساتھ قرآنِ مجید کو بھی گمراہی کے کھڈ میں لے گرا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ تضاد و تناقض کے عدمِ وجود کی وجہ ان کا قرآنِ کریم کی روشنی میں لکھنا ہے، اور چونکہ قرآن خود تضادات سے بالاتر ہے، اس لیے ان کی تحریریں بھی تضادات سے پاک ہیں:

"میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کہتا ہوں کیوں کہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں..... قرآن کو سند اور حجت ماننے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور..... قرآن کا متبع نہ مداہنت کر سکتا ہے نہ کسی سے مفاہمت۔" ❶

ہر وہ شخص، جس کی نگاہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۸۵ء، پرویز صاحب کی وفات تک کی طلوعِ اسلام کی فائل پر حاوی ہے، یہ جانتا ہے کہ طلوعِ اسلام اور کتبِ پرویز، تضادات و تناقضات کا وسیع و عریض صحرا ہے۔ آج کچھ، کل کچھ، یہاں کچھ، وہاں کچھ، کبھی کچھ، کبھی کچھ، حجابِ نسواں، گیت سنگیت، مصوری و مجسمہ سازی، ملکیتِ مال و اراضی، ضبطِ تولید، خلیفۃ اللہ اور خلافتِ الٰہیہ، انسانی فطرت، وقتِ موت کا تعین و تقرر، دین و مذہب کا معنی و مفہوم، بطور ماخذِ قانون، حجیتِ سنتِ رسولؐ، الغرض ان تمام امور میں اور ان جیسے دیگر امور میں سے وہ کون سا امر ہے جس میں واضح تضاد و تناقض کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا، اور لطف یہ کہ تمام متناقض اور متضاد رویے "قرآن ہی کی روشنی" میں اپنائے گئے ہیں، اس سے بدیہی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یا تو قرآن (معاذ اللہ) خود متناقض اور متضاد تعلیم پیش کرتا ہے، اور وہ بھی اس حد تک کہ جو چیز، قبل از قیامِ پاکستان، عین اسلام تھی، بعد میں وہی چیز کفر و شرک قرار پا گئی، یا پھر قرآنِ کریم کے واحد سند اور حجت ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، دل سے اس کی سندیت اور حجیت کے قائل نہیں ہیں، کیوں کہ بقول پرویز..... "قرآن کو حجت اور سند ماننے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور"..... امر

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۵۲

واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب، معتقد تو ان افکار و نظریات کے ہیں جو تہذیب مغرب نے پیش کیے ہیں، اُن کا یقینِ محکم تو اُن اصول و اقدار پر ہے جو فرنگی معاشرت اور یورپی سماج کی اساس ہیں، وہ ایمان تو اس نظامِ معیشت پر رکھتے ہیں جسے اشتراکیت کہتے ہیں، لیکن وہ قرآن کی ورق گردانی صرف اس لیے کرتے ہیں کہ اپنے محبوب و مستعار افکار و نظریات اور اصول و اقدار کی حمایت میں قرآن سے تائیدی دلائل فراہم کرلیں، اور جب کوئی فرد اپنے دل و دماغ میں پہلے سے کچھ معتقدات کو راسخ کر لے اور ان کی تائید کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرے، تو ایسی بلی کو چھچھڑوں کے خواب آہی جایا کرتے ہیں، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> "جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے، تو اُسے اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔" ❶

یوں پرویز صاحب کو اپنے ہر مزعومہ کی "سند" قرآن سے ملتی رہی، پھر جنہوں نے اُنکی "قرآنی سند" سے انکار کیا، انہیں قرآن ہی کا منکر اور مخالف قرار دیا:

> "میں بلا تشبیہ اور بلا تمثیل عرض کرنیکی جرأت کروں گا کہ یہ لوگ میری مخالفت نہیں کرتے، کتاب اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔" ❷

حالاں کہ پرویز صاحب کی مخالفت کرنے والے لوگ، واقعتاً قرآن کے مخالف نہیں، بلکہ صرف اس مفہوم کے مخالف ہیں جسے پرویز صاحب نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہے، وہ اپنی تعبیراتِ قرآنیہ کو "قرآنی حقائق" اور "قرآنی دعاوی" قرار دے کر، پیش کیا کرتے تھے، اور نہ ماننے والوں پر، بزعم خویش "اتمامِ حجت" کیا کرتے تھے:

> "ہمارا مقصد صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے، اس سے اگر کسی کے مروجہ عقیدہ یا کسی کے دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی کیونکہ اس باب میں مدعی قرآن ہے ہم نہیں۔ ہمارا فریضہ قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس۔" ❸

---

❶ طلوع اسلام ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷، صفحہ ۱۳ ❷ طلوع اسلام دسمبر ۱۹۴۸ء، صفحہ ۲ ❸ طلوع اسلام جنوری ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۱

امرِ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے گلے، مڑھے جانے والے تصور کی مخالفت، کسی صورت بھی قرآن کی مخالفت قرار نہیں پا سکتی، خود پرویز صاحب ہی کا یہ فرمان ہے کہ ان کی ''بصیرت'' کی روشنی میں قرآن سے ۔ خود تصور میں سہو و نسیان کا امکان موجود ہے، کیوں کہ یہ بہرحال انسانی کوشش ہے:

''قرآن تو وحیٔ الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحیٔ الٰہی قرار نہیں دیتا، اس لیے اس میں سہو و خطا دونوں کا امکان ہے۔ بنابریں، میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ حرفِ آخر ہے، اور وحیٔ الٰہی کی طرح منزہ عن الخطاء۔'' ❶

یہ ہاتھی کے صرف دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے نہیں۔ قولاً تو وہ یہی کہتے ہیں کہ میری قرآنی تعبیر، انسانی تعبیر ہے جس میں نسیان و سہو کے دونوں پہلو موجود ہیں اور یہ حرفِ آخر نہیں، لیکن عملاً وہ اپنی تعبیر کو قرآنی حقیقت اور خدائی حکم کا درجہ دیتے ہیں، اور اسے نہ ماننے والوں پر، وہ ''منکرِ قرآن'' ہونے کا فتویٰ رسید کرتے ہیں، چنانچہ جب ان کے ایسے ہی ''قرآنی حقائق'' اور ''خدائی احکام'' کا انکار، مولانا مودودی مرحوم نے کیا، تو پرویز صاحب نے انہیں یکے از منکرین قرآن قرار دیا:

''طلوعِ اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی میراث سے محروم نہیں ہو سکتا، اس کے جواب میں منکرینِ قرآن کی طرف سے جو جواب شائع ہوا، وہ ملاحظہ فرمایئے۔'' ❷

اب ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ، قرآن میں صراحتِ نص کے ساتھ مذکور نہیں ہے، یہ دراصل پرویز صاحب کی استنباطی موشگافیاں ہیں جنہیں انہوں نے ''قرآنی دلائل'' کا نام دے کر، بطورِ ثبوت پیش کیا ہے، ان موشگافیوں کی مخالفت میں، جن ''منکرینِ قرآن'' کی طرف سے جواب شائع کرنے کا ذکر ہے، اُن سے مراد مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کیوں کہ

---

❶ نظامِ ربوبیت، صفحہ ۲۳ ❷ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۵۸

اقتباس بالا میں، جس جواب کی اشاعت کا ذکر ہے، وہ مولانا مودودیؒ ہی کا جواب (بصورتِ اقتباس) ہے۔

الغرض، کہاں تک لکھتے جایئے۔ اگر ہم اس وسیع و عریض صحرائے تضاداتِ میں جادہ پیمائی کریں تو تھک جائیں گے مگر یہ صحرا ختم نہ ہوگا۔ اگر ہم چاہیں تو "مفکر قرآن" کے اس قسم کے تضادات کا ضخیم موسوعہ پیش کر سکتے ہیں، لیکن سرِ دست، ہم اس کی ضرورت، اس لیے محسوس نہیں کرتے کہ سلیم الفطرت لوگ، تو اتنے اقتباسات ہی سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ صاحب کس قدر، متناقض الکلام اور تضاد گو واقع ہوئے ہیں، اور اس پر مستزاد، ان کی یہ خوش بختی کہ غلام احمد قادیانی کی طرح، غلام احمد پرویز کو بھی، عقیدت مندوں کا ایک ایسا حلقہ میسر آ گیا ہے، جس کے سامنے، یہ جو کچھ بھی کہتے جائیں، ہر طرف سے، سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں، وجہ فریبِ نفس بنتی چلی جاتی ہیں جس سے "مفکر قرآن" اپنے تضادات اور تناقضات میں مزید شہ پا لیتے ہیں، اور پھر وہ جادۂ کذب و زُور پر پیش قدمی میں، مزید تیز رفتار ہو جاتے ہیں۔

"مفکر قرآن" کے ان تمام تضادات و تناقضات کو اگر یکجا کر کے دیکھا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ نہاں خانۂ دماغ میں، وہ کن کن پُر پیچ راہوں سے گزرے ہیں۔ یہی "مفکر قرآن" کی خام فکری کی دلیل ہے، لیکن اس خام فکری کے ساتھ، جب اُن کا تبحرِ علم اور پندارِ معلومات، اور پھر اس پر مستزاد، علما کے خلاف حسد و کینہ اور بغض و عناد بھی جمع ہو جاتا ہے تو مزاج ایسی ہیجانی کیفیت اختیار کر لیتا ہے جس کا منطقی نتیجہ اس قسم کے تضادات ہوا کرتے ہیں۔

لیکن حیرت تو اُن مقلدینِ پرویز پر ہے جو طلوعِ اسلام کے تضادات و تناقضات کے، اس وسیع خارزار سے نظریں چراتے ہوئے، الٹا خلقِ خدا کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ

"اگر مجھ سے پوچھا جائے، کہ طلوعِ اسلام سے تمہیں کیا ملا، تو میں کہوں گا کہ مجھے طلوعِ اسلام سے Clear thinking ملی۔" ❶

---

❶ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۶

باب ۳

''منکرِ قرآن'' کے چند صریح جھوٹ

ذاتی مخالفت وعداوت، خواہ کسی سے بھی ہو، اگر حدود آشنا نہ رہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ انسان کے دین و ایمان اور اخلاق و کردار کے لیے فتنہ بن جاتی ہے، بلکہ ذنوب و معاصی کی ہر حد کو پھاندنے پر اکسائے رکھتی ہے۔ اور آدمی، جھوٹ، بددیانتی، بہتان تراشی، تہمت طرازی، تعصب و جنبہ داری اور حسد و کینہ جیسے اخلاقی رذائل میں اس قدر پختہ اور شدید ہو جاتا ہے کہ عدل و انصاف کا دامن تھامے، جادۂ حق پر قائم رہنا، اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ ذاتی رقابت و دشمنی، ضروری نہیں کہ حبِ مال اور حبِ جاہ ہی کی بنیاد پر ہو، مادی فوائد اور حسی لذائذ سے بالاتر، کسی فکری اختلاف اور علمی رقابت کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اگر یہ اختلاف و رقابت، لِلّٰہ فی اللہ، نہ ہو تو رذائل کی وادی میں مسلسل بھٹکتے رہنا ہی اس کا مقدر بن جاتا ہے، اور نفس کو ضلالت و غوایت کا راستہ، اس قدر مرغوب ہو جاتا ہے کہ کسی اور راستے پر چل کر، اسے اطمینان قلب ہی نہیں ملتا۔ ایسے شخص کی مثال پھر اس کیڑے کی سی ہو جاتی ہے، جو غلاظت و عفونت ہی میں رہتا ہے، گندگی ہی اس کا اوڑھنا اور بچھونا بن جاتی ہے، سنڈاس کی فضا ہی اس کی طبیعی فضا قرار پاتی ہے، وہ کیچڑ میں رہتا ہے اور دوسروں پر بھی کیچڑ اچھالتا ہے۔ وہ خود کذب بیانی کرتا ہے اور دوسروں کو جھوٹ کا نشانہ بناتا ہے، الزام تراشی اور بہتان تراشی، اس کا اپنا شیوہ ہوتا ہے لیکن وہ اسے دوسروں کی روش قرار دیتا ہے، دھوکہ دہی اور فریب کاری اس کا اپنا وطیرہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کا الزام اپنے مخالفوں پر عائد کرتا ہے، خیانت کار اور بددیانت، اگرچہ، وہ خود ہوتا ہے مگر اس فعلِ بد کی نسبت وہ اپنے رقیبوں کی طرف کرتا ہے، اپنے حریفوں کے اقوال میں سے وہ منطق کے زور لگا لگا کر بدترین معانی نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ خواہ صاحبِ قول کتنی ہی وضاحت کے ساتھ، اپنا مدعا بیان کرے، مگر وہ یہی اصرار کیے چلا جاتا ہے کہ ''نہیں، تیرا اصل مدعا

وہ نہیں، جو تو خود بیان کرتا ہے، بلکہ وہ ہے جو میں تیری طرف منسوب کر رہا ہوں" گویا وہ کوئی وکیل استغاثہ ہے جس نے ملزم کو کسی نہ کسی طرح پھانسنے ہی کے لیے، اپنے موکل سے فیس لے رکھی ہے، اور ستم یہ کہ یہاں موکل کوئی اور نہیں، بلکہ خود اس کا اپنا نفسِ بد ہے، جس کی فیس، لذتِ نفس کے سوا کچھ نہیں، اور اس کی ساری دلچسپی کا محور صرف یہ ہے کہ اپنے مخالفین کو جس طرح بھی ہو، جہنم کا مستحق ثابت کر دے۔ خوفِ خدا سے عاری حکام جب کسی پر بگڑتے ہیں تو اسے قانون اور نظم وضبط کا دشمن قرار دے کر پکڑتے ہیں، غرض مند بلکہ خود غرض سیاسی لیڈر جب کسی کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں تو اسے ملک اور قوم کا دشمن قرار دے کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ایک خاص مزاج کے "قرآنی دانش ور" جب کسی پر غضب ناک ہوتے ہیں، تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ خدا اور رسول کو بھی فریقِ مقدمہ بنائیں اور یہ "ثابت" کریں کہ جس شخص سے ہم ناراض ہیں، وہ کمبخت تو دشمنِ قرآن ہے، جو بڑی گمراہی کا فتنہ اٹھا رہا ہے، اس لیے ہم یہ سارے پاپڑ صرف اس لیے بیل رہے ہیں کہ خدا کی کتاب اُس کے شر سے محفوظ رہے۔ یوں وہ اپنے نفس کی ساری برائیاں اور جملہ عیوب، اپنے مخالفین کے سر تھوپ دیتا ہے، تاکہ کسی کی نگاہ خود اُس کے اپنے عیوب کی طرف نہ اُٹھ سکے، صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے نقائص کا انکار کرتے ہوئے، انہیں دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے، بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر دوسروں کی خوبیوں اور فضائل کو اپنی ذات میں ظاہر کرتا ہے، اور اُن کارناموں کو بھی وہ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے، جو سرے سے اس نے انجام ہی نہیں دیئے ہوتے۔

ٹھیک یہی کیفیت ہے جس میں ہم نے "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کو مدت العمر مبتلا پایا ہے، وہ خود جھوٹ بولا کرتے تھے لیکن الزام اپنے مخالفین پر لگایا کرتے تھے، وہ خود قرآن کے نام پر باطل پرست تھے، لیکن باطل پرستی کے اس رویّے کو اپنے معاندین کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، وہ خود بہتان تراش تھے مگر اس کا مرتکب دوسروں کو قرار دیا کرتے تھے، وہ خود تضاد گو تھے مگر اوروں کو ایسا کہا کرتے تھے، گزشتہ باب میں، ان کی تضاد گوئی اور تناقض کلامی کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، اس باب میں، ان کے چند اکاذیب واباطیل کا

تذکرہ ہے، ملاحظہ فرمایئے یہ اشتہار۔

(۱): کذبِ پرویز کی پہلی مثال:

""مفکرِ قرآن" جناب پرویز صاحب کی ایک کتاب ہے، "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت"۔ اس کے پانچویں ایڈیشن میں، جو جولائی ۱۹۹۸ء میں چھپا "مصنف کے بارے میں" تعارف پیش کرتے ہوئے، یہ کہا گیا ہے کہ ..... "آپ برصغیر کے پہلے قرآنی مفکر تھے، جن کے دلائل کے نتیجے میں قادیانیوں کو سرکاری سطح پر کافر قرار دیا گیا" ..... علاوہ ازیں طلوعِ اسلام میں، اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا:

"۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ (سابق ریاست) بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا، جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک مسلمان، مرزائیت (احمدیت) کا مسلک اختیار کر لینے سے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یا نہیں۔ نو برس تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا، اس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی، اکابر علماء نے اس میں حصہ لیا، لیکن سمجھنے کی بجائے، مسئلہ الجھتا چلا گیا۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر محمد اکبر (مرحوم) نے فیصلہ لکھا، اس میں انہوں نے کہا کہ اتنے طویل عرصہ تک اس مسئلہ پر بحثیں ہوتی رہیں، لیکن یہ نکتہ صاف نہ ہوا کہ مقامِ نبوت کیا ہے، اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی اسلام میں اہمیت کیا۔ (انہوں نے کہا کہ) اتفاق سے ایک دن، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ماہنامہ معارف میں چوہدری غلام احمد پرویز نامی ایک شخص کا ایک مضمون، میری نظر سے گزرا، جس نے اس سارے مسئلہ کو سمجھا کر رکھ دیا، چنانچہ اس کی روشنی میں فیصلہ یہ ہے کہ "احمدیت" اختیار کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ چھپا ہوا موجود ہے، اور ہر جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں بھی اس کے اقتباسات دیے ہیں۔ یہاں (ضمناً) اس امر کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے کہ ۱۹۷۴ء میں جب "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو ملک میں ۱۹۳۵ء کے مقدمہ کا

بھی بڑا چرچا ہوا، اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے بڑے بڑے مولوی صاحبان نے اس کا چرچا تو کیا، لیکن انتہائی کوشش کی کہ اس سلسلہ میں کسی نوع سے بھی پرویز صاحب کا نام نہ آنے پائے، اس سے آپ ان حضرات کی تنگ نظری، حسد اور بغض کا اندازہ لگا لیجیے۔" ●

یہ پورا اقتباس جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس میں سب سے پہلا اور بڑا جھوٹ یہ بولا گیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کا فیصلۂ بہاولپور، پرویز صاحب ہی کی ایک عبارت پر اساس پذیر ہے، حالاں کہ یہ فیصلہ ن دلائل و براہین کی بنیاد پر ہوا تھا جو برصغیر کے جید اور ممتاز علما کرام (مولانا غلام محمد، شیخ بامعہ عباسیہ بہاولپور، مولانا محمد شفیع، مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، مولانا سید انور شاہ کشمیری، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وغیرہم) نے پیش کیے تھے، (جیسا کہ اگلی تفصیلی بحث سے واضح ہے۔)

دوسرا جھوٹ، وہ بہتان ہے جو جج (مرحوم) پر یہ کہہ کر باندھا گیا کہ انہوں "نے فیصلہ لکھا، ن میں انہوں نے کہا کہ اتنے طویل عرصہ تک اس مسئلہ پر بحثیں ہوتی رہیں، لیکن یہ نکتہ صاف نہ . سکا کہ مقام نبوت کیا ہے، اور عقیدۂ ختم نبوت کی اسلام میں اہمیت کیا" حالاں کہ فیصلہ میں جج . حب کے یہ الفاظ کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔

تیسرا جھوٹ بھی دراصل ایک تہمت تراشی ہے جس میں، علما کرام پر تنگ نظری، حسد اور ۔ کا فتویٰ عائد کیا گیا ہے، یہ کہہ کر کہ "انہوں نے (۱۹۷۴ء میں "احمدیوں" کے سرکاری طح ، فر قرار پا جانے کے بعد) ۱۹۳۵ء کے اس فیصلہ کا جب چرچا کیا، تو انتہائی کوشش کی کہ اس . مہ میں کسی نوع سے پرویز صاحب کا ذکر نہ آئے"۔ حالاں کہ اس چرچا میں، پرویز صاحب ۔ ذکر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ فیصلہ ان کی کسی تحریر یا عبارت پر مبنی تھا ہی نہیں۔

باعثِ کذب پرویز:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ، بولنے، لکھنے اور مسلسل شائع کرتے رہنے کی آخر

● طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۳

بنیاد کیا ہے؟ تحقیق کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ اس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ایک مقام پر ضمناً جج صاحب نے پرویز صاحب کے ایک اقتباس کی تعریف و تحسین کی ہے، اور بس اسی کو بنیاد بنا کر، جھوٹ کا یہ فلک بوس قصر تعمیر کیا گیا ہے۔

یہودیوں کی ایک خصلتِ بد، قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی اُن کاموں میں بھی تعریف و تحسین کی جائے، جو سرے سے انہوں نے کیے ہی نہیں ہیں (یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا) ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب بھی شہرت کی ہوس میں مبتلا ہو کر، ناکردہ کارناموں کو اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں، اور اس فلک بوس قصرِ کذب کی بنیادی اینٹ، اپنے اس قول کو قرار دیتے ہیں:

> ''فاضل جج نے لکھا کہ اس مسئلہ کا سارا دارومدار، اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے، اور نبی کسے کہتے ہیں۔'' ❶

اس وقت ''فیصلہ مقدمۂ بہاولپور'' کا بالکل وہی نسخہ اور وہی ایڈیشن (جون ۱۹۷۳ء) میرے سامنے پڑا ہے، جس کا حوالہ، پرویز صاحب نے ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' میں دیا ہے، اس کے کسی مقام پر بھی فاضل جج کا یہ قول مذکور نہیں ہے کہ ''اس مسئلہ کا سارا دارومدار، اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں۔''

بات صرف اتنی ہے کہ مقدمہ کی مدعیہ، کوئی عالمۂ دین نہ تھی، اُس کی طرف سے نبی کی جو تعریف بیان کی گئی، اس میں:

> ''صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا رہا ہے، اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لیے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے بھی بحوالہ تہراس صفحہ ۸۹ بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لیے بھیجتا ہے بخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے، کتاب لائے یا نہ

❶ ختم نبوت اور تحریک احمدیت، صفحہ ۵

کے عقائد کے مطابق ہے، اور آیا وہ فریقین کے مسلمات میں سے بھی ہیں کہ نہ، اور کہ ان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ درست ہیں یا نہ، اور کہ فریقین کو ان کی رائے کا پابند قرار دیا جا سکتا ہے کہ نہ، بہت وقت، وسیع مطالعہ اور کافی محنت کی ضرورت ہے، اور پھر اس سے نتیجہ کے بھی پورے طور پر واضح اور عام فہم ہونے کی توقع نہیں۔ اس لیے ایک طرف قرآن مجید اور احادیث پر، اور دوسری طرف مرزا صاحب اور ان کے خلفاء کی کتابوں پر حصر رکھا ❶ جا کر تمام حوالہ جات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔"❷

چند صفحات آگے چل کر، پھر اس امر کا اعادہ کیا گیا ہے کہ فیصلہ میں قرآن وحدیث کے سوا، کسی چیز کو حجت نہیں سمجھا گیا:

"وحی کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کی جو تفریق مدعا علیہ کی طرف سے کی گئی ہے، اس کی تائید میں، اُس نے سوائے اقوال بزرگاں کے اور کوئی سند پیش نہیں کی۔ اور ان اقوال کی گو مدعیہ کی طرف سے توجیہ اور تشریح کی گئی ہے، اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ بزرگان کی ان اقوال سے کیا مراد ہے، اور ان کے دیگر صریح اقوال پیش کیے گئے ہیں کہ جن میں وہ، رسول اللہ صلعم کو خاتم النبیین یعنی آخری نبی تسلیم کرتے ہیں، اور آپؐ کے بعد، کسی اور نبی کا آنا ممکن نہیں سمجھتے، لیکن ان پر اس لیے بحث کی ضرورت نہیں کہ وہ قرآن مجید اور احادیث کے مقابلہ میں کوئی حجت نہیں ہو سکتے، اور مدعا علیہ کی طرف سے جو اعتراض مدعیہ پر عائد کیا گیا تھا کہ وجوہات تکفیر کے ضروریات دین ہونے کے متعلق قرآن یا حدیث سے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، وہ بدرجہ اولیٰ خود مدعا علیہ پر وارد ہوتا ہے کہ اس نے شرعی اور غیر شرعی وحی کی جو تقسیم کی ہے، اس کے متعلق کوئی ثبوت، قرآن یا احادیث سے پیش نہیں کیا۔"❸

---

❶ "رکھا جا کر" پرانی اردو میں مستعمل تھا، جدید اردو میں "رکھ کر" کے الفاظ میں، اس کا مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ آئندہ بھی اگر ایسی عبارت آئے تو اسی طرح پر اس کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔

❷ فیصلہ مقدمہ بہاولپور، صفحہ ۱۱۲

❸ فیصلہ مقدمہ بہاولپور، صفحہ ۱۲۱

ان تمام اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ مقدمۂ بہاولپور کا فیصلہ، صرف قرآن کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرآن واحادیث یا کتاب وسنت کی بنیاد پر طے ہوا تھا۔

پرویز صاحب کا تعلّی آمیز دعویٰ اور فاضل جج پر بہتان:

﴿ يُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ﴾ کے مرض میں مبتلا، اور جنون کی حد تک ہوسِ شہرت کے مارے ہوئے، ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب یہ تعلّی آمیز دعویٰ کرتے ہیں:

"مذکورہ بالا فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا کہ ان کی عدالت میں (غیر منقسم) ہندوستان کے بڑے بڑے جید علما حضرات پیش ہوئے، جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا، لیکن وہ حقیقت نبوت کے متعلق، ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔" ●

یہ دعویٰ، دلیل سے عاری اور کذبِ خالص ہے، پرویز صاحب نے محض اپنے اقتباس کی تحریف سے یہ نتیجہ کشید کیا ہے، ورنہ خود فاضل جج نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ علما میں سے، وہ، کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ فیصلہ مقدمۂ بہاولپور (مطبوعہ جون ۱۹۷۳ء) کے ۱۸۴ صفحات میں، کسی صفحہ کی کسی سطر میں بھی، ان کا یہ بیان موجود نہیں ہے۔

فیصلہ کن نکتہ...... ختم نبوت یا حقیقت نبوت؟:

امر واقعہ یہ ہے کہ اس مقدمہ میں اصل فیصلہ کن نکتہ، لفظ "خاتم النبیین" کا مفہوم تھا، جس کا مفہوم ومعنیٰ قادیانیت کے علم برداروں کے ہاں "نبیوں کی مہر" اور امتِ رسولِ ہاشمی کے علما کے نزدیک "آخری نبی" ہے۔ اول الذکر مفہوم کا تقاضا، "اجراءِ نبوت" جب کہ ثانی الذکر مفہوم کا نتیجہ "ختم نبوت" قرار پاتا ہے۔ رہا پرویز صاحب کا اقتباس، جو "فیصلہ مقدمۂ بہاولپور" کے صفحہ ۱۰۷ تا صفحہ ۱۰۹ تک پھیلا ہوا ہے، تو اس میں لفظ "خاتم النبیین" کے مفہوم کی وضاحت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اب فریقینِ مقدمہ کے ہاں "خاتم النبیین" کا لفظ تو بلاشبہ متفق علیہ تھا، لیکن

● ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت، صفحہ ۱

خلافتِ الٰہیہ، انسانی فطرت، وقتِ موت کا تقرر وتعین، دین ومذہب کا مترادف المفہوم یا مختلف المفہوم ہونا، نیز سنتِ رسولؐ یا اسوۂ نبیؐ کا ماخذِ قانونِ اسلام ہونا، الغرض ان تمام امور میں، اور ان جیسے دیگر امور میں، وہ کون سا امر ہے جس میں واضح تضاد وتناقض کا مفہوم اختیار کرنے کی بجائے، ایک ہی ''حتمی، یقینی اور دوٹوک'' مفہوم اختیار کیا گیا ہو؟ اور لطف یہ کہ ہر آن یہ بدلتے ہوئے معانی ومفاہیم ''قرآن ہی کی روشنی'' میں اپنائے گئے ہیں۔

مزید برآں، نا معلوم کیسے دھوکہ دینے کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' صاحب قرآن کی بابت، یہ اعلان فرماتے ہیں کہ...... ''یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مسئلہ کے متعلق، اس میں فریقین کو اپنے اپنے مطلب کے مطابق، اختلافی آیات مل جائیں'' ...... آیات تو یقیناً چودہ سو سال سے وہی ہیں، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ تنہا قرآن ہی کو سند وحجت ماننے والے، (سمن آباد، لاہور کے) بلاغ القرآن والوں، اور (گلبرگ، لاہور کے) طلوعِ اسلام والوں میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں، اور وہ بھی اس حد تک، کہ طلوعِ اسلام سے وابستہ حضرات، بلاغ القرآن کیمپ سے وابستہ افراد کی نہ صرف تضلیل کرتے ہیں بلکہ انہیں دشمنِ قرآن اور کتاب اللہ کو بدنام کرنے والے بھی قرار دیتے ہیں، کیا ان دونوں ٹولوں کو ''اپنے اپنے مطلب کے مطابق اختلافی آیات نہیں ملی ہیں''؟ کیا واقعی یہ دونوں طائفے قرآن کی بنیاد پر ''حتمی، یقینی اور دوٹوک'' موقف پر متفق الرائے ہوگئے ہیں؟ کیا فی الحقیقت، ایک گروہ کے ''قرآنی دلائل'' کے مقابلہ میں دوسرے گروہ کے ''قرآنی دلائل'' کے سامنے آجانے سے ''بات بالکل نکھر کر سامنے آگئی ہے''؟ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو قرآنی آیات میں کھینچ تان کے ذریعہ، اپنی اپنی مصلحت کی سند مل رہی ہے جیسا کہ خود ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا فرمان ہے کہ:

> ''جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اُتر آئے، تو اُسے اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔'' ❶

اور دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ: ...... ''یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مسئلہ کے متعلق، اس

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۳

(قرآن) میں فریقین کو اپنے اپنے مطلب کے مطابق اختلافی آیات مل جائیں'' .....

اور پھر ساتھ ہی یہ دعویٰ کہ ...... ''میں جو کچھ پیش کرتا ہوں، اس کی اساس قرآنی دلائل پر ہوتی ہے اور فریق مقابل سے بھی قرآنی دلائل کا مطالبہ کرتا ہوں، نتیجہ یہ کہ بات بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے'' .. حالانکہ جو بات ''مفکر قرآن'' صاحب کے قرآنی دلائل سے نکھر کر سامنے آتی ہے، وہ ان کے تضادات و تناقضات کا وسیع و عریض خارزار ہے، اور مسئلہ ختم نبوت کے ضمن میں، ''مفکر قرآن'' صاحب کے اقتباس کی تعریف و تحسین کے باوجود بھی، فاضل جج نے اپنا فیصلہ، تنہا ''قرآنی دلائل'' کی بنیاد پر کرنے کی بجائے، ''قرآن اور احادیث'' کی روشنی میں کیا ہے، جس پر فاضل جج ''بات کو نکھارنے'' کی بجائے، روایات احادیث میں اُلجھا کر ''محمل لیلیٰ کو غبار رہ لیلیٰ میں گم کردینا چاہتے تھے''۔

علماء کرام (بالخصوص وہ جو اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئے) کے متعلق مولہ بالا اقتباس کی بین السطور میں یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ فاضل جج کے نزدیک حقیقت نبوت سے نا آشنا تھے، اور یہ حقیقت، صرف پرویز صاحب کے اقتباس ہی سے بے نقاب ہوئی ہے، حالانکہ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ...... ''علماء نبی اور نبوت کی حقیقت سے ناواقف ہیں''۔ .....

جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ:

''موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان، نبی کی حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں۔'' ❶

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب کی ذہنی خیانت اور فہمی بددیانتی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ''بہت سے مسلمان'' سے مراد ''علماء کرام'' لیتے ہیں، اور پھر ان کی وجۂ ناواقفیت، اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ ''وہ روایات حدیث میں اُلجھے ہوتے ہیں''۔ اور پرویز صاحب، اپنی خوبی یہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں فقہ اور روایات پر مبنی بحثوں میں اُلجھتا ہی نہیں''۔

اقتباس از مقالہ پرویز:

''مفکر قرآن'' صاحب نے اپنے جس اقتباس کی تعریف و تحسین سے یہ باطل نتیجہ کشید کیا

❶ فیصلہ مقدمہ بہاولپور صفحہ ۱۰۶

تعظیم کردہ اہلِ ایمان کے لیے بامنزلہ ماں کے ہیں جن کے ساتھ بعد وفاتِ رسول بھی نکاح جائز نہیں ہے، اُن کے قضایا کو اس طرح تسلیم کرنا کہ ان کے بارے میں، دلوں میں کوئی گھٹن اور تنگی تک نہ پائی جائے ورنہ یہ چیز دائرۂ ایمان سے باعثِ خروج ہوگی۔ نبیؐ، اپنی نبوت کے اظہار سے پہلے، سیرت و کردار کے اعتبار سے صالح ترین انسان ہوتا ہے، اور کردار کی یہی صالحیت اس کی نبوت کی دلیل بن جاتی ہے، اظہارِ نبوت کے بعد بھی، وہ، اللہ تعالیٰ کی نگاہِ نگرانی کے کڑے پہرے میں رہتا ہے، اور بال برابر بھی اس کا قدم غیر شعوری طور پر راہِ راست سے ڈگمگا جائے، تو وحی اُسے متنبہ کر کے پھر سے اس کے قدم کو جادۂ مستقیم پر جما دیتی ہے۔

"مفکرِ قرآن" نے اس اقتباس کو، اپنی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں شاید، صرف اس لیے پیش نہیں کیا، کہ ایک طرف، وہ اسے لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھ کر، اپنے تبحرِ علم کا اظہار کر سکیں، اور دوسری طرف، وہ علمائے کرام کو ناواقفِ حقیقتِ نبوت قرار دے سکیں، کیوں کہ اس اقتباس کے سامنے آ جانے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں، جو علما کرام کی تقاریر و کتب میں موجود نہ ہو۔

قرائن سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فاضل جج، خود اپنے طور پر حقیقتِ نبوت کو جاننے کی کوشش کرتے رہے، تو انہیں پرویز صاحب کا اقتباس مل گیا، ورنہ دورانِ کارروائی، اگر عدالت ہی میں انہوں نے کسی عالم سے پوچھا ہوتا تو یقیناً سید انور شاہ صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب یا کوئی اور عالمِ دین، اسے واضح کر دیتا، کیوں کہ خود ان علما کی کتب میں، اس موضوع پر، کہیں زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، بہ نسبت اس کے، جو اقتباسِ پرویز میں موجود ہے۔

علما کی تحسین و تصدیق:

"مفکرِ قرآن" صاحب، فاضل جج کی طرف سے، اپنے اقتباس کی تعریف سے یہ غلط نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ ان کا اقتباس ہی عدالتی فیصلے کی اساس قرار پایا تھا۔ اگر یہ کوئی واقعی اصول ہے کہ کسی اقتباس کی تعریف و تحسین کا لازمی نتیجہ، اس اقتباس کا مدارِ فیصلہ بن جانا ہے، تو پھر علمائے کرام کے عدالت میں، پیش کردہ شہادتی بیانات کو کیوں نہ اساسِ فیصلہ قرار دیا جائے؟ جب کہ اسی جج

نے ان کی نہ صرف یہ کہ تعریف و تحسین فرمائی بلکہ ان کے دلائل کی تصدیق، تائید اور تصویب بھی فرمائی۔ ملاحظہ فرمایئے، چند اقتباسات:

(۱)...... مرزا صاحب کے عقائد کے متعلق، سید انور شاہ صاحب، گواہ مدعیہ نے نہایت عمدہ جواب دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ .... ❶

(۲)...... مدعا علیہ کی طرف سے مرزا صاحب کی بعض کتب کے حوالے دیے جا کر یہ کہا گیا ہے کہ مرزا صاحب نے کسی نبی کی توہین نہیں کی، اس کا جواب، سید انور شاہ صاحب، گواہ مدعیہ نے خوب دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ .... ❷

ان عبارات میں سید انور شاہ صاحب کے جواب کو "نہایت عمدہ" اور "خوب" کہہ کر ان کی تعریف و تحسین اور تصویب و تصدیق کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں "فیصلہ مقدمۂ بہاولپور" کے صفحات ۸۶، ۱۲۰، ۱۳۷، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۷۱ اور ۱۷۲ پر بھی، اُن کے بیانات کی تصدیق و پذیرائی موجود ہے، مزید برآں، بعض مقامات پر، جملہ علماء کرام (جو بطور گواہ پیش ہوئے تھے) کی تعریف و تصدیق بھی کی گئی ہے، مثلاً ایک مقام پر مدعا علیہ (یعنی مدعیہ کا قادیانی شوہر) جب گواہانِ مقدمہ کی (پرویز صاحب ہی کی طرح) یہ کہہ کر توہین و تحقیر کرتا ہے کہ...... "یہ لوگ، دقیانوسی خیالات کے پیرو، اور مرضِ تکفیر میں مبتلا ہیں" اور یہ کہ "انہوں نے اپنی پرانی عادت سے مجبور ہو کر، براہِ بغض اور کینہ، انہیں (یعنی قادیانیوں کو) کافر قرار دیا ہے"...... تو فاضل جج جواباً یہ فرماتے ہیں:

"میں نہیں کہتا کہ علماء غلطی نہیں کرتے، یا یہ کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی کسی رائے کو وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، اور ان کی کسی بات پر کان نہ دھرا جائے، بلکہ چاہیے کہ ان کے اقوال پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کہاں تک راستی پر ہیں۔ مسئلہ ختم نبوت کے بارہ میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ صداقت سے خالی نہیں۔" ❸

❶ فیصلہ مقدمۂ بہاولپور، صفحہ ۱۰۲ ❷ فیصلہ مقدمۂ بہاولپور، صفحہ ۱۰۷ ❸ فیصلہ مقدمۂ بہاولپور، صفحہ ۱۱۱

ایک اور مقام پر فاضل جج جنہ گواہان کی تصدیق و تصویب یوں فرماتے ہیں:

"گواہانِ مدعیہ نے یہ درست کہا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد، وحیِ نبوت جاری ہوتی تو قرآن میں ضرور اس کی وضاحت فرمادی جاتی۔"●

اگر پرویز صاحب، اپنے صرف ایک اقتباس کی، اور وہ بھی صرف ایک مقام پر، تعریف و تحسین کی بنا پر، خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ وہ پورے فیصلۂ مقدمہ کو اپنے اقتباس پر مبنی سمجھ بیٹھیں، تو پھر اس کارنامے کے وہ علماء کرام بدرجہ اولیٰ مستحق ہیں، جن کے کئی بیانات کی، کئی مقامات پر تعریف و تحسین بھی کی گئی ہے اور تصدیق و تائید بھی۔

قابلِ غور امر:

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر فاضل جج کا فیصلہ، فی الواقع، پرویز صاحب ہی کے اقتباس پر مبنی ہوتا، تو اس کے بعد علماء کرام کے بیانات اور اقتباسات پیش نہ کیے جاتے، اور پرویز صاحب کے اقتباس کے فوراً بعد ہی عدالتی فیصلہ طے کر دیا جاتا، لیکن رودادِ مقدمۂ بہاولپور کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ اقتباسِ پرویز (جو صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۹ تک ممتد ہے) اثناءِ بحث، معرضِ تعریف میں آیا، اور پھر عدالتی بحث (اقتباسِ پرویز سے پہلے بھی اور بعد میں بھی) گواہانِ مقدمہ اور فریقینِ مقدمہ کے شہادات اور بیانات پر ہی جاری رہی۔

مدارِ فیصلہ۔ حقیقت نبوت یا ختم نبوت؟:

"مفکرِ قرآن" صاحب نے، اپنے قارئین اور عقیدت مندوں کو یہ باور کروا رکھا ہے کہ مقدمۂ بہاولپور کا فیصلہ، فاضل جج نے، اُس "حقیقتِ نبوت" کی بنیاد پر کیا ہے، جسے ان کے اقتباس میں پیش کیا گیا تھا، جب کہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس فیصلے کا مدار، لفظ "خاتم النبیین" کا حقیقی مفہوم (یعنی آخری نبی) تھا، ملاحظہ فرمایئے فاضل جج کے فیصلہ کے مندرجہ ذیل اقتباسات:

"اس بحث کے بعد، اب اصل تنازعہ کو طے کرنے کے لیے یہ بتلانا ہے کہ اسلام

● فیصلہ مقدمہ بہاولپور، ص: ۱۳۲

کے وہ کون سے بنیادی اصول ہیں کہ جن سے اختلاف کرنے سے ارتداد واقع ہو جاتا ہے، یا یہ کہ کن اسلامی عقائد کی پیروی نہ کرنے سے ایک شخص مرتد سمجھا جا سکتا ہے، اور کہ قادیانی عقائد سے ارتداد واقع ہو جاتا ہے کہ نہ۔ اوپر کی بحث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ ختم نبوت، اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اور کہ رسول اللہ کو خاتم النبیین بایں معنی نہ ماننے سے کہ آپ آخری نبی ہیں، ارتداد واقع ہو جاتا ہے، اور کہ عقائد اسلامی کی رو سے، ایک شخص کلمہ کفر کہہ کر بھی، دائرہ اسلام سے خارج ہو سکتا ہے۔

مدعا علیہ، مرزا غلام احمد صاحب کو، عقائد قادیانی کی رو سے نبی مانتا ہے، اور ان کی تعلیم کے مطابق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ امت محمدیہ میں قیامت تک نبوت جاری ہے، یعنی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین بامعنی آخری نبی تسلیم نہیں کرتا، آنحضرت ﷺ کے بعد، کسی دوسرے شخص کو نیا نبی تسلیم کرنے سے جو قباحتیں لازم آتی ہیں، ان کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے، اس لیے مدعا علیہ، اس اجماعی عقیدہ سے منحرف ہونے کی وجہ سے مرتد سمجھا جاوے گا، اور اگر ارتداد کے معنی، کسی مذہب کے اصولوں سے بالکل انحراف کے لیے جاویں، تو بھی مدعا علیہ مرزا صاحب کو نبی ماننے سے، ایک نئے مذہب کا پیرو سمجھا جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں، اس کے لیے قرآن کی تفسیر، اور معمول بہ، مرزا صاحب کی وحی ہوگی، نہ کہ احادیث و اقوال فقہاء، جن پر اس وقت تک مذہب اسلام قائم چلا آیا ہے، اور جن سے بعض کے مستند ہونے کو، خود مرزا صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔"❶

چنانچہ اس کے بعد، مدعیہ کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے، فاضل جج نے فرمایا:

"مدعیہ کی طرف سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب کاذب مدعی نبوت ہیں، اس لیے مدعا علیہ بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد قرار دیا جائے گا، لہٰذا ابتدائی تنقیحات جو ۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو عدالت منصفی احمد پور شرقیہ سے وضع کی گئی تھیں،

❶ فیصلہ مقدمہ بہاولپور ص ۱۸۰-۱۸۱

بحق مدعیہ ثابت قرار دی جا کر یہ قرار دیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے، لہٰذا، اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح، تاریخ ارتدادِ مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے، اور مدعا علیہ کے عقائد کو بحث مذکورہ بالا کی روشنی میں دیکھا جائے تو بھی مدعا علیہ کے ادّعا کے مطابق، مدعیہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد، کوئی امتی نبی نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ اس کے علاوہ، جو دیگر عقائد، مدعا علیہ نے اپنی طرف منسوب کیے ہیں، وہ گو عام اسلامی عقائد کے مطابق ہیں، لیکن ان تمام عقائد پر وہ انہی معنوں میں عمل پیرا سمجھا جائے گا جو معنی مرزا صاحب نے بیان کیے ہیں، اور یہ معنی چونکہ ان معنوں کے مغائر ہیں جو جمہور امت آج تک لیتی آئی ہے، اس لیے وہ بھی مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا، اور ہر دو صورتوں میں وہ مرتد ہی ہے، اور مرتد کا نکاح چونکہ ارتداد سے فسخ ہو جاتا ہے، لہٰذا ڈگری بدیں مضمون بحق مدعیہ صادر کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ ارتدادِ مدعا علیہ سے اس کی زوجہ نہیں رہی۔ مدعیہ، خرچ مقدمہ بھی، از اں مدعا علیہ، لینے کی حقدار ہوگی۔'' ❶

اس کے بعد، مدعا علیہ نے، اپنے حق میں چند قانونی نظائر پیش کیے، جنہیں فاضل جج نے معقول وجوہ کی بناء پر رد فرما دیا، اور ساتھ ہی مدعا علیہ نے ایک اور سوال اٹھا دیا جس کے متعلق فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں معقول جواب دیا، چونکہ سوال اور پھر اس کا جواب ایک اہم چیز ہے، اس لیے اس کو افادۂ عام کے لیے یہاں درج کرنا ضروری ہے:

''اس ضمن میں مدعا علیہ کی طرف سے ایک سوال یہ پیدا کیا گیا ہے کہ ہر دو فریق، چونکہ قرآن مجید کو کتاب اللہ مانتے ہیں، اور اہل کتاب کا نکاح جائز ہے، اس لیے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار نہیں دینا چاہیے۔ اس کے متعلق مدعیہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ جب دونوں فریق ایک دوسرے کو مرتد سمجھتے ہیں تو ان کے اپنے عقائد کی رو سے بھی، ان کا باہمی نکاح قائم نہیں رہتا، علاوہ ازیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے، نہ کہ مردوں سے بھی۔ مدعیہ کے دعویٰ کی رو سے چونکہ مدعا علیہ مرتد ہو چکا

❶ فیصلہ مقدمہ بہاولپور، صفحہ ۱۸۲۔۱۸۳

ہے، اس لیے اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے بھی، اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح قائم نہیں رہ سکتا، مدعیہ کی یہ حجت وزن دار پائی جاتی ہے، لہٰذا اس بناء پر بھی وہ ڈگری پانے کی مستحق ہے۔'' ❶

مقدمۂ فیصلہ بہاولپور کے حوالے سے، یہ پوری بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ:

(۱) اس میں فیصلہ کی بنیاد قرآن وحدیث کے دلائل پر تھی (نہ کہ تنہا قرآن کے دلائل پر)۔

(۲) اصل فیصلہ کن نکتہ جس پر یہ قضیہ طے پایا، لفظ خاتم النبیین کا معنی ومفہوم تھا (نہ کہ نبی یا نبوت کی حقیقت)۔

(۳) دلائل میں، باوجودیکہ قرآن کے ساتھ، احادیث رسولؐ پر بھی استناد واعتماد کیا گیا تھا، لیکن ''فیصلہ مقدمۂ بہاولپور'' میں کسی مقام پر بھی، یہ بات مذکور نہیں ہے کہ روایات حدیث میں گفتگو کے دوران، ''بحث اصل موضوع سے ہٹ کر، فریقین کی طرف سے پیش کردہ حدیثوں کے صحیح یا ضعیف ہونے پر مرکوز'' ہوگئی، اور اس طرح ''محمل لیلیٰ، غبار ناقۂ لیلیٰ میں گم ہو کر رہ'' گیا۔ روایاتِ حدیث پر گفتگو کے باوجود بھی، ''بحث کا نتیجہ بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش'' نہ رہا، بلکہ قرآن وسنت کی بنیاد پر، یہ نتیجہ ''بالکل نکھر کر سامنے آگیا (اور وہ بھی ''حتمی، یقینی اور دوٹوک فیصلہ'' کی صورت میں) کہ قادیانیت کو اختیار کرنے والا، مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

البتہ طلوع اسلام اور ''مفکر قرآن'' صاحب نے، اس فیصلہ کو اپنے ''قرآنی دلائل'' کا کرشمہ قرار دیتے ہوئے، جو سفید جھوٹ بولا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خود (۱) جھوٹ بولنے میں کس قدر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ (۲) تقلیب امور، مسخ حقائق اور تحریف واقعات کے لیے ان کی دماغی صلاحیتیں کس قدر بلند پایہ تھیں کہ رائی کا پہاڑ بنانا تو رہا ایک طرف، وہ تو رائی کے بغیر بھی پہاڑ بنا ڈالنے میں اس قدر ماہر ومشاق ہیں کہ کوئی دوسرا شخص ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ (۳) اپنے اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے (اور اسے سراپا سچ بنانے کے لیے) جس

❶ فیصلہ مقدمۂ بہاولپور صفحہ ۱۸۳

طرح انہیں کئی اور اکاذیب کا سہارا لینا پڑا اور جس طرح فاضل جج پر بہتان تراشی کرنا پڑی، اس سے یہ امر واقعی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ جھوٹ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، اور یہی ان کی غذائے روح ہے۔ (۴) پھر اس جھوٹ کی بنائے فاسد پر ایک اور فاسد زور کا، یہ کہہ کر اضافہ کرنا کہ ... "۱۹۷۴ء میں، جب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو ملک میں سن ۳۵ء کے مقدمہ کا بھی بڑا چرچا ہوا، اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے بڑے بڑے مولوی صاحبان نے اس کا چرچا تو کیا لیکن انتہائی کوشش کی کہ اس سلسلہ میں، کسی نوع سے بھی، پرویز صاحب کا نام نہ آنے پائے۔ اس سے آپ، ان حضرات کی تنگ نظری، حسد اور بغض کا اندازہ لگا لیجئے" ...... اس حقیقت کو آفتاب نیم روز کی طرح، عیاں کر ڈالتا ہے کہ آخرت میں، خدا کے حضور جواب دہی کا انہیں کبھی، رتی بھر احساس نہیں رہا۔ (۵) پھر، کسی کے کارناموں کا سہرا، خود اپنے سر باندھنا، اگر ایک طرف ان کی انتہائی گھٹیا، کمینی اور چھچھوری حرکت ہے، تو دوسری طرف، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دھوکہ و فریب کے ذریعہ، انہیں تاریکی میں رکھنا بھی کوئی کم گھٹیا روش نہیں ہے۔

خود سوچ لیجیے کہ اس قماش کا آدمی، جو مخلوقِ خدا کے ساتھ، جھوٹ، فریب، دغا، بہتان تراشی اور تہمت طرازی جیسی قبیح و شنیع حرکات سے دریغ نہیں کرتا وہ کلام اللہ کی تفسیر کی آڑ میں تحریف کے کیا کیا گل نہیں کھلا سکتا۔

---

(۳): "مفکر قرآن" کا ایک سہ گونہ جھوٹ:

"مفکر قرآن" جناب غلام احمد پرویز صاحب کے، اُس صریح جھوٹ کے بعد، (جو انہوں نے فیصلہ مقدمہ بہاولپور کے حوالہ سے اختیار کیا)، اب تین مزید اکاذیب پرویز ملاحظہ فرمائیے لیکن پہلے اس حقیقت کو جان لیجیے، کہ وہ لوگ، جو مزاج کے تیز، طبیعت کے گرم، جذباتی اور سریع الغضب ہوتے ہیں، انہیں جب کبھی طیش آتا ہے، اور مشتعل ہو جاتے ہیں، تو غیظ و غضب کی حالت میں، ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، جسم تھرتھرانے لگتا ہے، گردشِ خون تیز ہو جاتی ہے، ضغط الدم بڑھ جاتا ہے، وفورِ جذبات میں دماغ، ہیجانی کیفیت اختیار کر لیتا ہے، زبان

لڑکھڑانے لگتی ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، چہرہ چیں بچیں ہو کر تن جاتا ہے، مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں، بولتے وقت، منہ سے جھاگ اڑتی ہے، اور جو کچھ منہ میں آتا ہے، بولتے چلے جاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر ان کے سینوں میں حقد و حسد اور بغض و کینہ کی آگ بھی جل رہی ہو، تو شدتِ جذبات میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، ایسی شدید جذباتی حالت میں جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، زبان ساتھ نہیں دیتی، اور بے ساختہ ان کی زبان و قلم سے جھوٹ، یوں نکلنے لگ جاتا ہے جیسے ابلتے ہوئے گٹر سے گندہ پانی۔

بالکل یہی کیفیت ہے جس میں ہم نے ''مفکرِ قرآن'' کو عمر بھر پایا ہے، علمائے کرام کے خلاف بالعموم اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ان کی جماعت کے خلاف بالخصوص، ایسی ہی حالت میں، ان کے قلم سے کذب و زور کا اظہار ہوا کرتا تھا، ان کے خلاف بولتے ہوئے یا لکھتے ہوئے، جب وہ اپنی زبان یا قلم کو حرکت میں لاتے تھے، تو ان کی مخالفت کا اندھا جوش، ان کے ہوش پر غالب ہو جاتا تھا۔ ایسی حالت میں انہیں اس بات کا مطلق احساس نہیں رہتا تھا کہ کیسے کیسے اکاذیب و اباطیل، اُن کے لسان و قلم سے ٹپک رہے تھے، چنانچہ ایک مقام پر وہ جماعت اسلامی کے خلاف، ﴿ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ﴾ کا مصداق بن کر، لکھتے ہیں:

> ''ہم اٹھارہ برس سے (بلکہ ۱۹۴۰ء سے) مسلسل پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جماعت اسلامی، نہ کوئی مذہبی جماعت ہے، نہ اس کے اقدامات کا جذبۂ محرکہ، دینی تقاضا ہوتا ہے۔'' ❶

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کی مخالفت، ۱۹۴۰ء سے جاری ہے۔ ایک اور مقام پر، اسی بات کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:

> ''ہم نے تیس سال پہلے قوم کو متنبہ کیا تھا کہ جماعت اسلامی، قوم اور اسلام، دونوں کے لیے مہیب خطرہ کا موجب ہے۔'' ❷

یہ ۱۹۷۰ء کی تحریر ہے، تیس سال قبل، یعنی ۱۹۴۰ء میں، جماعت اسلامی کے خطرۂ مہیب سے

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۷ء، ص: ۲۰ ❷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص: ۴۴

قوم کو آگاہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد، ایک اور مقام پر، یہ کہا گیا کہ ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کے اجراء کے وقت، اس مجلّہ کو جن جماعتوں کے خلاف، جنگ لڑنا پڑی تھی، اُن میں، جماعتِ اسلامی بھی شامل تھی۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"قائداعظم، انگریز اور ہندو کے محاذ کو، نہایت عمدگی سے سنبھال سکتے تھے، لیکن وہ حضرات جو قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرسول کے نعروں کے ساتھ، مخالفت کے لیے ابھرے تھے، اُن کے مقابلے کے لیے، انہیں کسی معاون کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے، اُن کی نگہِ انتخاب، ایک ایسے نوجوان پر پڑی، جو ایک مدت سے انہی وادیوں میں مصروفِ تحقیق تھا۔ اس نوجوان کا نام، جو اس وقت ہندوستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، غلام احمد پرویز تھا، اور یہ تھا وہ مقصد، جس کے لیے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس میدان میں، اس کے مدِمقابل، قبا اور عمامہ کے بڑے بڑے علم بردار تھے، جن کی علمیت اور فضیلت کا سکہ، ہندوستان ہی نہیں، بلکہ بیرونِ ہند تک کے لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ وغیرہ جیسے علما، مجلس احرار، سرخ پوش، جمعیتِ انصار، جماعتِ اسلامی اور ان کے ہم نوا۔ یہ سب تحریکِ پاکستان کے خلاف، متحدہ محاذ بنائے ہوئے تھے، اور ان کے مقابلہ میں یکہ وتنہا طلوعِ اسلام۔"❶

پہلے دونوں اقتباسات میں، یہ کہا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت ۱۹۴۰ء سے آغاز پذیر ہوئی، اور اس آخری اقتباس میں یہ جتایا گیا ہے کہ طلوعِ اسلام کو، ۱۹۳۸ء ہی میں، اپنے اجراء وآغاز ہی کے وقت سے، جن جماعتوں کے خلاف جنگ لڑنا پڑی، ان میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ان عبارتوں میں تعارض وتناقض بھی پایا جاتا ہے، یہ تینوں اقتباسات، کذبِ پرویز (یا کذبِ طلوعِ اسلام) کا منہ بولتا ثبوت ہیں، کیوں کہ زمانہ خواہ ۱۹۴۰ء کا ہو یا ۱۹۳۸ء کا۔ اُس وقت، جماعت اسلامی کا وجود ہی نہیں تھا، جماعت اسلامی کی تاسیس وتشکیل کب

---

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص: ۴۳

ہوئی؟ طلوعِ اسلام ہی سے اس سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

''جماعت اسلامی کا قیام مولانا مودودی صاحب کے ہاتھوں ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء لاہور میں عمل میں لایا گیا۔''❶

جب ۱۹۳۸ء یا ۱۹۴۰ء میں جماعت اسلامی کا وجود ہی نہ تھا، تو اس کی مخالفت کا کیا معنی؟ انسان کو جھوٹ بولتے ہوئے، اگر خوفِ خدا نہیں، شرمِ رسول نہیں، تو کم از کم مخلوقِ خدا ہی سے حیا کی ہوتی۔ اور یہی سوچا ہوتا کہ جب اس جھوٹ کا پول کھل جائے گا، تو کیا عزت رہ جائے گی۔ لیکن عزت کا احساس تو اسے ہو جس کی فی الواقعہ کوئی ''عزت'' ہو، یہاں اگر کوئی چیز موجود ہے تو وہ صرف ''عزت الاثم'' ہے، جو ہر جھوٹ اور بُرائی کے ساتھ اضعافاً مضاعفۃ ہوتی چلی جاتی ہے۔

اور چوتھا جھوٹ بھی:

مندرجہ بالا آخری اقتباس کا آخری حصہ، ایک اور (چوتھے) جھوٹ پر بھی دلالت کر رہا ہے۔ اس میں مجلسِ احرار، جمعیتِ علما اور چار جماعتوں کا ذکر کر کے، یہ کہا گیا ہے کہ...... ''یہ سب تحریکِ پاکستان کے خلاف، متحدہ محاذ بنائے ہوئے تھے، اور ان کے مقابلہ میں یکہ و تنہا طلوعِ اسلام''..... اس صریح کذب میں بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ باقی اخبارات و مجلات کی نفی کر کے، اس جنگِ آزادی کے لڑنے کا سارا سہرا طلوعِ اسلام ہی کے سر باندھا جائے، حالانکہ متحدہ ہندوستان میں شعبہ صحافت کے بہت سے اور گوشوں سے بھی یہ جنگ لڑی گئی ہے، اس کا ثبوت، کسی اور کتاب سے فراہم کرنے کی بجائے طلوعِ اسلام ہی کے صفحات سے پیش کیا جا رہا ہے:

''اس زمانہ میں برصغیر کے طول و عرض میں پاکستان کے حوالے سے ایک قلمی جنگ جاری تھی۔ برصغیر کے تمام اخبارات، مسلم زعماء باستثناء چند، سب پاکستان کے خلاف تھے۔ اس وقت کے اخبارات کے فائل گواہ ہیں کہ پنجاب میں ''زمیندار''، دہلی سے ''انجام''، اور مجلہ ''طلوعِ اسلام'' پاکستان کے نقیب تھے۔ باقی تمام پریس ''ڈان'' کے سوا، پاکستان کے خلاف تھے۔''❷

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۳
❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۰

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کی جنگ "یکہ وتنہا طلوعِ اسلام" نے نہیں لڑی، لیکن جس کی رگ رگ میں کذب وزُور اور دروغ وجھوٹ رچ بس چکا ہو، اور کتمانِ حقائق جس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہو، واقعات کو مسخ کر کے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، جس کا دائمی مشغلہ قرار پا چکا ہو، خیانت وبددیانتی کے جراثیم جس کے ذراتِ خون تک میں حلول کر چکے ہوں، تہمت طرازی اور بہتان تراشی جس کی ہڈیوں کے گودے تک میں اتر چکی ہو، ہوسِ شہرت کا بخار، جسے، اس حد تک چڑھا ہوا ہو کہ مخالفین کے ہاتھوں انجام پانے والے کارناموں کو بھی، وہ اپنی ذات سے منسوب کرنے کا عادی ہو چکا ہو، تو ایسا "مفکرِ قرآن" جھوٹ نہ بولے تو اور کیا کرے؟

باب ۴

مغالطہ آرائیاں، خیانت کاریاں، فریب انگیزیاں

دنیا میں خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ، اچھے سے اچھا تصور، خوب سے خوب تر فکر اور خوش آئند سے خوش آئند قول، ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے، لیکن جو چیز اس کے ساتھ، ہر وقت مطلوب ہے، وہ عمل ہے۔ کوئی شخص، خواہ وہ خود کو، یا دوسرے اشخاص اس کو کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ سمجھتے ہوں، اس کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل، اس کے نیک خیالات، پاکیزہ تصورات، اور خوش کن نظریات نہیں، بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ اگر اعمال و افعال اور سیرت و کردار کا یہ معیار قائم نہ کیا جائے، تو اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جائے، اور دنیا صرف باتیں بنانے والوں کا مسکن بن کر رہ جائے۔ اس پہلو سے جب ہم "مفکرِ قرآن" کو دیکھتے ہیں، تو ہمارے سامنے ان کے وہ اعمال آتے ہیں جن میں دھوکہ و فریب دہی، خیانت کاری، الزام تراشی، بہتان طرازی، افترا پردازی، دروغ گوئی، کتمانِ حق اور تلبیسِ باطل، اور پھر ان سب کے نتیجہ میں تضادات و تناقضات کا وسیع خارزار دکھائی دیتا ہے، ہمارے سامنے، ان کی پچاس پچپن سالہ "قرآنی خدمات" اس لیے نہیں آتیں کہ وہ اگر ایک فریق کے نزدیک بلند پایہ "علمی جواہر" ہیں تو دوسرے گروہ کے نزدیک، "قرآنی تحریفات و تلبیسات" کا مجموعہ ہیں۔ اور عام آدمی سے یہ بات مخفی ہی رہتی ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے، لیکن "مفکرِ قرآن" صاحب کے اعمال و افعال کے بارے میں تھوڑی سی تحقیق کے بعد، ہر شخص جان سکتا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ واقعاتی برحقائق اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اسی لیے اس باب میں وہ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو ان کے اعمال و افعال سے تعلق رکھتی ہیں، اور جن میں تلبیسِ امور اور تحریفِ حقائق کے ذریعہ، "مفکرِ قرآن" صاحب خیانت کاری اور دھوکہ دہی کی روش پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔

(۱): زمانی پس منظر سے عبارت کو کاٹ کر دھوکہ دہی اور خیانت کاری کی پہلی مثال:

برصغیر پاک و ہند میں ۱۹۴۷ء سے قبل، انگریزوں کی حکومت تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا، اور دو ہی روز بعد، (۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو) برطانوی حکومت بھی اس جنگ میں شریک ہو گئی، حکومت برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ اس جنگ میں اُس کی شمولیت پر مسلمانوں میں کوئی منفی ردعمل پیدا نہ ہو۔ اس لیے، اُسے برصغیر کی مسلم آبادی کو، نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں کرنا تھا، بلکہ مسلمانانِ برصغیر کی حمایت بھی اسے مطلوب تھی۔ مسلم لیگ نے، جس کی قیادت، قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی، مقامی برطانوی حکومت کو اپنی حمایت و اعانت فراہم کرنے کے لیے، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو، ایک ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ ریزولیوشن، تین چار صفحات پر مشتمل تھا، اس میں برطانیہ کو صرف اس شرط پر جنگ میں تعاون کا یقین دلایا گیا کہ وہ صرف ہندوستان کی چار دیواری میں مسلم قوم کے حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسرے الفاظ میں، اس کا معنی یہ تھا کہ مسلم لیگ کو اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کی جنگ، قتال فی سبیل اللہ ہے یا قتال فی سبیل الطاغوت۔ انہیں صرف اس سے بحث تھی کہ مسلم قوم کے ہندوستان کی حد تک، قومی حقوق کا تحفظ ہو جائے۔ اس تحفظ کی یقین دہانی کے بعد، مسلم لیگ، اس قتال میں تعاون کے لیے تیار تھی جو بہر حال قتال فی سبیل اللہ نہیں، بلکہ قتال فی سبیل الطاغوت ہی تھا۔ اس قرارداد کے، درج ذیل فقروں میں، حکومت برطانیہ کو حمایت و تعاون کا یقین دلایا گیا تھا:

> "مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو پولینڈ، انگلستان اور فرانس سے گہری ہمدردی ہے، بایں ہمہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں برطانیہ کو اس وقت تک مسلمانوں کی مدد اور تعاون حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے، کانگریسی صوبوں میں، جہاں آج مسلمانوں کا مال محفوظ ہے، نہ جان، عزت محفوظ ہے نہ آبرو، اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق کو نہایت بے رحمی سے کچلا جا رہا ہے، ان کے ساتھ حق و انصاف کا سلوک نہیں کرتی۔" ❶

---

❶ ہماری قومی جدوجہد، جنوری ۱۹۳۹ء تا دسمبر ۱۹۳۹ء، از عاشق حسین بٹالوی، مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور

اس قرارداد کے آخر میں، پھر اسی بات کو یوں دہرایا گیا ہے:

"آج دنیا کو جو خطرناک بحران درپیش ہے، اگر اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے، حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا آبرومندانہ تعاون درکار ہے، تو اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں، نیز اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا، جو مسلمانانِ ہند کی واحد نمایندہ جماعت ہے، اعتماد حاصل کرے۔" ❶

۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کی اسی قرارداد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے (نومبر ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں) یہ تحریر فرمایا:

"آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس، مسلم لیگ، جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمایندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ وہ اس وقت کس روش پر چل رہی ہے، موجودہ جنگ کے آغاز میں، اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا، اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں، جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اول نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے، وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام کے مسلمانوں پر پوری اخلاقی موت واقع ہو چکی ہے، مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی اور قریب قریب انھی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کی

---

❶ ہماری قومی جدوجہد، جنوری ۱۹۳۹ء تا دسمبر ۱۹۳۹ء، از عاشق حسین بٹالوی، مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور

بجائے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات، اس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان، اب اس سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع و محل پر، دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم، جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے، وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اولاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمایندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملے کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں، اگر میں نے صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ، معاملہ، خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورت حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں تو پھر ''مسلمان'' کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ایسا طرزِ عمل تو، اگر میں نامسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی ہوا بھی مجھے نہ لگی ہوتی، تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔'' ❶

اس کے بعد، مولانا مودودیؒ نے یہ واضح کیا کہ وہ خود اس معاملہ کو ایک ''وطن پرست'' کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، یا ایک ایسے اصول پرست کی حیثیت سے، جس کا اصول، اول و آخر، اسلام ہو۔

''میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی، مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے

❶ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۳۹ء، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد ۲۹۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم، صفحہ ۳۴۔۲۱۳

ہونے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندگی ہوتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے **جب میں مسلم لیگ کے ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔**" ❶

مولانا مودودی کے اس آخری جملے کو جسے خط نسخ میں پیش کیا گیا ہے، ''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب، خیانت و بددیانتی کے ساتھ، اس کے زمانی سیاق و سباق سے الگ نکال کر، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے، مولانا مودودی پر یہ جھوٹا الزام عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات، مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء والے ریزولیوشن کے بارے میں کہی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے اُن کا درج ذیل اقتباس:

> ''جب مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (لاہور) میں پاکستان کا ریزولیوشن پیش ہوا تو انہوں (یعنی قائد اعظم) نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔۔۔
> ''میرے لیے یہ اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں، اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے، ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے، یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھا دے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔'' ❷

---

❶ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۳۹ء، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، سوم صفحہ ۱۳۰، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم صفحہ ۰

❷ طلوع اسلام، فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۲ تا ۲۳

قائداعظم کے اس فرمان کے آخری جملے پر ● کا نشان ثبت کر کے، نیچے حاشیہ میں، "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب لکھتے ہیں

"یہی وہ ریزولیوشن تھا جس کے متعلق، امیر جماعت اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ..... "جب میں مسلم لیگ کا ریزولیوشن دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔"..... ❶

کیا وہ شخص، جسے خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس ہو، اور سنت نبویؐ کو تو خیر چھوڑ یئے، فقط قرآن ہی کی مخلص پیروی کا دعوے دار ہو، کیا اس قسم کی بددیانتی کرسکتا ہے کہ اپنے مخالفین کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے اور موقع ومحل سے جدا کر کے، محض اپنے بغض وعناد کا بخار نکالنے کے لیے، اور خلقِ خدا کو دھوکہ وفریب دینے کے لیے الزام تراشی، بہتان طرازی اور افتراء پردازی کا ذریعہ بنائے؟

مولانا مودودیؒ کی وضاحت:

پرویز صاحب نے سیاق وسباق اور موقع ومحل سے کاٹ کر جس عبارت کی بنیاد پر یہ الزام تراشی کی، وہ اُس "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کی عبارت تھی جواب "تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان" حصہ دوم میں شامل ہے، اس کتاب میں، اسی جملہ پر، جسے پرویز صاحب نے الزام تراشی کی بنیاد بنایا ہے، مولانا مودودیؒ نے ان الفاظ میں جدید حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

"بعض لوگوں نے کمال بددیانتی کے ساتھ، اس فقرے کو سیاق وسباق سے الگ نکال کر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے یہ بات مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء والے ریزولیوشن کے بارے میں لکھی تھی، حالاں کہ یہ مضمون نومبر ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مارچ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن پر اظہار خیال کسی الہامی طاقت ہی سے کیا جاسکتا تھا۔" ❷

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۴۳

❷ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم، صفحہ ۴۳

یہاں ایک سلیم الفطرت اور بے لاگ تحقیق کرنے والا غیر جانب دار شخص، "مفکر قرآن" اور مولانا مودودیؒ کے درمیان واقع اخلاقی فرق و تفاوت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک طرف، عبارات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر صریح بددیانتی، بہتان تراشی اور خلق خدا کو دھوکہ دینے کے مرتکب ہیں، اور وہ بھی مولانا مودودیؒ کا نام لے کر، انہیں نشانہ بناتے ہوئے۔ اور دوسری طرف، اس بہتان و بددیانتی کا پردہ چاک بھی کیا جاتا ہے، تو پرویز صاحب کا نام لیے بغیر، کجا یہ کہ انہیں مطعون کیا جائے۔ یہ طرزِ عمل خود اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ کہاں اخلاقی رزائل پائے جاتے ہیں اور کہاں اخلاقی فضائل۔

(۲): بددیانتی اور دھوکہ دہی کی دوسری مثال:

مولانا مودودیؒ کے خلاف، "مفکر قرآن" جناب غلام احمد پرویز صاحب، جس حسد و کینہ اور نفرت و عداوت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، وہ اس امر پر شاہد ہے کہ مؤخر الذکر کو امانت و دیانت اور حق و عدل سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اپنے مخالف کو ہر حال میں نیچا دکھایا جائے، اور اس مقصد کے لیے، انہیں کوئی گھٹیا سے گھٹیا اور گھناؤنی سے گھناؤنی حرکت کرنے سے بھی کوئی عار نہیں۔ چنانچہ وہ، ایک اور مقام پر ایسی ہی حرکت کرتے ہوئے، قائداعظم کا یہ قول پیش کرتے ہیں:

> "قائداعظم، اٹھتے بیٹھتے اس حقیقت کو واضح کرتے چلے جاتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی مملکت قائم ہوگی۔ اس میں اسلامی تصورات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر ہوگی۔" ❶

اس کے بالکل متصل، وہ، مولانا مودودیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

> لیکن جن لوگوں کو پاکستان سے خدا واسطے کا بیر تھا، وہ پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ......
>
> "مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن، اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں، آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر، اسلامی نظامِ حکومت

❶ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۵

قائم کرنا ہے۔" (ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ، صفحہ ۲۷) ❶

اس کے فوراً بعد، "مفکرِ قرآن" کی یہ عبارت موجود ہے:

"ہندوستان میں مسلمانوں کو یہ کہہ کر پاکستان کے خلاف بھڑکایا گیا۔ لیکن جب یہی صاحب، پاکستان تشریف لے آئے، تو اب یہ کہا جا رہا ہے کہ ...... "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں، جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نظام، خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر مبنی ہو، اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیڈروں کے ذہن میں، اس وقت خواہ کچھ بھی ہو، کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ ارادوں پر یقین کر کے تحریکِ پاکستان میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ (دستوری سفارشات پر تنقید، صفحہ ۷)" ❷

مولانا مودودیؒ کی قیامِ پاکستان سے پہلے کی ایک عبارت، اور پاکستان بننے کے بعد کی ایک عبارت کو "مفکرِ قرآن" نے پیش کر کے، سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ کے تضاد کو واضح کرتے ہوئے، اپنے قارئین کو دھوکہ اور فریب دینے کی جو "خوبصورت کوشش" فرمائی ہے، اس کی داد نہ دینا زیادتی ہے، اس سے انہیں کم از کم یہ فائدہ ضرور پہنچا ہے کہ انہیں اپنے تضادات و تناقضات کو چھپائے رکھنے کے لیے، ایک پردہ فراہم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب وہ، مولانا مرحومؒ کی دونوں عبارتوں کو پیش کر کے، نتیجہ یہ نکالتے ہیں:

"یعنی ہندوستان میں یہ کہا گیا کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے اپنی کسی تقریر میں یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو گا، اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ لیگ کے لیڈروں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر سے یہ کہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو گا۔ انسان کی دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔" ❸

---

❶، ❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۵ ❸ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۵

واقعی یہ بات تو درست ہے کہ...... ''انسان کی دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے''...

مگر یہ کہ اس جملے کا مخاطب کسے ہونا چاہیے؟ اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کیجیے۔

متحدہ ہندوستان میں، اٹھتے بیٹھتے اس حقیقت کی وضاحت میں کہ مجوزہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم ہوگا، قائداعظم کے جن پانچ بیانات کو، ''مفکر قرآن'' نے بطور ثبوت پیش کیا ہے، وہ تاریخ وار درج ذیل ہیں:

(۱)..... اگست ۱۹۴۱ء میں، وہ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے، وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے اس باب میں کچھ سوالات پوچھے۔ ان سوالوں کے جواب میں، انہوں نے جو کچھ فرمایا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام سے ان کا متعین مفہوم کیا تھا۔ ❶

(۲) ... انہوں نے (یعنی قائداعظم نے) مارچ ۱۹۴۳ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان کے تصور کو، جو مسلمانوں کے لیے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز، اسی میں مضمر ہے۔ اس سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گذشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی۔ ❷

(۳)..... قائداعظم نے (۹ دسمبر ۱۹۴۳ء کو) یوم اقبال کی تقریب پر، انہیں ان گراں قدر الفاظ میں یاد فرمایا: ''علامہ اقبال، اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے، لیکن وہ عملی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمان کامل اور یقین محکم کی بنیاد پر ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔'' ❸

---

❶ طلوع اسلام فروری ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۵، ۲۶ ❷، ❸ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۴

(۴)......جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام، اپنے پیغام میں فرمایا:
"پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، اس سے حقیقی مراد، مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں، اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کریں۔" ❶

(۵)......انہوں نے (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیئر مسلم لیگ پشاور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا "مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔" ❷

یہ پانچ بیانات ہیں، جنہیں ہم نے تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے (جبکہ طلوع اسلام نے ان کی تاریخی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا)۔ قائداعظم کے ان پانچوں بیانات میں واقعی اس بات کا ذکر ہے کہ مجوزہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ ان بیانات کو "مفکر قرآن" نے مولانا مودودیؒ کے اُس بیان کی تردید وتغلیط میں پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "مسلم لیگ کی کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے، کسی کی تقریر میں، آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر، اسلامی حکومت قائم کرنا ہے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے یہ بات کب کہی تھی؟ طلوع اسلام نے اس کا حوالہ "ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ" کا پیش کیا ہے۔

قابلِ غور سوال:

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ قائداعظم کے جملہ بیاناتِ خمسہ کو طلوع اسلام نے عیسوی کیلنڈر کی تواریخ کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن مولانا مودودی کے اس اقتباس کو قمری کیلنڈر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا حل، ایک طرف تو، قارئین کرام کے قلوب واذہان کی ساری گرہیں کھول دیتا ہے، اور دوسری طرف "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے دجل وفریب کو بے نقاب کر ڈالتا ہے۔ محرم ۱۳۶۰ھ کی

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۵ ❷ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۴، ۲۵

مطابقت، اگر عیسوی کیلنڈر کے ساتھ تھم کی جائے تو مارچ ۱۹۴۱ء طے پاتا ہے لیکن طلوعِ اسلام نے اسے فروری ۱۹۴۱ء قرار دیا ہے۔ (دیکھیے طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۱ء، جس میں محرم الحرام ۱۳۶۰ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء درج ہے۔)

اب "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی خیانت، بددیانتی، دجل و فریب اور مغالطہ آرائی ملاحظہ فرمایئے کہ قائد اعظم نے مجوزہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے حوالے سے جتنے بھی اعلانات کیے ہیں، وہ سب کے سب فروری ۱۹۴۱ء یا مارچ ۱۹۴۱ء (محرم ۱۳۶۰ھ) کے بعد کے اعلانات ہیں۔ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، جس وقت (یعنی فروری یا مارچ ۱۹۴۱ء میں) یہ کہا تھا کہ کسی مسلم لیگی لیڈر نے یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا، اُس وقت واقعی صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ قائد اعظم کے یہ سارے بیانات فروری یا مارچ ۱۹۴۱ء کے بعد (یعنی اگست ۱۹۴۱ء، مارچ ۱۹۴۴ء، ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء، جون ۱۹۴۵ء، اور ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) منظرِ عام پر آئے تھے، اور پھر ان ہی بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے، پاکستان بن جانے کے بعد، مولانا مودودیؒ نے یہ فرمایا تھا کہ لیگ کے لیڈروں نے ہر سٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔

انسان کی دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے:

اب آپ خود سوچ لیجیے کہ مولانا مودودیؒ کی عبارات کو، ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے، اور زمانۂ تحریر سے صرفِ نظر کر کے پیش کرنا، کیا "مفکر قرآن" کی نیک نیتی پر مبنی ہے یا فسادِ نیت اور بدباطنی پر؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تنہا مولانا مودودیؒ کے اقتباس کو کیوں قمری کیلنڈر کے ساتھ پیش کیا گیا؟ کیا صرف اور صرف اس لیے نہیں کہ اگر "مفکر قرآن" صاحب، عیسوی کیلنڈر کے ساتھ ماہ و سال درج کر دیتے تو ان کی بددیانتی اور دجل و فریب کا پردہ، ہر اس شخص پر فاش ہو جاتا، جس کی نظر مولانا مودودیؒ اور قائد اعظم کے فرمودات کے ماہ و سال پر پڑ جاتی؟

اس بحث کی روشنی میں "مفکر قرآن" چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی خیانت و بددیانتی

دجل وفریب اور مغالطہ آرائی کی راہ سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی اس "مبارک و مسعود سعی و کاوش" کو ملاحظہ فرمایئے اور پھر خود ہی یہ فیصلہ کیجیے کہ "مفکرِ قرآن" کے ان الفاظ کے مخاطب ہونے کا سزاوار آیا مولانا مودودیؒ ہیں یا وہ خود، کہ "انسان کی دیدہ دلیری کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے؟"

(۳): دجل وفریب کی تیسری مثال:

"مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، اپنے مخالفین کی عبارات کو سیاق و سباق سے اکھاڑ کر پیش کرتے ہیں، کس قدر عدل وانصاف اور امانت و دیانت سے کام لیا کرتے تھے، اگرچہ یہ گزشتہ دونوں مثالوں سے واضح ہے لیکن قارئین کرام کے "مفکرِ قرآن" کے کردار کے بارے میں، تعارف مزید کی خاطر، ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔ وہ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، وہ انہیں اطمینان دلاتے ہیں اور کہتے ہیں...... "جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں، اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد، اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے، اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کے وقت صرف تین لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد، ساڑھے چار کروڑ[1] اطالوی باشندوں پر چھا گئی، یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔"...... (ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، صفحہ ۳۸)"[2]

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں خوفِ خدا ہو، آخرت میں جواب دہی کا احساس ہو،

---

[1] طلوعِ اسلام میں یہاں غلطی سے تعداد "ساڑھے چار لاکھ" درج تھی، جس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

[2] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۱

اور اللہ و رسولؐ سے نہ سہی، کم از کم مخلوقِ خدا ہی سے شرم و حیا کی فکر ہو، تو وہ اس قسم کی خیانت، قطع و برید، اور دھوکہ دہی کا ارتکاب نہیں کر سکتا، جیسا کہ یہاں "مفکرِ قرآن" صاحب نے کر ڈالا ہے۔

اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ، مولانا مودودیؒ نے، اپنی جماعت کے ارکان کو، ان کی تعداد کی قلت کے حوالے سے مطمئن کرتے ہوئے نہیں کہا تھا بلکہ متحدہ ہندوستان کی پوری کی پوری مسلم آبادی کو تحریری خطاب کرتے ہوئے کہا تھا جو ہندو اکثریت کے مقابلہ میں ایک چوتھائی حد تک قلیل التعداد ہونے کی بنا پر، اپنے سیاسی مستقبل کے متعلق پریشان تھی۔ پورا اقتباس اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ملاحظہ فرمایے۔ اگرچہ یہ اقتباس طویل ہے، لیکن طوالت کی کوفت کے باوجود، اسے صرف اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ہمارے "مفکرِ قرآن" خود کن "قرآنی فضائلِ اخلاق" سے آراستہ تھے۔ اور اپنے مخالفین کی عبارات کو صحیح سیاق و سباق کے ساتھ پیش کرنے میں، کس قدر "عدل و دیانت" سے کام لیا کرتے تھے:

"مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو، ایک عالم گیر تحریک کی بجائے، ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کی بجائے، محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کا موجب بن گئی ہے کہ سر شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں؟

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے، اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمانوں کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے، اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کند ہتھیار، اور اپنے آپ کو محض "ایک

قوم سمجھتا ہے، اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی فکر پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں، اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفہ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا، بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

قلت و کثرت کا سوال صرف قوموں کے لیے پیدا ہوتا ہے، "جماعتوں" کے لیے نہیں۔ جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں، اور قلیل تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے، اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی، مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کے وقت صرف تین لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کی بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے، دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔" ●

● ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۲۸

یہ پورا اقتباس، اسی مقام سے پیش کیا گیا ہے، جہاں سے آخری حصہ، ایک ادھورے جزو کی حیثیت سے لے کر، ''مفکر قرآن'' نے پیش فرمایا ہے، اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کی یہ عبارت، ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھی گئی ہے یا یہ ان کی اپنی جماعت (جماعت اسلامی) کے ارکان کی قلتِ تعداد کو پیش نظر رکھ کر، انہیں خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہے۔

(۴): اسی واقعہ میں ایک اور خیانت:

اسی اقتباس کے حوالے سے ''مفکر قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی دوسری خیانت و بددیانتی یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے ماہ اشاعت کا جو حوالہ دیا ہے، وہ سنِ عیسوی کی بجائے، قمری کیلنڈر سے تعلق رکھتا ہے، یعنی ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ چونکہ سن عیسوی کا ماہ و سال درج کرنے کی صورت میں، ''مفکر قرآن'' کو یہ خطرہ تھا کہ ان کی خیانت کا پردہ چاک ہو جائے گا، اس لیے انہوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ سن عیسوی کا ماہ و سال درج کرنے کی بجائے، فقط ''ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ'' لکھ دیا جائے، کیونکہ قمری کیلنڈر کی تاریخ پڑھتے ہوئے، قاری کا ذہن کم ہی اس طرف پلٹتا ہے کہ اس کی مطابقت عیسوی کیلنڈر کے لحاظ سے معلوم کی جائے۔ لیکن اگر آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کا زمانہ، سن عیسوی کے اعتبار سے، ''فروری ۱۹۴۱ء'' بنتا ہے۔ خود طلوع اسلام کی فائل میں، جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱، پر جو تاریخ درج ہے، وہ ''ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ مطابق جنوری ۱۹۴۱ء'' ہے، ظاہر ہے کہ اس سے اگلا شمارہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء قرار پاتا ❶ ہے۔ اور فروری ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا وجود ہی نہیں تھا، کجا یہ کہ مولانا مودودیؒ، اپنی جماعت کے ارکان کو خطاب کرتے ہوئے، وہ بات کہتے، جس کا حوالہ ''مفکر قرآن'' نے دیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی تاسیس و تشکیل کب ہوئی؟ خود طلوع اسلام ہی میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے:

---

❶ عیسوی اور قمری کیلنڈر کی تاریخوں میں مطابقت کے حوالے سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء ...... اور ...... محرم الحرام ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء۔ واللہ اعلم بالصواب

"جماعت اسلامی کا قیام، مولانا مودودیؒ کے ہاتھوں ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں عمل میں لایا گیا۔"●

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ کس "نظریہ ضرورت" کے تحت "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب نے عیسوی کیلنڈر کی بجائے قمری کیلنڈر کی تاریخ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ درج کی ہے۔ اگر وہ "فروری ۱۹۴۱ء" لکھ دیتے تو ہر اس شخص پر "مفکر قرآن" صاحب کی خیانت و بددیانتی اور دجل و فریب کا پردہ چاک ہو جاتا، جو جماعت اسلامی کی تاریخ تاسیس و تشکیل سے واقف ہے۔

اب سوچیے، کیا یہ حرکتیں، کسی شریف النفس، مخلص متلاشی حق، اور دیانت دار آدمی کو بھی زیب دیتی ہیں؟ کجا یہ کہ ان کا ارتکاب وہ شخص کرے، جو "مفکر قرآن" کہلا کر، دعویٰ تحقیق کرتے ہوئے تفسیر قرآن لکھ رہا ہو۔ کوئی ایک آدھ واقعہ ہو، تو اسے خیانت کاری اور دھوکہ دہی کی بجائے سہو وخطا کا نتیجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں تو متعدد واقعات ایسے ہیں، جن میں ایک سے ایک بڑھ کر، ایسے کرتب دکھائے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خیانت و بددیانتی اور خدع و فریب، "مفکر قرآن" کے "جہادِ قرآنی" کی مستقل شمشیریں ہیں۔ اس قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر، میدانِ تفسیر میں ان کے مجاہدہ کے نتیجہ میں، جو تفسیر قرآن، منظرِ عام پر آئی ہے، اس کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے "مفکر قرآن" کی تصنیف کردہ تفسیر پر بھی، بعنوان "تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ" کام کیا ہے، اور مجھے گمان ہی نہیں بلکہ سو فی صد یقین ہے کہ فکرِ پرویز سے وابستہ وہ لوگ، جو اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اتار کر، بے لاگ انداز میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے، اس کا مطالعہ فرمائیں گے، وہ، جناب پرویز صاحب کے تجدد کے پائے چوبیں کو سخت بے تمکین پائیں گے۔ اور وہ یہ محسوس کریں گے کہ رشد و ہدایت فی الواقعہ، غوایت و ضلالت سے متمیز ہو چکی ہے۔ ﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾

● طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۲

(۵): خیانت و بد دیانتی کی پانچویں مثال:

قبل اس کے کہ "مفکرِ قرآن" نے اپنے مخالفین کے خلاف، دجل و فریب، خیانت و بد دیانتی سے بھرپور اور عدل و انصاف کے منافی جو رویہ اپنا رکھا تھا، اس کی ایک اور مثال پیش کی جائے، اس جملہ پر غور فرمایئے:

"زید کا نظام، بکر کے نظام سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔"

کیا اس ایک گونہ مماثلت کا فی الواقعہ یہی مفہوم ہے کہ زید نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، بکر سے یا بکر نے نظریات اور تنظیمی پروگرام زید سے لیے ہیں؟ ...... یا ...... یہ کہ زید کا نظام، نظریات اور تنظیمی پروگرام کے لحاظ سے، بکر کے نظام سے ہے تو مختلف ہی، (اور اسی لیے تو ان کو دو مختلف نظام قرار دیتے ہوئے، دو مختلف ہستیوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے) مگر کسی پہلو سے، دونوں میں، ایک گونہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

آپ اگر کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، اور زید کے خلاف، آپ کے دل و دماغ میں کوئی حسد، کینہ، بغض اور عداوت نہیں ہے، تو آپ یقیناً اور فوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "ایک گونہ مماثلت" سے قطعاً یہ مفہوم نہیں، کہ زید نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، سب کچھ بکر کے نظام سے اخذ کیے ہیں۔ کیونکہ دو مختلف اور باہم متضاد نظاموں کے درمیان بھی، کسی جزئی یا ادنیٰ سی مشابہت کا پایا جانا عین ممکن ہے۔ مثلاً اسلام اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں، شخصی ملکیت کے اصول کا ہونا، قدرِ مشترک ہے، لیکن اس مماثلت کے باوجود بھی، اور باعث بھی، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں نظاموں میں نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی یکساں ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کسی نظام نے، دوسرے نظام سے، نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی لیے ہیں۔ ایسی ہی ایک جزوی سی مماثلت، اسلام اور اشتراکیت میں بھی موجود ہے کہ دونوں میں سود کی نفی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں نظاموں میں سود کی عدم موجودگی سے، اگر کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ دونوں میں نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی ایک سے ہیں، یا یہ کہ ایک نظام نے، دوسرے سے نظریات یا تنظیمی پروگرام بھی لے لیے ہیں، تو یہ استنتاج خلافِ حقیقت ہوگا، کیونکہ دنیا میں آج جتنے بھی نظام پائے جاتے

ہیں، ان میں کسی نہ کسی پہلو سے کسی خفیف یا ادنیٰ سی مماثلت کا پایا جانا عین ممکن ہے، خود پرویز صاحب ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"آپ جو معاشی نظام بھی وضع یا اختیار کریں گے، اس کے کچھ گوشے ایسے ضرور ہوں گے جو دیگر معاشی نظاموں کے بعض گوشوں سے ملتے جلتے ہوں گے، (اور ایسا اسلامی نظام میں بھی ہوگا۔) اس قسم کی جزوی مماثلت، کسی نظام کو، اس کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات سے محروم نہیں کر دیتی۔" ❶

اس تمہید کے بعد، اب "مفکرِ قرآن" کے عدل و دیانت کے منافی، اس رویہ کی مثال ملاحظہ فرمایئے، جس میں مولانا مودودیؒ کی ایک ادھوری عبارت سے، ایسا ہی ایک قطعی غلط نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ، مولانا مودودی کے ایک کتابچہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" کا یہ اقتباس، طلوع اسلام میں درج کرتے ہیں:

"اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرہ کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے، اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو، اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالتا ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی شخص، اپنے کسی معاملہ کو، پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ، فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی)۔" ❷

اس کے بعد، "مفکرِ قرآن" صاحب، وہی "اکثریت و اقلیت" والا اقتباس درج کرتے ہیں:

"ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، وہ انہیں اطمینان دلاتے ہیں اور کہتے ہیں... "جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جان دار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں، اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد، اس وقت

---

❶ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۰ ❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۵ تا ۲۶

صرف ۳۲ لاکھ ہے، اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کے وقت صرف تین لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد، ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی، یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ ...

(ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، صفحہ ۲۸)'' ❶

اس کے بعد ''مفکر قرآن'' مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف، انتہائی اوچھا، گھٹیا، گھناؤنا اور اشتعال انگیز استدلال بایں الفاظ کرتے ہیں:

''آپ نے غور فرمایا، کہ اس تحریک نے کس طرح اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام، یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا ہے۔'' ❷

حالاں کہ مولانا مودودیؒ نے ہندوستان میں بسنے والی ''امت مسلمہ'' کو ''اکثریت اور اقلیت'' والے اقتباس میں یہ فہمائش کی ہے کہ اگر تم اپنے ایمان وعقیدہ، اور اصول واقدار کے مطابق، ایک جماعت (نہ کہ قوم) بن کر اٹھو گے تو تم نازیوں، فاشسٹوں اور کمیونسٹوں کی طرح، قلیل التعداد ہونے کے باوجود بھی، غالب رہو گے، اور اسلامی نظریۂ سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے، یہ بتایا ہے کہ اساس و بنیاد سے لے کر، اوپر تک کی پوری عمارت، جو بصورتِ ریاست، اسلام نے قائم کی ہے، دنیا کے ہر نظام کی قائم کردہ ریاست سے مختلف ہے، تاہم پھر بھی بعض گوشوں میں فاشسٹی اور اشتراکی حکومتوں سے اسے ایک گونہ مماثلت حاصل ہے، اور یہ گوشہ ہائے مماثلت، ان سب ریاستوں میں، ایجابیت اور ہمہ گیری کے گوشے ہیں، جیسا کہ اسلامی ریاست کی خصوصیات میں سے ''ایجابی اور ہمہ گیر ریاست'' کے عنوان سے، مولانا مودودیؒ کا درج ذیل اقتباس واضح کر رہا ہے:

(الف) ایجابی اور ہمہ گیر ریاست: ...... ''ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن، جس ریاست کا تخیل پیش کر رہا ہے، اس کا مقصد سلبی

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۶ ❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۶

(Negative) نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت کرے، اور مملکت کو بیرونی خطروں سے بچائے، بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے، جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا ہے اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایت میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع و محل، سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام لائے جائیں گے، اور اجتماعی اثر اور رائے عامہ کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

اس نوعیت کی ریاست ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتی، یہ ہمہ گیر ریاست ہے، اس کا دائرۂ عمل، پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں، کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا، اس لحاظ سے یہ ریاست فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہے۔"[1]

اس کے بعد، "مفکر قرآن" نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت، مندرجہ ذیل جملوں کو (جو مولانا مودودیؒ کے پیش کردہ اقتباس کے ساتھ ہی درج ہیں) حذف کر دیا ہے، کیونکہ ان فقروں کی موجودگی میں یہ "ثابت" نہیں کیا جا سکتا کہ ...... "مودودیؒ کی تحریک نے اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام، یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا ہے" ...... از راہ کرم، مندرجہ بالا اقتباس کے ساتھ ملا کر، ان جملوں کو بھی پڑھ لیجیے:

"مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس ہمہ گیریت کے باوجود، اس میں موجودہ زمانے کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) ریاستوں

[1] اسلام کا نظریہ سیاسی، صفحہ ۳۲، اسلامی ریاست، صفحہ ۱۳۵

کا سا رنگ نہیں ہے، اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی، اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں، جو کمال درجہ کا اعتدال، اسلامی نظامِ حکومت میں قائم کیا گیا ہے، اور حق اور باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام، حقیقت میں خدائے حکیم وخبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔"❶

حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص، جس کا سینہ، کدورت وکینہ سے پاک ہو، نگاہوں پر تعصب کی عینک نہ ہو، مزاج عادلانہ اور بے لاگ ہو، ٹیڑھی نہ ہو، تو وہ مولانا مودودیؒ کی زیر بحث عبارات میں کوئی عیب وسقم نہ پائے گا، اور اس سے وہ نتیجہ کشید نہ کر پائے گا جو "مفکر قرآن" صاحب نے کشید کر ڈالا ہے۔

یک گونہ مماثلت اور مطلق مماثلت:

مولانا مودودیؒ نے، اسلامی ریاست کی، فاشستی اور اشتراکی ریاستوں کے ساتھ جو مماثلت بیان کی ہے، وہ محض "یک گونہ مماثلت" ہے، لیکن خود "مفکر قرآن" نے اشتراکی نظام اور اپنے خود ساختہ "قرآنی نظام" میں، جو قدرِ مشترک بیان کی ہے، وہ عام اور مطلق مماثلت ہے، جو کسی قید وصف سے مقید، یا کسی شرط سے مشروط نہیں ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

"جہاں تک کیمونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے۔"❷

ہمارے "مفکر قرآن" نے بھی کیا دہرے معیار قائم کر رکھے ہیں، آپ اپنے لیے، اور ایک مولانا مودودیؒ کے لیے۔ سید مودودیؒ محض "یک گونہ مماثلت" کا ذکر کریں، تو ان پر یہ الزام عائد ہو جاتا ہے کہ ان کی تحریک نے نظریاتی اور تنظیمی پروگرام، سب یورپی تحریکوں سے مستعار

❶ اسلام کا نظریہ سیاسی، صفحہ ۳۳ / اسلامی ریاست، صفحہ ۱۳۵ ❷ نظام ربوبیت، صفحہ ۳۵۸

لیے ہیں، لیکن اگر وہ خود مطلق مماثلت کی بات کریں تو ان پر نہ صرف یہ کہ کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، بلکہ نظریاتِ قرآن اور نظریاتِ اشتراکیت میں بعد المشرقین برقرار رہتا ہے، اور اس مطلق مماثلت کے باوجود بھی، دونوں انتہاؤں کے فلسفۂ حیات (نظریات) باہم متضاد اور متناقض ہی رہتے ہیں، اور اشتراکیت کا فلسفۂ حیات (نظریات) "قرآنی نظام" کی طرف، اس طرح منتقل نہیں ہوتا، جس طرح محض یک گونہ مماثلت کی بنا پر، فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نظریات، مودودیؒ صاحب کی برپا کردہ اسلامی تحریک میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

> "سوشلزم کا معاشی نظام، تو قرآن کے معاشی نظام کے متماثل ہے، لیکن سوشلزم کا فلسفہ، قرآنی فلسفۂ حیات سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ اس کی ضد ہے۔" ❶

حقیقت یہ ہے کہ کسی کی تحریر سے، ذہنی چابک دستی کی بنا پر، عامۃ الناس کو دھوکہ دینے کے لیے، ادھورے اقتباس پیش کرنا، اور پھر غلط استدلال و استنتاج کرنا، اپنے اور دوسروں کے لیے الگ الگ اور دوہرے معیار قائم کرنا، نیز تولنے کے لیے، دوسروں کے لیے دو ترازو اور باٹ استعمال نہ کرنا، جو خود اپنے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ جھوٹ اور بددیانتی ہی کی صورتیں ہیں، جو کسی اور کے لیے مناسب ہوں یا نہ ہوں مگر "مفکر قرآن" کے تو شایانِ شان ہیں ہی۔

(۶) خیانت و بددیانتی کی چھٹی مثال:

"مفکر قرآن" نے مولانا مودودیؒ کی تحریک پر، پہلے تو یہ الزام تھوپا کہ انہوں نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیے ہیں، پھر اس دیوار الزام پر، ایک رڈا، یہ کہہ کر، اور چڑھایا:

> "ان پارٹیوں کی طرح، مودودی صاحب کے پیش نظر بھی، قوت کے ذریعے حکومت چھین کر، اپنا تسلط قائم کرنا تھا، چنانچہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے کہتے ہیں کہ ... "اسلام اپنے متبعین سے کہتا ہے کہ تم روئے زمین پر سب سے صالح

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۷

بندے ہو، لہٰذا آگے بڑھو، لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو، اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات، صفحہ ۲۴۵)" ●

....." خدا کے باغیوں، متمرد و سرکش لوگوں سے اقتدار چھین کر، جماعتِ مومنین کو دینا تا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم کریں" ..... کیا فی الحقیقت، اسلام کا مقصود و مطلوب اور تقاضائے دین اور مطالبۂ قرآن ہے یا نہیں؟ اسے تو فی الحال نظر انداز کیجیے، اور سب سے پہلے "مفکرِ قرآن" کے اس بہتان کو ملاحظہ فرمایئے کہ خطبات کے حوالے سے (خدا کے باغیوں سے لڑ کر، اقتدار چھیننے کی) جو بات کی گئی ہے، اُسے مولانا مودودیؒ نے اپنی جماعت کے افراد سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی۔ حالاں کہ یہ عبارت، جہاد کے موضوع پر، اُس خطبۂ جمعہ کا حصہ ہے، جو پٹھان کوٹ کی اردگرد کی بستیوں کے، اُن مسلم افراد کے سامنے پیش کیا گیا تھا، جو نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے، جمعہ کے یہ خطبات، اُس وقت کتابی شکل میں شائع ہوئے جبکہ جماعت اسلامی کی ابھی تاسیس و تشکیل ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس لیے اپنی جماعت کے افراد سے یہ بات کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس وقت، نہ جماعت تھی، اور نہ ہی اس کے ارکان۔ خود طلوعِ اسلام، یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کی بنیاد، ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو رکھی گئی تھی، اور کتاب "خطبات" پر "نقد و تبصرہ" کے زیرِ عنوان، خود طلوعِ اسلام ہی یہ لکھتا ہے:

"جس زمانہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مدیر ترجمان القرآن، کا قیام، دار الاسلام (پٹھان کوٹ) میں تھا، وہ، وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔" ●

مودودیؒ صاحب کا قیام، دار الاسلام (پٹھان کوٹ) میں کس زمانہ میں تھا، خود پرویز صاحب، بعنوان "دار السلام" لکھتے ہیں:

"ابھی اس سکیم کا پورا نقشہ بھی مرتب نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت علامہ دنیا سے تشریف لے گئے اور دار الاسلام ایک جسدِ بے روح بن کر رہ گیا۔ دار الاسلام کے

● طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۶ ● طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۷

لیے یہی حادثہ کچھ کم جانکاہ نہ تھا کہ اس کے بعد ایک دوسرا حوصلہ شکن واقعہ رونما ہو گیا، مودودی صاحب حیدر آباد سے ایک سکیم اپنے ذہن میں لائے تھے، جب دونوں اسکیمیں عملی لحاظ سے، ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو معلوم ہوا کہ ان کی سکیم، دارالسلام کی اسکیم سے کچھ مختلف تھی، اور چونکہ وہ دارالاسلام کے موجودہ قالب میں ڈھل نہیں سکتی تھی، اس لیے مولانا صاحب، دارالاسلام چھوڑ کر، لاہور تشریف لے گئے۔''❶

طلوع اسلام کی یہ تحریر اگست ۱۹۳۹ء کی تحریر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگست ۱۹۳۹ء سے قبل، مولانا مودودیؒ، دارالاسلام سے لاہور منتقل ہو چکے تھے، لیکن وہ اس جگہ آئے کب تھے؟ مولانا مودودیؒ کی یہ عبارت، جو طلوع اسلام ہی سے ماخوذ ہے، اس سوال کا جواب بایں الفاظ دیتی ہے:

''یہ صحیح ہے کہ انہی (یعنی علامہ اقبالؒ) کی تحریک وترغیب پر، میں حیدر آباد (دکن) سے دارالاسلام (مشرقی پنجاب) منتقل ہوا تھا، مگر افسوس کہ جس مہینے میں دارالاسلام پہنچا اُس کے دوسرے ہی مہینے علامہ مرحوم کا انتقال ہو گیا۔''❷

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ، دارالاسلام میں مارچ ۱۹۳۸ء میں آئے تھے، کیونکہ ان کی آمد کے دوسرے ہی مہینے (یعنی ۲۱ اپریل ۳۸ء کو) علامہ اقبال فوت ہو گئے تھے، اور اگست ۱۹۳۹ء سے پہلے وہ لاہور چلے گئے تھے، ان کے خطبات جمعہ مسجد دارالاسلام میں، اسی دوران (مارچ ۱۹۳۸ء تا اگست ۱۹۳۹ء) پیش کیے گئے۔ اور یہ سلسلۂ خطبات، سب سے پہلے کتابی شکل میں رمضان ۱۳۵۹ھ بامطابق نومبر ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا تھا، جیسا کہ خود مولانا مودودیؒ نے، اسی کتاب کے طبع ہشتم کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''میرے خطبات کا یہ مجموعہ سب سے پہلے نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔''❸

---

❶ طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۵
❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۴
❸ خطبات، دیباچہ طبع ہشتم، صفحہ ۸

اس سے ظاہر ہے کہ نہ اس وقت، جماعت اسلامی کا وجود تھا، اور نہ ہی جماعت کے وہ ارکان اپنا وجود رکھتے تھے جنہیں مولانا مودودیؒ، جاہلیت کے علم برداروں اور خدا کے باغیوں کے ہاتھوں سے، اقتدار کی باگ ڈور چھین کر، خدا کے نیک بندوں کے ہاتھوں میں تھما دینے کی تلقین فرما رہے تھے۔

"عبارات کو نفسی پس منظر سے کاٹ کر، انہیں خود ساختہ موقع و محل سے وابستہ قرار دینا، تاکہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ پر بہتان تراشتے ہوئے، لوگوں کو دھوکہ اور فریب دیا جا سکے، "مفکر قرآن" کی "قرآنی خدمت" اور ان کے "قرآنی طرز عمل" کا ایک مستقل حصہ ہے۔"

فاشسٹ عزائم ...... سلب اختیار:

اب آیئے، "خطبات" کی محولہ بالا اس عبارت کی طرف، جس میں سید مودودیؒ نے "اقتدار چھین لینے" کی بات کی ہے، اس عبارت میں سے "مفکر قرآن" کی ناک، "فاشسٹ عزائم" کی بو سونگھ کرتی تھی، اور وہ اسے نشانہ اشتعال بنا کر، حکومت پاکستان کے ارباب بست وکشاد کو، مولانا مودودیؒ کے "فاشسٹ عزائم" سے ہمیشہ خبردار کیا کرتے تھے کہ وہ اور ان کی جماعت، تمہارا اقتدار چھین لینے کے درپے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا ہے؟ کیا وہ کوئی اپنا نظام فکر و عمل رکھتا ہے جسے وہ نافذ دیکھنا چاہتا ہے؟ یا وہ سرے سے کوئی ضابطہ فکر اور نظام زندگی رکھتا ہی نہیں؟ وہ لوگوں کو خود اپنے نظام حیات کی مشینری چلانے کے لیے تیار کرنا چاہتا ہے؟ یا وہ، دوسروں کی مشینوں کا کل پرزہ بننے کے لیے، انہیں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟ کیا وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لفظی طور پر حق کو حق مان لینے کے اعتراف پر اکتفا کیا جائے، اور اسے بالفعل نافذ کرنے کی نیت تک نہ کی جائے؟ یا یہ مطالبہ کرتا ہے کہ حق کو حق مان کر اسے دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد بھی کی جائے؟ کیا اس کے نزدیک یہی کافی ہے کہ باطل کے باطل ہونے کے قولی اعتراف پر اکتفا کیا جائے؟ یا وہ اپنے پیرووں پر یہ فریضہ بھی عائد کرتا ہے کہ باطل کو نیچا دکھانے کے لیے دنیا کے آخری کونے تک اس کا تعاقب بھی کیا جائے؟ کیا اس کی خواہش بس یہی ہے کہ کلمہ طیبہ کا ورد ہونٹوں پر سجا کر، ہر نظام باطل کی چاکری کی جاتی رہے؟ یا وہ یہ فرض عائد کرتا ہے کہ

باطل اور جاہلیت کا سر کچل کر، اقتدار، دین اسلام کے حوالے کر دیا جائے؟

اگر دل میں کوئی چور نہ ہو، تو ہر شخص، جو اسلام کے مقصد و مشن سے واقف ہے، مولانا مودودیؒ کی زیر نظر عبارت میں، نہ صرف یہ کہ کوئی نقص نہ پائے گا، بلکہ اسے عین تقاضاءِ اسلام قرار دے گا۔ فی الواقعہ، اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ خدا سے پھرے ہوئے لوگوں سے اقتدار سلب کر کے، ان بندگانِ خدا کے ہاتھوں میں دیا جائے، جو خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم کرنا اور پھر اسے غالب رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ ایسا نہ کبھی ہوا، اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگا کہ باطل کے علم بردار، از خود اقتدار پلیٹ میں سجا کر اہل حق کی خدمت میں پیش کر دیں، لامحالہ یہ کام طویل کشمکش اور لڑائیوں کے مراحل سے گزر کر ہی ہوگا۔ اسی لیے تو اسلام، اپنے پیرؤوں سے یہ پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ "تم (علم بردارانِ باطل سے) لڑو، یہاں تک کہ فتنہ کا گھاٹ اتر جائے، اور دین سارے کا سارا، اللہ ہی کے لیے ہو کر رہ جائے" ﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ﴾ (الانفال:۳۹)

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند:

اب اگر خدا کے باغیوں کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر، اہل ایمان کے ہاتھوں میں دے دینا، جرم ہے، خلافِ اسلام ہے، اور اس سے "فاشسٹ عزائم" کی بُو آتی ہے، تو یہ جرم تنہا مولانا مودودیؒ ہی نے نہیں کیا، بلکہ "مفکر قرآن" خود بھی، یہ کہہ کر، اس کا ارتکاب کر چکے ہیں:

> "اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ دنیا بھر کے سرکش اور متمرد انسانوں سے، قوت و حکومت چھین کر، جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دے دی جائے۔"●

ہمارے "مفکر قرآن" نے بھی کیا دہرے معیار قائم کر رکھے ہیں، ایک بات اگر مولانا مودودیؒ کہیں، تو اس میں سے "فاشسٹ عزائم" کی بُو آنے لگ جاتی ہے، لیکن اگر وہی بات، وہ خود کہیں، تو وہ اسلام میں دین کا تصور قرار پا جاتی ہے، سید مودودیؒ اگر محض "یک گونہ مشابہت" کی بات کریں، تو ان پر یہ الزام عائد ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تحریک کے لیے نظریات اور

● معارف القرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۹۱، جوئے نور، صفحہ ۴۹

پروگرام، یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیے ہیں، لیکن اگر وہ خود، اشتراکیت کے ساتھ، اپنے خودساختہ "قرآنی نظام" کی عام اور مطلق مماثلت کی بات کریں، تو وہ اس قسم کے ہر الزام سے بالاتر ہی رہتے ہیں۔

تمہاری زلف میں پہنچی، تو حسن کہلائی
وہ تیرگی، جو مرے نامۂ سیاہ میں تھی

یہ "مفکرِ قرآن" صاحب کے دُہرے معیار کی صرف دو مثالیں ہیں، جو موضوعِ بحث کی مناسبت سے ارتجالاً نوکِ قلم پر آگئی ہیں۔ آگے چل کر "ناپ تول کے دُہرے معیار" کے باب میں باقی مثالیں مذکور ہیں۔

اور ہاں! یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ "خطبات" نامی جس کتاب کی عبارت سے "مفکرِ قرآن" کو "فاشسٹ عزائم کی بُو آئی ہے، وہ نومبر ۱۹۴۰ء میں چھپی تھی۔ لیکن اُس وقت، اس عبارت سے انہیں کوئی بُو نہیں آئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد، جب "مفکرِ قرآن" صاحب نے اشتراکیت کا چشمہ پایا، اور ان کی سمتِ قبلہ تبدیل ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی مودودیؒ صاحب کی مخالفت، ان کا مشن ٹھہری، اور اُن سے خدا واسطے کا بیر، دشمنی اور عداوت، ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر گئی، تو اشاعتِ کتاب کے ۳۰ سال بعد، (۱۹۷۰ء میں) اُن کی قوتِ شامہ یکا یک بڑھ گئی، اور انہیں، اس عبارت سے مودودیؒ صاحب کے "فاشسٹ عزائم" کی بُو آنے لگی، بالکل اسی طرح، جس طرح ۳۰ نہیں بلکہ ۳۰ صد فیٹ کی بلندی پر پرواز کرتی ہوئی گدھ کو زمین پر پڑے ہوئے مردار کی بُو آجاتی ہے، حالاں کہ یہی وہ کتاب تھی، جس کی تعریف و مدحت میں، کبھی طلوعِ اسلام نے یہ بھی لکھا تھا:

"جس زمانہ میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مدیر ترجمان القرآن کا قیام، دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں تھا، وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، دارالاسلام، پنجاب کے ایک دورافتادہ ضلع میں واقع ہے، جہاں مسلمانوں میں جہالت عام ہے، اس لیے ضرورۃً سید صاحب کو سلیس زبان میں عام فہم مسائل کو

بیان کرنا ہوتا تھا، اب انہوں نے ان خطبات کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ کام کی چیز بن گیا ہے، سید صاحب کی تحریر میں متانت اور طریق استدلال میں سنجیدگی ہوتی ہے، یہ خصوصیات، ان خطبات میں بھی موجود ہیں جو اسلام کے مبادیات کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں، ان کے ساتھ کہیں کہیں وہ غلو اور تشدد بھی موجود ہے، جو سید صاحب کے انداز کی ایک اور خصوصیت ہے۔" ❶

کل تک مودودیؒ صاحب کا غلو اور تشدد بھی، ان کی ایک قابل تحسین خصوصیت تھا، لیکن آج جب ذہن پرویز بدلا تو مودودیؒ صاحب کی صحیح عبارت سے بھی "فاشست عزائم" کی بو آنے لگ گئی۔

(۷): خدع وفریب کی ساتویں مثال:

امت مسلمہ کی نکبت وزبوں حالی کے اس دور میں، جہاں عامۃ الناس پر زوال وادبار کی گھٹا ئیں چھائی ہوئی ہیں، وہاں علمائے امت بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ اسی معاشرے کا ایک طبقہ ہونے کی بنا پر، وہ بھی انحطاط وپستی کا شکار ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے کلام میں، کہیں عام اہل اسلام کی گراوٹ کا ذکر کر کے، ان کی اصلاح کی کوشش فرمائی ہے، اور کہیں علمائے امت کی پستی پر آنسو بہاتے ہوئے، انہیں بہتری پر اکسایا ہے۔ کہیں اسلام کی عالمگیر اخوت کو نظر انداز کر کے فرقہ بندی کی تنگ وتاریک تنگنائیوں میں امت مسلمہ کو محبوس کر ڈالنے پر، انہیں سرزنش کی ہے، اور کہیں بے جا بحث وجدال میں ملوث ہونے پر، انہیں نشانہ بنایا ہے، اور اس بات کا گلہ کیا ہے کہ جن علماء کو اپنے دور کا قائد ہونا چاہیے وہ اپنے زمانے کے پیروکار بن چکے ہیں۔ اور فقہی موشگافیوں کے باعث، چھوٹے چھوٹے معاملات میں تکفیری سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ علماء امت کی اسی حالت پر علامہ مرحوم یہ فرماتے ہیں کہ:

دین حق از کافری رسوا تر است ۔۔۔ زانکہ ملا مومن کافر گر است

شبنم ما در نگاہ ما یم است ۔۔۔ از نگاہ او یم ما شبنم است

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۷

"یعنی دینِ حق، آج، کفر سے بھی زیادہ رسوا ہو چکا ہے، کیونکہ ہمارا ملّا، ایک کافر گر مومن ہے۔ (وہ اس قدر تنگ نظر ہے کہ) ہماری نگاہ میں ہماری شبنم بھی سمندر ہے، لیکن اس کی نگاہ میں ہمارا سمندر بھی شبنم ہے۔"

جاوید نامہ کے ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے سینہ میں، مولانا مودودیؒ کے خلاف حسد و کینہ کی آگ، دفعتاً بھڑک اٹھتی ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے یہ اشعار، مولانا مودودیؒ کے خلاف کہے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے، ان کا یہ اقتباس:

"اس دوسرے شعر پر غور کیجیے کہ کیا ملّا کی ساری عمر اسی "جہاد" میں نہیں گزر جاتی کہ وہ اپنے اور اپنے حواریوں کے سوا، مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ان کی ہنسی اڑائے، انہیں ذلیل سمجھے، اور اپنے آپ کو صالحین میں شمار کرے۔ ان کے متعلق وہ یہاں تک بھی کہہ دے کہ ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔" (تنقیحات، ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۷۲)

مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ اس وقت کہا جا رہا تھا جب ہندوستان میں مسلمان، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندو کی پوری کوشش تھی کہ سارے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما کر، مسلمان کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دے۔ اس کے خلاف تحریک پاکستان کے حامیوں کی کوشش تھی کہ ایک جداگانہ خطۂ زمین مل جائے، جو مسلمانوں کے تحفظ کا ذریعہ بن جائے۔ عین اس کشمکش کے زمانے میں، ملّا کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ یہ تحریک سراسر خلافِ اسلام ہے۔ مردم شماری کے رجسٹر کا یہ پیدائشی مسلمان باقی رہے یا مٹ جائے، اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ تھے وہ تاثرات، جن کے تحت، اس مردِ مومن نے با چشمِ نم کہا تھا کہ:

شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است   از نگاہِ او یمِ ما شبنم است [1]

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۰

"بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن" کے اصول سے تمسک اختیار کرتے ہوئے "مفکر قرآن" صاحب نے، جس دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے، خیانت و بددیانتی کا ارتکاب کیا ہے، ابلیس کے پاس تو شائد اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہوگا۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جو اقتباس، "مفکر قرآن" صاحب نے پیش فرمایا ہے، وہ ان کی کتاب "تنقیحات" سے ماخوذ ہے، جس کا پہلا ایڈیشن علامہ اقبال کی وفات کے تقریباً سوا سال بعد، ۱۹۳۹ء میں چھپا تھا۔ تاہم جس مضمون سے "مفکر قرآن" نے یہ جملہ پیش کیا ہے، وہ ترجمان القرآن کے مئی ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں بھی چھپ چکا تھا۔ اور دوسری طرف "مفکر قرآن" نے علامہ اقبال کے جن اشعار کو مولانا مودودیؒ کی تردید و مذمت میں پیش فرمایا ہے وہ "جاوید نامہ" سے مقتبس ہیں، جو سن ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والا، ان کا فارسی کلام ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال کے یہ اشعار، مولانا مودودیؒ کے اقتباس کے ترجمان القرآن میں شائع ہونے سے چار سال قبل اور کتابی شکل میں ڈھلنے سے سات سال قبل اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ جس وقت، علامہ مرحوم نے "شبنم بادر نگاہِ مایم است   از نگاہِ اوریم ماشبنم است" کہا تھا اس وقت مولانا مودودیؒ کے قلم سے یہ الفاظ برآمد ہی نہیں ہوئے تھے پھر اسے کس طرح مولانا مودودیؒ کی تردید و مخالفت میں پیش کیا جاسکتا ہے؟

مزید برآں اگر علامہ اقبال، مولانا مودودیؒ کو واقعی ایک قابلِ مذمت ملاّ سمجھتے تو انہیں، حیدرآباد دکن کو چھوڑ کر دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں خدمتِ اسلام کے لیے ہجرت کی دعوت ہی کیوں دیتے؟

جس مفکر کی دیانت و امانت اور عدل و انصاف کا یہ عالم ہو کہ وہ محض اپنے جذباتِ حسد و کینہ کی تسکین کے لیے، مصنفین کی عبارتوں کو زمانی سیاق و سباق سے کاٹ کر، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کرتب دکھا رہا ہو، اس کی "تفسیرِ قرآن" جس قدر و قیمت کی حامل ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ، اربابِ فکر و نظر اور اہل علم حضرات بخوبی کر سکتے ہیں۔

باب ۵

جھوٹے الزامات، افتراءات، بہتانات

دروغ گوئی کی مختلف و متنوع اشکال و صور میں سے ایک صورت، تہمت طرازی اور بہتان تراشی کی بھی ہے، اس پہلو سے ''مفکر قرآن'' صاحب کی ناوک افگنی سے نہ معاصر علماء بچے ہیں، اور نہ ہی سلف صالحین، حتّٰی کہ خود رسول اللہ ﷺ اور کتاب اللہ تک ان کی تیراندازی سے محفوظ نہ رہے۔ چند مثالوں کو نہایت اختصار سے پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱): معاصر علماء کے خلاف بہتان تراشی:

بغیر کسی حوالہ و سند کے، ''مفکر قرآن'' صاحب، محض اپنے جی سے گھڑ کر علماء کے خلاف، یہ الزام تراشی کرتے ہیں، کہ ان کے نزدیک عدالتی گواہوں کا باریش ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن کریم نے شاہد (گواہ) کے لیے صرف ''صاحب عدل'' ہونے کی شرط عائد کی ہے اور اس باب میں، اس کی وسعت نظر کا یہ عالم ہے کہ غیر مسلموں کی شہادت تک کو قابل قبول قرار دیتا ہے (۵/۱۰۶)، لیکن مولوی صاحب ہیں کہ اس کے لیے داڑھی تک کی شرط بھی لائینفک قرار دیتے ہیں۔ ❶

حرام ہے، جو ''مفکر قرآن'' کہیں یہ بتا ئیں کہ مولوی صاحبان کے اس فرمان کا ماخذ کیا ہے؟ کس عالم دین نے ایسا کہا؟ کہاں اس نے یہ فتویٰ دیا؟ بس ایک الزام خود اپنے جی سے گھڑا اور علماء کی طرف منسوب کر ڈالا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ چوری اور سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، الٹا علماء ہی کو یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے:

جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں، اس کی تردید کے لیے چونکہ ہمارے قدامت

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵

پسند طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتے، اس لیے وہ خود بھی مشتعل ہوتے ہیں، اور عوام کو بھی مشتعل کرتے ہیں۔"❶

اگر "مفکر قرآن" صاحب کے اکاذیب واباطیل کا نام "دلائل و براہین" ہے، تو آخر ان "قرآنی دلائل" کا کوئی کیا جواب دے سکتا ہے، ماسوا اس جواب کے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونِ کذاب کے مقابلہ میں دیا تھا کہ:

﴿ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ ﴾ [المومن:۲۷]

"میں پناہ چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی، جو میرا بھی اور تمہارا بھی رب ہے، ہر اس متکبر شخص (کے شر) سے، جو یوم حساب (آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا۔"

پھر "مفکر قرآن" کا علماء کرام سے ہمیشہ یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ "میرے موقف کو خود میری تحریروں سے پیش کرو"، لیکن وہ خود کو، اس پابندی سے بالاتر سمجھتے ہیں، اور یہ شیوہ اپناتے ہیں کہ بغیر کسی مستند حوالے کے جو کچھ چاہیں، اسے علماء کی طرف منسوب کر ڈالیں۔

یہاں، "مفکر قرآن" نے، اس بہتان تراشی کے علاوہ ایک اور بھی گھٹیا حرکت کی ہے، شہادت کے لیے داڑھی کے شرطِ لازم ہونے کو، انہوں نے ایوبی دور میں، منسوب الی العلماء کیا تھا۔ چنانچہ وہ صدر ایوب خاں کو اس شرط کے حوالے سے یوں اشتعال دلاتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ اس شرط کی رو سے اور تو اور، مملکتِ پاکستان کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں قرار پا سکتی، جس مملکت کا صدر بھی (مولوی صاحبان کے فتویٰ کی رو سے) معتبر قرار نہ پائے، اس مملکت کا خدا حافظ۔"❷

اور اس قرآن کا بھی خدا حافظ، جس کی تفسیر لکھنے والے جھوٹے اور بہتان تراش "مفکر قرآن" ہوں۔

---

❶ طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۶

❷ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۱۵

(۲): علماء کرام پر دوسرا بہتان:

''مفکرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب نے، علماء کرام پر، دوسرا بہتان ان الفاظ میں باندھا ہے:

''کتاب اللہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معاذ اللہ ناقص ہے، نا تمام ہے، نا مکمل ہے، مبہم ہے۔''❶

امر واقعہ یہ ہے کہ جیسا الزامِ اول بے بنیاد ہے، ویسا ہی یہ الزام بھی بے اصل ہے کہ کتاب اللہ، ناقص، نا تمام اور نا مکمل ہے۔ ''مفکر قرآن'' نے جس طرح پہلے الزام کو بغیر کسی سند و حوالہ کے پیش کیا ہے بالکل اسی طرح، اس الزام کو بھی، بغیر کسی ماخذ و مصدر کے بیان کیا ہے، معاصر علماء کرام تو رہے ایک طرف، متقدمین میں سے بھی، کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ قرآن مجید، ناقص، نا تمام اور نا مکمل کتاب ہے۔ دراصل اس بہتان کا سرچشمہ، اگر کہیں وجود رکھتا ہے، تو وہ پرویز صاحب کا اپنا ذہن ہے۔ اور جو چیز، ان کے مخصوص ذہنی سانچے میں ڈھل نہیں سکتی تھی، اسے وہ ''اپنی بصیرت'' کی روشنی میں ''خلافِ قرآن'' قرار دے کر، بہتاناً علماء کرام کی طرف منسوب کر ڈالا کرتے تھے، علماءِ کرام، قرآن کے بعد، سنتِ رسول کو بھی حجت و سند تسلیم کرتے ہیں۔ اور پرویز صاحب، صرف قرآن ہی کو بظاہر ایسا مانتے ہیں، اور سنت کو ادلۂ شرعیہ میں شامل نہیں کرواتے، یہ چیز، جب ان کے ذہنی سانچے میں ڈھل کر برآمد ہوتی ہے تو وہ لوگ، جو قرآن و سنت دونوں کو حجت مانتے ہیں، ان کے خلاف اس الزام کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ علماء کرام، قرآن کو ناقص، نا تمام اور نا مکمل قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے تو سنت کو ساتھ ملا کر وہ قرآن ناقص و نا تمام کی تکمیل کرتے ہیں۔

''سنت کی آئینی حیثیت'' پر قلمی مناظرہ کے دوران، اسی اعتراض کو منکرینِ حدیث کی نمائندگی کرتے ہوئے، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے، مولانا مودودیؒ کے سامنے، بایں الفاظ پیش کیا تھا:

---

❶ طلوع اسلام، اگست ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۵

''مجھے آپ سے سو فیصد اتفاق ہے کہ حضور معلم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی، اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ! لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ ''تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے''۔ بے شک حضورؐ نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی، لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) ناکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا اُس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی، میرے لیے ناقابل فہم ہے۔'' ●

ذرا اور آگے چل کر، ڈاکٹر عبدالودود صاحب، فرماتے ہیں:

''نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے، کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے؟ جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے۔'' ●

اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) نے دورِ حاضر کی علمی سطح کو پیش نظر رکھ کر اس کا ایسا اطمینان بخش جواب دیا تھا، جو پیاسے کی سیرابی اور بیمار کی شفایابی کا ذریعہ ہے، لیکن اَلَدُّ الْخِصَام، ذہنیتوں پر اس کا وہی اثر ہوا، جو مشرکین عرب کی ذہنیتوں پر نزولِ قرآن سے ہوا تھا۔ ﴿ لَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ﴾ مولانا محترم نے فرمایا:

''ان فقروں میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو علم قانون کے ایک مسلّم قاعدے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ کو لاحق ہوئی ہے، دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کا اختیار اعلیٰ جس کو حاصل ہو، وہ ایک مجمل حکم دے کر، یا ایک عمل کا حکم دے کر، یا ایک اصول طے کر کے اپنے ماتحت کسی شخص یا

● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۳ ● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۴

ادارے کو اس کی تفصیلات کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے اختیارات تفویض کر دے تو اس کے مرتب کردہ قواعد و ضوابط، قانون سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتے بلکہ اسی قانون کا ایک حصہ ہوتے ہیں، قانون ساز کا اپنا منشا یہ ہوتا ہے کہ جس عمل کا حکم اس نے دیا ہے، ذیلی قواعد (Bye Laws) بنا کر اس پر عمل درآمد کا طریقہ (Procedure) مقرر کر دیا جائے، جو اصول اس نے طے کیا ہے اس کے مطابق مفصل قوانین بنائے جائیں، اور جو مجمل ہدایت اس نے دی ہے، اس کی منشا کو تفصیلی شکل میں واضح کر دیا جائے، اسی غرض کے لیے وہ خود اپنے ماتحت شخص یا اشخاص کو یا اداروں کو قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا مجاز کرتا ہے۔ یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل ابتدائی قانون کے ساتھ مل کر اس کی تکمیل کرتے ہیں، مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانون ساز نے غلطی سے ناقص قانون بنایا تھا، اور کسی دوسرے نے آ کر اس کا نقص دور کیا، بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصہ اپنے مقرر کیے ہوئے شخص یا ادارے کے ذریعہ سے مرتب کرا دیا۔"[1]

لیکن منکرین حدیث کچھ ایسے کج رو واقع ہوئے ہیں کہ آپ خواہ کتنے ہی واضح دلائل کے ساتھ ان کے شکوک و شبہات اور اعتراضات و اشکال کو زائل کر دیں، وہ پھر بھی اپنی کٹ حجتی پر قائم رہیں گے اور انہی شبہات و اعتراضات کو برابر پیش کرتے رہیں گے جن کا ازالہ کیا جا چکا ہے۔

منکرین حدیث کے دماغوں میں، مخالفتِ حدیث کا جذبہ کس قدر شدید ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جونہی علمائے کرام کی طرف سے، حدیث و سنت کی بات کی جاتی ہے، یہ لوگ فوراً، یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ "ہمارا ملا، قرآن کو، معاذ اللہ، ناقص و نا تمام قرار دیتا ہے، اور جب تک روایاتِ حدیث کو اس کے ساتھ نہ ملایا جائے، تو، اس کے نزدیک، دین مکمل نہیں ہوتا۔" لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ منکرین حدیث، خود قرآن کو غیر تام اور ادھورا تسلیم

---

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۷

کرتے ہیں، اور اس کی تکمیل، اُس وقت مانتے ہیں، جبکہ کسی "آنے والے مرکزِ ملت" کی طے کردہ جزئیات، شاملِ قرآن ہوں گی، کیونکہ بزعم اتباعِ قرآن، بجز اطاعتِ امامِ وقت، ضروریاتِ دین کے لیے کافی نہیں ہے، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

"دین کی ضروریات، قرآن کے اتباع اور امامِ وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔" ❶

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ منکرینِ حدیث کو ضد اور چڑ، جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اطاعتِ رسول کے حوالے سے ہے، ان کے خود ساختہ "مرکزِ ملت" کے حوالے سے نہیں ہے۔

کیا قرآنی آیات میں ابہام ہے؟

رہا الزام کا آخری حصہ، کہ قرآن مبہم ہے، تو اس کے ثبوت میں، "مفکرِ قرآن" صاحب نے، سورۃ البقرہ میں ذبحِ بقرہ اور قتلِ نفس کے واقعہ سے متعلق، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک عبارت پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ تفسیر تفہیم القرآن میں سے ایک اقتباس، زیرِ عنوان "مودودی صاحب کا قرآن پر اعتراض" کو خوب نمک اور مرچ مصالحہ لگا کر پیش کرتے ہیں:

"ہمارے دور کے مفسر، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں، سخت صدمہ ہوا ہے، ہمیں ان کے خیالات سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اختلاف کی صورت میں، ہمیں کسی قسم کا صدمہ تو ایک طرف، تاسف بھی نہیں ہونا چاہیے، لیکن جب کوئی ایسی بات سامنے آ جائے، جس سے (معاذ اللہ) خدا کی اس عظیم کتاب پر حرف آتا ہو تو اس سے ہمیں واقعی دلی افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ وہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:......

اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتا بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی "لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ

---

❶ مقامِ حدیث، صفحہ ۸۴

ابہام محسوس ہوتا ہے۔''...... ❶

ان الفاظ پر، اپنے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے ''مفکر قرآن'' صاحب رقم طراز ہیں:

''جس بات سے ہمیں صدمہ ہوا، وہ مودودی صاحب کے یہ الفاظ ہیں کہ...... ''اس غرض کے لیے، جو تدبیر بتائی گئی تھی، اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔''...... ❷

اس کے بعد، سید مودودیؒ کی طرف سے ''کافرانہ جسارتوں'' کے ساتھ، قرآن پر لگائے جانے والے، اس الزامِ ابہام پر، بڑے دلی صدمے اور افسوس کے ساتھ، یوں نقد وتبصرہ فرماتے ہیں:

''قرآن کے الفاظ میں ابہام...... معاذ اللہ ثم معاذ اللہ...... غیر مسلم تو اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے، لیکن کسی مسلمان سے قرآن کریم کے متعلق اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''❸

اس قسم کی خوردہ گیریوں کی مسلسل اشاعت، اور ایک ہی طرح کے الزامات و بہتانات کو، اعادہ و تکرار کے ساتھ، دائماً شائع کرتے رہنے سے قارئینِ طلوعِ اسلام کے قلوب واذہان میں ہر اُس شخصیت کے خلاف نفرت بلکہ شدید عداوت کا زہر بھر گیا، جس سے خود طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب نے اختلاف کیا۔ ایسی تحریروں نے مرزائیوں کی طرح یہاں ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جس کی ذہنی اور قلبی خصوصیات، نفرت اور انانیت ہیں، اس گروہ کے افراد کو اپنی ان خصوصیات پر فخر ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد، ان کا یہ پندار کہ وہی قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، عام مسلمانوں سے ان کی نفرت بالعموم، اور افرادِ جماعتِ اسلامی سے ان کی عداوت بالخصوص، ان کی حرکات وسکنات اور زبان وقلم سے ظاہر ہوتی رہتی ہے، یہ لوگ ''اعلم الناس بالقرآن'' کے زعم میں ایسی انانیت میں مبتلا ہیں کہ سلفاً خلفاً ساری امت کے علماء کو قرآن سے جاہل سمجھتے ہیں، اور خود کو قرآن کا واحد اجارہ دار گردانتے ہوئے، یہ دعوت دیتے ہیں کہ ''آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے۔''

❶ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۲۸ ❷، ❸ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۲۹

درحقیقت نفرت اور انانیت نفسیاتی عمل اور ردعمل کا نام ہے، اور یہ دونوں خصوصیات لازم وملزوم ہوتی ہیں۔ جب کوئی یہ سمجھنے لگ جائے کہ چودہ سو سالوں میں قرآن کا علم، پہلی مرتبہ، اب بے نقاب ہوا ہے، اور وہ بھی طلوعِ اسلام کی بدولت۔ اس کے علاوہ اور کسی بھی گوشہ سے آوازِ قرآن کا بلند ہونا تو کجا، الٹا ہر طرف سے اس آواز کو ختم کرنے پر ساری دنیا تلی گئی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ نفرت ہے، عوام سے نفرت اس لیے کہ وہ "عجمی اسلام" کے زیرِ سایہ، علمِ قرآن سے جاہل ہیں، اور علماءِ دین سے نفرت اس لیے کہ وہ بزعمِ طلوعِ اسلام "قرآنی تعلیمات" پر پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ نفرت اور انانیت جب حد سے بڑھ جائے، تو عدل وانصاف، حقیقت وصداقت، اور دیانت وامانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور پھر انسان اپنے مخالفین کے خلاف، جھوٹ، کذب، افتراء پردازی، تہمت طرازی، بہتان تراشی اور خدع وفریب پر اتر آتا ہے، اور اپنے مخالفین کے ہاں سے بال برابر بھی کوئی ناگوارِ خاطر چیز مل جائے، تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتا ہے، اس خصلتِ بد میں منکرینِ حدیث کے عروج وارتقا کا یہ عالم ہے کہ رائی کا پہاڑ بنانا تو رہا ایک طرف، وہ بغیر رائی کے بھی پہاڑ بنا ڈالنے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔

اس قسم کے جذباتِ رذیلہ یوں تو قوم کے ہر طبقہ میں تخریب انگیز ہوتے ہیں، لیکن جس قوم کے نوجوانوں اور (بالخصوص، دین سے دور) طلبہ کے دلوں کو اس طرح زہرآلود کر دیا جائے، اس قوم میں ہر طرف تخریب ہی تخریب پھیل جائے گی۔ قوموں کے مستقبل کا انحصار، ان کے نوجوانوں (بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ) پر ہوتا ہے، جس قسم کے قالب میں یہ طبقہ ڈھل جائے، اسی قسم کا، اس قوم کا مستقبل ہو جاتا ہے، بدقسمتی سے اس طبقہ کا ایک حصہ ایسا ہے، جو طلوعِ اسلام کے چنگل میں گرفتار ہے۔ اس طرح کے لوگ، باآسانی ان کی گرفت میں آ بھی سکتے ہیں، اس لیے کہ ایک تو یہ لوگ دین سے دور ہیں، دوسرے، جوانی کے دور میں جذبات کی شدت، انتہا پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے، اور پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام، قرآن کے نام پر جذباتِ نفرت ہی کو بھڑکایا کرتے ہیں، نتیجہ یہ کہ یہ لوگ، اپنے یک رُخے مطالعہ کی بنا پر، تمسر اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آ رہے تھے، جو طلوعِ اسلام کے لٹریچر نے ان پر چڑھا دیا ہے۔ خود فریبی، نفرت، تخریبی تنقید،

سرکشی، اور طرفہ یہ کہ ان چیزوں کو، قرآن کی راہ میں جہاد کرنے کی خود فریبی (سمجھنا)، ...... یہ ہیں اس طبقہ کی خصوصیات ...... مجھے ان خصوصیات کے پیکروں سے ملنے کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے، دورانِ گفتگو یہ لوگ بڑے جذباتی اور مشتعل ہو کر، اس طرح بحث کرتے ہیں کہ گویا وہی قرآن پر کامل عبور رکھتے ہیں اور مخاطبین کو تو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی، اور اگر ان کا مخاطب، سوءِ اتفاق سے کوئی باریش بزرگ ہو، تو نفرتِ ملاّ کا سارا زہر سمٹ کر، اُن کی آنکھوں میں جمع ہو جاتا ہے، اور انہیں یوں دیکھتے ہیں کہ گویا دنیا کی سب سے مبغوض اور قابلِ نفرت ہستی یہی صاحب ہیں، لیکن گفتگو، جب دورانِ بحث، انتہا کو پہنچ جاتی ہے، اور ان کے اعتراض کے جواب میں، مَیں طلوعِ اسلام ہی کے لٹریچر سے کوئی اقتباس پیش کر دیتا ہوں، تو اس وقت ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے، گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے اور سارا جوش ختم ہو جاتا ہے۔ احساسِ ندامت غالب آ جاتا ہے، اور حیرت سے بے ساختہ اس قسم کے کلمات، زبان سے جاری ہو جاتے ہیں کہ "اچھا! یہ بھی طلوعِ اسلام کے لٹریچر میں موجود ہے، لیکن حیرت ہے، جس چیز کا خود انہیں اعتراف ہے، دوسرے بھی اگر وہی چیز پیش کریں تو وہ اعتراض کر ڈالتے ہیں، کیسی عجیب بات ہے۔"

اتفاق سے ایک مرتبہ، چند ایسے ہی نوجوانوں سے اسی "ابہامِ آیاتِ قرآن" کے مسئلہ پر جب گفتگو ہوئی، تو ایک نوجوان نے بڑے جوشیلے اور جذباتی انداز میں "توبہ، توبہ، استغفراللہ، استغفراللہ، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، نقل کفر کفر نہ باشد" جیسے کلمات کے ساتھ، تفہیم القرآن کا یہی اقتباس پیش کیا، اس نوجوان کے دوسرے ساتھی بھی ایسے ہی کلمات کا اعادہ کر رہے تھے، اور کہہ رہے تھے: "کیا یہ لکھ ڈالنے کے بعد، مودودی صاحب، دائرۂ اسلام میں برقرار رہ گئے ہیں؟ کیا کسی کافر نے بھی ایسی جسارت کبھی کی ہے؟ اگر خود اللہ کی کتاب میں بھی ابہام پایا جا سکتا ہے تو پھر دنیا میں وہ کونسی کتاب ہے جو ابہام سے پاک ہو؟" الغرض، ہر شخص اپنی اپنی ہانکے جا رہا تھا، اور مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ جونہی میں زبان کھولتا، کسی نہ کسی طرف سے، پھر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی، سب کے اعتراضات کا ٹیپ کا بند یہ تھا کہ "مودودی صاحب نے بڑی ہی کافرانہ جسارت کی ہے، جو قرآن کے بارے میں یہ کچھ لکھ دیا ہے۔ میں

نے ان سب کی باتیں، صبر و تحمل سے سنیں، خاموشی سے اٹھا، اور پرویز صاحب کا درج ذیل اقتباس پیش کر دیا:

"یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ (یعنی قرآن) بجز ان جزئیات کے، جن کی تعیین، اس نے خود کر دی ہے، احکام کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے، تفصیل و تبیان کے معنی یہ نہیں کہ ہر حکم کی جزئیات و فروعات بھی متعین کر دی جائیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ بیان کیا جائے، کھول کر بیان کیا جائے، اصول بیان بھی، مجمل یا مفصل اور مبہم یا بیّن ہو سکتا ہے۔" ❶

اس کے بعد، میں نے تفصیل سے انہیں بتایا کہ اصطلاحِ فقہاء میں، مبہم سے کیا مراد ہے۔ خود پرویز صاحب نے مولانا مودودیؒ کی عبارت پر "معاذ اللہ ثم معاذ اللہ" کے الفاظ کی گردان کے ساتھ اعتراض تو جڑ دیا ہے مگر یہ ہرگز نہیں بتایا کہ مبہم کسے کہتے ہیں۔ بہر حال اس سے یہ واضح ہے کہ اس لفظ کا جو مفہوم، فقہاء کے ہاں، معلوم و معروف ہے، وہ پرویز صاحب کے مفہوم سے قطعی مختلف ہے، فقہاءِ امت نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر، پرویز صاحب کے استاذ، جناب اسلم جیراج پوری نے بھی کیا ہے، اور وہ اقتباس بھی پرویز صاحب ہی کی ایک کتاب میں موجود ہے، ملاحظہ فرمایئے:

"اس زمانہ میں، مصر کے نامور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد، پوری اسی عنوان پر لکھی ہے جو سب سے بہتر جامع اور دلکش تصنیف ہے، علیٰ ھذا اقسام القرآن، امثال القرآن، متشابہات القرآن، مبہمات القرآن بلکہ آیات، الفاظ اور حروفِ قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں، جس پر تصنیفیں نہ ہوں۔" ❷

چنانچہ یہ نوجوان نہ صرف یہ کہ لاجواب ہوئے بلکہ قلبی طور پر مطمئن بھی ہو گئے، اور انہوں نے اعتراف کیا کہ واقعی طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے یک رخے مطالعہ نے ان میں ایسا رویہ پیدا کر

---

❶ معارف القرآن، جلد چہارم، صفحہ ۶۲۸ ❷ معارف القرآن، جلد اول (مقدمہ)، صفحہ ۲۱

دیا ہے۔

(۳)علماءِ احناف پر بہتان:

ہمارے ملک میں امام ابوحنیفہؒ کے فقہی مذہب کے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، اس مسلک سے وابستہ افراد بھی اور دیگر لوگ بھی جنہیں فقہی خلافیات کا علم ہے، جانتے ہیں کہ ایک ہی مجلس میں، بیک وقت تین طلاقیں دینا، طلاق کا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے، لیکن طلوعِ اسلام جس کی یہ مسلسل روش رہی ہے کہ مسلمانوں میں موجود فقہی اختلافات کی آگ کو زیادہ سے زیادہ بھڑکایا جائے، تاکہ اس کی آڑ میں ''قرآنی فقہ'' کی راہ ہموار کی جا سکے، علماءِ احناف پر، یوں بہتان باندھتا ہے:

> ''ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر، عورت کو جدا کر دینا، حنفی علماء کے نزدیک، یہ طلاق دینے کا اسلامی طریقہ ہے۔'' ❶

علماءِ احناف پر، یہ صریح جھوٹ اور کھلی ہوئی تہمت اور واضح بہتان، طلوعِ اسلام نے اس مسئلہ سے ناواقفیت کے باعث نہیں لگایا، بلکہ لوگوں کے ذہنوں میں صرف یہ بات راسخ کرنے کے لیے جان بوجھ کر لگایا ہے کہ ضیاء الحق مرحوم کی نفاذِ اسلام کی کوشش کی ناکامی کی وجہ، پرویز صاحب کی ''قرآنی فقہ'' کی بجائے علماء کے فقہی قوانین کا نفاذ ہے۔ کیوں کہ اُن دنوں مرحوم صدر، دینی عالم نہ ہونے کے باوجود بھی، نفاذِ اسلام کی کوشش کر رہے تھے، اور طلوعِ اسلام کے لیے ایسی کاوش ہمیشہ سوہانِ روح رہی ہے، چنانچہ اس نے یہ شوشہ اچھالنے کے لیے کہ بیک وقت تین طلاق دینے کا مسئلہ اختلافی ہونے کے علاوہ، تقاضاءِ وقت سے ہم آہنگ بھی نہیں، علماءِ احناف پر یہ الزام عائد کر دیا ہے، کیوں کہ جھوٹ بولنے اور الزام تراشی کرنے میں، طلوعِ اسلام یا ''مفکرِ قرآن'' میں سے کوئی بھی عار محسوس نہیں کرتا، حالاں کہ یہ بات، خود طلوعِ اسلام کو بھی معلوم ہے کہ ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں دینا، نہ صرف علماءِ احناف کے نزدیک، بلکہ جملہ ائمہ فقہ کے نزدیک بھی، صحیح طریقہ طلاق نہیں ہے۔ چنانچہ اسی شمارہ میں، آگے چل کر، خود طلوعِ اسلام

❶ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۶ء، صفحہ ۳

نے یہ لکھا ہے:

"ایک ہی مجلس میں تین طلاق دینے کی رسم بد کو، جو مولوی حضرات، جائز قرار دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ قرآن مجید کے لحاظ سے تو قابلِ مذمت ہے ہی، خود ائمہ فقہ نے بھی اسے بدعت قرار دیا ہے۔"❶

ظاہر ہے کہ ائمہ فقہ میں، امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں، جن کے نزدیک، ایسا طریقہ طلاق، فی الواقعہ، بدعت ہے، اور یہ عبارت، سابقہ عبارت سے بالکل متضاد و متناقض ہے، لیکن پھر طلوعِ اسلام نے یہاں ایک اور الزام تراشی کی ہے، اور وہ کہ "بعض علماء کی یہ کوشش ہے کہ وہ ایک ہی مجلس میں دی جانے والی، تین طلاقوں کو جائز قرار دلوا دیں"۔ حالاں کہ کوئی عالم بھی ایسا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ایسا کرنا سب کے نزدیک بدعت ہے۔ طلوعِ اسلام ہو یا خود پرویز صاحب، علماء کرام کو بدنام کرنے کے لیے، اُن پر جھوٹا الزام عائد کر دینے میں، انہیں کبھی شمہ بھر بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

(۴): اہلِ حدیث علماء پر بہتان:

"مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، خوفِ خدا اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اور سورۃ الحجر کی آیت (۳۳) کی تفسیر فرماتے ہوئے، علماء اہلِ حدیث پر بایں الفاظ، بہتان تراشی کرتے ہیں:

"اہلِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ شریعت میں عقل کو دخل نہیں، اس لیے وہ عقلی طریق (قیاس) کو ماخذِ قانون نہیں مانتے، وہ اس کے خلاف ہیں۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ: ﴿ اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ ﴾ "سب سے پہلے جس نے قیاس (عقلی دلیل) سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا، اور اس کی سند یہی آیت ہے۔"❷

ایک مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے دور کے یہ "مفسرِ قرآن" اور "مفکرِ قرآن" اپنے مخالفین کے بارے میں تو یہ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ...... "جو کچھ طلوعِ اسلام کہتا ہے، اسے وہ اُس کے اپنے

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۲ ❷ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۱۸۵

الفاظ میں پیش نہیں کرتے، بلکہ اپنی طرف سے ایک بات وضع کرکے، اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔"...... لیکن دوسروں کے متعلق بات کرتے ہوئے، وہ، خود کو اس پابندی سے بالاتر سمجھتے ہیں اور اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے کہ اہل حدیث کے اس مسلک کو، خود کسی اہل حدیث، عالم ہی کے الفاظ میں پیش کریں۔ اور دوسری مصیبت یہ ہے کہ جب ایسے الفاظ کسی عالم کی تصنیف میں نہیں ملتے تو پھر "مفکر قرآن" کو "خدمتِ قرآن" کی خاطر، خود یہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے کہ ایسے الفاظ گھڑ کر، انہیں، بہتانا، مسلک اہل حدیث کی طرف منسوب کر ڈالیں، کس قدر مصیبت اور زحمت ہے جو طلوع اسلام کو اٹھانا پڑتی ہے، اس سے واقعی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ:

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

حقیقت یہ ہے کہ اہل حدیث حضرات کا قطعاً یہ مسلک نہیں ہے جسے "مفکر قرآن" نے ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس مسلک کے ایک نامور عالم دین، مولانا محمد اسمٰعیل سلفی، جن کی ایک کتاب کے حوالے، پرویز صاحب، اکثر دیا کرتے تھے، خود فرماتے ہیں:

"قرآن عزیز نے جب قدم قدم پر، عقل و فہم کو مخاطب فرمایا ہے۔ توحید و سنت اور معاد کے دلائل کے تذکرہ میں، عقل، لب اور نہی کے استعمال کی تلقین کی گئی ہے، تو اسے معطل کیونکر چھوڑا جائے۔"

﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ﴾

[الزمر: ۱۸]

"وہ لوگ بشارت کے مستحق ہیں جو گفتگو سن کے اس کے حسن و قبح میں تمیز کرتے ہیں، اچھی باتوں کو قبول کرتے ہیں یہی لوگ اللہ سے ہدایت پانے کے مستحق ہیں اور یہی عقل مند کہلانے کے حقدار۔"

اس میں عقل مند اور معاملہ فہم لوگوں کی تعریف فرمائی گئی ہے، ملتے جلتے مسائل کے حکم میں توازن، قیاس صحیح کا نتیجہ اور عقل کا واجبی تقاضا ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ۝ ﴾ [الشوریٰ:۱۷]

"اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور اسکے ساتھ میزان کو بھی اتارا۔"

جس میزان کا تعلق، کتاب کے ساتھ ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ اتری ہے، یہ ترازو وہ نہیں جو مادی اور جسمانی چیزوں میں توازن کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس سے مراد وہی میزان ہے جو کتاب کے فہم اور دلائل شرعیہ میں جس سے بصیرت ہوتی ہے جس سے مختلف نظائر کے حکم میں توازن ہوتا ہے، اس کا فقہی اور اصطلاحی نام قیاس سمجھ لینا چاہیے، لیکن حقیقت میں وہ میزان ہے۔

اس سے نہ قیاس کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے، نہ ہی اپنے مقام پر اس کی حجیت اور افادیت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔" ❶

یہ ہے قیاس کے متعلق مسلکِ اہل حدیث، جو اس مسلک کے ایک جید عالم دین نے خود بیان کیا ہے، نہ کہ وہ، جسے "مفکر قرآن" نے تسویل نفس سے کام لے کر خود گھڑا اور اسے مسلک اہل حدیث قرار دے ڈالا، اور پھر اس "جھوٹ" کو سچا ثابت کرنے کے لیے، یہ دلیل اختراع کی کہ: (اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ) حالانکہ مسلک اہل حدیث سے وابستہ کسی عالم دین نے، قیاس کی مخالفت میں، نہ یہ کچھ کہا اور نہ ہی یہ دلیل دی۔ جو کچھ فی الواقعہ کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ..... "ابلیس ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اللہ کے صریح حکم (نص) کے مقابلہ میں قیاس کیا ہے۔"..... اب "مفکر قرآن" صاحب، جہلاً یا خیانۃً، اس حقیقت کو توڑ مروڑ کر، اور "اللہ کے صریح حکم (نص) کے مقابلہ میں" کے الفاظ میں مذکور شرط کو اڑا دیتے ہیں، اور اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ کے الفاظ کو دلیل بنا کر علماء اہل حدیث کے کھاتہ میں ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امت مسلمہ کو، اس قسم کے "مفسر قرآن" اور "مفکر قرآن" کے شر سے محفوظ رکھے کہ جنہیں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ "چوری کی بکری حرام ہے" تو وہ بکری کے "مسروقہ" ہونے کی شرط کو حذف کر کے، یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیں کہ "بکری حرام ہے۔"

---

❶ تحریک آزادی فکر، صفحہ ۵۶

مزید برآں "مفکرِ قرآن" نے، جس آیت کی تفسیر میں یہ بہتان تراشی کی ہے، اس کا سیاق وسباق بھی، اس بہتانِ بے بنیاد کی تردید، بلکہ تغلیط پر دلالت کرتا ہے، آیت زیرِ تفسیر ملاحظہ فرمایئے:

﴿ قَالَ لَمْ أَكُنْ لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴾ [الحجر:۳۳]

"اس (ابلیس) نے کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ایسی مخلوق کے سامنے جھک جاؤں جسے سیاہ کیچڑ کی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔"❶

اب یہاں غور فرمایئے، کہ ابلیس کا خود کو انسان سے فائق اور افضل قیاس کرنا، اور وہ بھی اس بے اصل گمان کی بنا پر، کہ اس کا مادۂ تخلیق (آگ)، انسان کے مادۂ تخلیق (مٹی) سے بہتر ہے، اور پھر اس قیاس کو ابلیس کا اتنی اہمیت دینا کہ خدا کے صریح حکم (کہ آدم کو سجدہ کرو) کو وہ پس پشت ڈال دیتا ہے، یہی دراصل، جرمِ ابلیس ہے، نہ کہ مجرد قیاس کرنا۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ نصِ صریح (شارع کے واضح حکم) کے مقابلہ میں، قیاس کو شیوۂ ابلیس قرار دینے والے علماء بھی، صرف علماءِ اہلِ حدیث ہی نہیں ہیں، بلکہ تمام علماءِ امت، فقہاءِ ملت، اور مفسرین کرام اور محدثین عظام ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ متقدمین میں سے ہوں، یا متاخرین میں سے، اور قطع نظر اس سے کہ وہ ائمہ فقہ میں سے، احناف ہوں یا شوافع، مالکیہ ہوں یا حنابلہ، ظاہریہ ہوں، یا کسی اور مسلک سے وابستہ۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "مفکرِ قرآن" صاحب، "تفسیرِ قرآن" لکھتے ہوئے، کس طرح آیاتِ قرآنیہ کی ترمیم وتحریف کے ذریعہ، غلط مسائل ومسالک کو، قرآن سے برآمد کر کے، انہیں اپنے مخالفین کے سر تھوپا کرتے تھے۔

(۵): سید مودودیؒ کے خلاف بہتان وافتراء:

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو، جو تفقہ فی الدین، فہم

❶ ترجمہ ماخوذ از تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۱۸۴

قرآن، اسلامی بصیرت، دینی فراست، وسعتِ مطالعہ، جدید وقدیم علوم پر گہری نظر اور باطل کے خلاف جو تنقیدی صلاحیت عطا فرمائی ہے، وہ دورِ حاضر میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ پاکستان میں، پرویز صاحب کے چراغ کے نہ جل سکنے کی اصل اور بنیادی وجہ، سید مودودیؒ جیسی نابغۂ عصر شخصیت ہے، جن کے لٹریچر کو، پرویز صاحب کی تصنیفات کی نسبت کہیں زیادہ پذیرائی ملی، خود پرویز صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ ان کے فکر کے فروغ کی راہ میں، مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت حائل ہے:

> ''اگر مودودی صاحب کے عزائم کی علم بردار جماعت یہاں نہ اٹھتی، تو اس خطۂ زمین میں، اسلامی نظام یعنی مملکت علی منہاج نبوت کے امکانات بڑے روشن تھے۔'' ❶

یہی وجہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اُن کے خلاف شدید کینہ و کدورت، نفرت و عداوت، حقد و حسد، غیظ و غضب اور شقاق و تعصب میں ہمہ وقت مبتلا رہے تھے، اور طلوع اسلام کی فائل گواہ ہے کہ بعض اوقات، وہ، حسد و عداوت کے انتہائی جوش و شدت میں، اپنے حواس بھی کھو بیٹھتے تھے۔ سید مودودیؒ کے خلاف، ان کی بہتان تراشی، تہمت طرازی، افتراء پردازی، کذب بافی، ہرزہ سرائی اور خیانت کاری میں وہ بڑے پرجوش اور سرگرم تھے، ان کی عبارات کو مسخ و تحریف کا نشانہ بنا کر، عوام کو اُن سے متنفر کرنے کے لیے، ''مفکر قرآن'' نے خدع و فریب کے جو ہتھیار استعمال کیے ہیں، ان کا ذکر، گزشتہ باب میں ہو چکا ہے، یہاں صرف ایک ایسے بہتان کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس کا جھوٹ ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کی تہمت:

مودودیؒ صاحب کا لٹریچر گواہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ، انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی ہے، اسی شدت کے ساتھ وہ اشتراکیت کی بھی تردید کرتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ''مفکر قرآن'' نے اشتراکیت ہی پر قرآنی ٹھپہ لگا کر، اُسے ''نظامِ ربوبیت'' قرار دے رکھا تھا،

❶ طلوع اسلام مئی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۳

اس لیے، وہ، مولانا مودودیؒ کی طرف سے اشتراکیت کی مخالفت کو، اپنے "نظامِ ربوبیت" کی مخالفت سمجھتے تھے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کرتے تھے:

"مودودی صاحب، سرمایہ دارانہ نظام کے سب سے بڑے حامی ہیں۔"❶

یہ ایسی بدیہی البطلان بات ہے کہ ہر وہ شخص، جس نے مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، وہ کبھی اسے باور نہیں کر سکتا۔ لیکن "مفکرِ قرآن" کی یہ خصلت تھی کہ جہاں کسی نے قرآن وسنت کی روشنی میں انفرادی ملکیت کا اصول پیش کیا، وہیں، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً، اس پر سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہونے کا فتویٰ رسید کر دیا۔ حالانکہ اسلام کی معیشت پر لکھی جانے والی اپنی ہر کتاب میں، سید مودودیؒ نے کیپٹلزم اور کمیونزم، دونوں نظاموں کی تردید و مذمت کی ہے، لیکن چونکہ "مفکرِ قرآن" کا معاشی نظام، اشتراکیت ہی کا چربہ ہے، اس لیے، وہ مولانا مودودیؒ کی مخالفتِ اشتراکیت کو، مخالفتِ نظامِ ربوبیت سمجھتے ہوئے حمایتِ نظامِ سرمایہ داری پر محمول کرتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسی ہمارے ملک میں، کمیونسٹ افراد کے نزدیک، یہ بات مسلّم ہے کہ علامہ اقبال پکے سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے اپنے کلام میں نظامِ سرمایہ داری کی سخت تردید کی ہے، اور پھر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ خود اشتراکی تھے۔ اور لطف کی بات یہ کہ یہاں کمیونسٹوں کی تردید، خود، پرویز صاحب بایں الفاظ کرتے ہیں:

"اقبال نے جو کچھ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کہا ہے، مارکسزم کے حامی، اسی کی سند سے اسے (اقبال کو) کمیونسٹ ثابت کرتے ہیں، لیکن یہ ان کی غلط فہمی اور فریب انگیزی ہے۔"❷

بالکل اسی طرزِ استدلال پر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید مودودیؒ کو، نظامِ سرمایہ داری کا حامی قرار دینا، "مفکرِ قرآن" کی غلط فہمی اور فریب انگیزی ہے۔

مزید برآں، یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مولانا مودودیؒ کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ ان

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۴ء، صفحہ ۱۲۶ ❷ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۰ء، صفحہ ۵۴

دونوں نظاموں میں سے کسی ایک نظام (مثلاً اشتراکیت) کی مخالفت کرتے ہیں، جس سے دوسرے نظام (مثلاً سرمایہ داریت) کی حمایت کی دلیل اخذ کی جائے، بلکہ وہ دونوں نظاموں کی یکساں اور پرزور مخالفت کرتے ہیں، اس لیے انہیں سرمایہ دارانہ نظام کا حامی...... اور وہ بھی سب سے بڑا حامی..... کہنا، دراصل، اُس حسد و کینہ، غیظ و غضب اور بغض و عناد کا کرشمہ ہے، جس کی آگ ''مفکر قرآن'' کے سینے میں ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی۔

(۲): علامہ اقبالؒ کے خلاف بہتان:

دھوکہ باز اور جعل ساز لوگوں کا طریقۂ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معزز و محترم ہستی کے نام کی آڑ میں، اپنے باطل نظریات کے کھوٹے سکوں کو چلانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، کیوں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کھوٹے سکوں کا چلن، خود ان کے اپنے نام سے ممکن نہیں ہے۔ دورِ ماضی میں ایک گمراہ قوم جب سحر کاری کی لت میں مبتلا ہوئی تو اسے سندِ جواز بخشنے کے لیے، اس قوم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے نام کو استعمال کیا اور یہ کہا کہ خدا کا یہ عظیم الشان پیغمبر جادوگری کا یہ کافرانہ کام خود کرتا رہا ہے، بلکہ اس کی حکومت ہی جادو کے زور پر قائم رہی ہے۔ اس پر قرآن کو یہ کہہ کر تردید کرنا پڑی کہ: ﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۔ ﴾ ''حضرت سلیمان نے تو کفر نہیں کیا لیکن ان شیطانوں نے یہ کافرانہ حرکت کی کہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے''۔ اسی طرح عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکینِ عرب نے نصرانیت، یہودیت اور دینِ شرک کے کھوٹے سکوں کو رائج کرنے کے لیے، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام استعمال کیا اور پھر قرآن کو ان تینوں گروہوں کی یہ کہہ کر تردید کرنا پڑی کہ:

﴿ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ ﴾ ''ابراہیم، نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی۔ بلکہ وہ تو یکسو ہو کر مسلمان تھے، اور پھر وہ مشرکوں میں سے بھی نہیں تھے۔''

''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب نے بھی دین و مذہب میں فرق و مغایرت کا ایک نظریہ گھڑا اور علامہ اقبال کے نام پر، اس کھوٹے سکے کو یہ کہہ کر چلانے کی کوشش کی کہ اُن کے

نزدیک بھی اسلام دین تھا، مذہب نہیں تھا۔ چنانچہ "مفکر قرآن" صاحب رقم طراز ہیں:

"اسلام کے متعلق، اس تباہ کن غلطی کی طرف، سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے توجہ دلائی اور وہ عمر بھر اس حقیقت کو واضح کرتے رہے کہ اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔ یہی وہ فرق تھا جس کی بنا پر، انہوں نے آج سے قریب پچاس سال پہلے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہندو اور مسلمان، محض اشتراکِ وطن کی بنا پر، ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان اپنے دین کی بنا پر، الگ قوم کے افراد ہیں۔" ❶

ایک اور مقام پر "مفکر قرآن" صاحب، علامہ اقبالؒ کے خلاف اسی بہتان کو دُہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ دین اور مذہب کے فرق کو مسلسل بیان کرتے چلے گئے۔" ❷

حقیقت یہ ہے کہ "مفکر قرآن" کے نظریات، دو ٹکے کی جنتری کی طرح، ہر سال بدل جایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ قرآن کے ساتھ، سنتِ رسول کو بھی حجت مانا کرتے تھے، اور قرآن اور سنت، دونوں کو، ماخذِ قانونِ اسلامی قرار دیا کرتے تھے۔ اس وقت، علامہ اقبال بھی، ان کے نزدیک، قرآن و سنت کی حجیت اور سندیت کے قائل تھے۔ پھر جب، خود ان کا اپنا نظریہ و مسلک بظاہر بدل گیا اور صرف قرآن ہی ان کے نزدیک سند و حجت قرار پایا، تو انہوں نے اسی مسلک کو علامہ اقبال کی طرف بھی منسوب کرنا شروع کر دیا، اور خود منکرِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ، یہ راگ الاپنا بھی شروع کر دیا کہ علامہ اقبال بھی منکرِ حدیث تھے۔ یہی معاملہ، دین و مذہب میں فرق و امتیاز کا بھی ہے۔ قبل از تقسیم برصغیر، دونوں الفاظ، باہم مترادف المفہوم تھے اور خود پرویز صاحب نے انہیں ایسے جانتے ہوئے استعمال کیا ہے، جیسا کہ تضادات و تناقضات کے باب میں تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ پاکستان میں آنے کے بعد، پرویز صاحب نے دین و مذہب میں تفریق و مغایرت کا نظریہ گھڑا، اور پھر اس خودساختہ نظریے کے کھوٹے سکے کو، رائج کرنے کے لیے، بڑی بے دردی سے علامہ اقبال کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا۔ "مفکر قرآن" صاحب کی

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۹ ❷ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۰

ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی کہ خود ان کے بدلنے کے ساتھ، دنیا کی ہر چیز کو بدل جانا چاہیے حتیٰ کہ زمین و آسمان کو بھی انہی کی تقدیر کو دینا چاہیے۔

دین و مذہب کے دونوں الفاظ، کلام اقبال میں ہم معنیٰ الفاظ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک، جو کچھ دین سے مراد ہے، وہی کچھ مذہب سے، اور جو کچھ مذہب سے مراد ہے، وہی کچھ دین سے مراد ہے۔ ان میں معنوی اعتبار سے تفاوت و تغایر کو، علامہ اقبال کی طرف منسوب کرنا، ان پر بہتان تراشی اور تہمت طرازی ہے۔ علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار، اس افتراء پردازی کی حقیقت کھول دیتے ہیں، جن میں دین اور مذہب کو مترادف المعنیٰ الفاظ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا، اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے [1]

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات [2]

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگذر [3]

یہ علامہ اقبال کے وہ اشعار تھے جو خود پرویز صاحب کی کتب میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ، مندرجہ ذیل اشعار، براہ راست کلام اقبال سے ملاحظہ فرمائیے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا [4]

---

1. منقول از اقبال اور قرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۱۵
2. منقول از اقبال اور قرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۵۹
3. منقول از اقبال اور قرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۰۴
4. کلیات اقبال، صفحہ ۸۲

قوم، مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں ❶

جان جائے ہاتھ سے، جائے نہ ست
ہے یہی اک بات، مذہب کا تت ❷

اب وہ اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں دین اور مذہب کے دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور دونوں سے ایک ہی چیز مراد ہے۔ ایک جگہ دین کے لفظ سے جو کچھ مراد ہے، بعینہ وہی کچھ اگلے شعر میں، مذہب کا لفظ بول کر مراد لیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس قطعہ کو ملاحظہ فرمایئے، جس کا عنوان ہی ''مذہب'' ہے۔ اس کے دوسرے شعر میں، جس چیز پر لفظ ''مذہب'' کا اطلاق کیا گیا ہے، ٹھیک اسی چیز پر، آخری اور تیسرے شعر میں لفظ ''دین'' کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی ❸

پھر سیاست چھوڑ کر، داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و ملت ہے فقط، حفظِ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں، مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

---

❶ کلیاتِ اقبال، صفحہ ۲۰۱   ❷ کلیاتِ اقبال، صفحہ ۲۸۹   ❸ کلیاتِ اقبال، صفحہ ۲۴۸

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگذر ❶

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری!
ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و ملت کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری ❷

یہ چند اشعار، جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، اس حقیقت کو آفتاب نیم روز کی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ علامہ اقبال نے دین اور مذہب دونوں کو ہم معنی سمجھتے ہوئے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے، ان کے اشعار میں یہ مفہوم کہیں بھی نہیں پایا جاتا کہ دین اور چیز ہے اور مذہب کوئی اور چیز۔ یا یہ کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ یہ تفریقِ معنی، طلوعِ اسلام کی ٹکسال میں ڈھلنے والا وہ کھوٹا سکہ ہے جسے اقبال کے نام کا ٹھپہ لگا کر چلانے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ نہ صرف کلامِ اقبال میں، بلکہ طلوعِ اسلام کی فائل کے ابتدائی شماروں میں بھی، ان دونوں الفاظ کو مترادف المعنی جان کر استعمال کیا گیا ہے۔

اشعارِ اقبال کے بعد اب ان کا ایک نثری اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے خود پرویز صاحب نے اپنی کتاب میں دیا ہے:

"میرے نزدیک تصوفِ وجودی، مذہبِ اسلام کا کوئی جزو نہیں، بلکہ مذہبِ اسلام کے خلاف ہے اور یہ تعلیم غیر مسلم اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے۔ ❸"

اب جو شخص فکرِ اقبال کا بزعمِ خویش، وارث اور شارح بن کر، اقبال کے خلاف الزام تراشی پر اتر آتا ہے، (یہ جاننے کے باوجود بھی کہ اس کا پردہ دنیا میں کسی وقت بھی چاک ہو سکتا ہے) وہ، ان دیکھے خدا کے کلام میں تحریف و تلبیس کے ذریعہ کیا کچھ گل نہیں کھلا سکتا، جبکہ اُسے یہ علم بھی ہو کہ قیامت سے قبل، ان قرآنی تحریفات کا پردہ چاک نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی گیا تو اس کے

❶ کلیاتِ اقبال، صفحہ ۲۶۵ ❷ کلیاتِ اقبال، صفحہ ۳۰
❸ خطوطِ اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، شائع کردہ، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ص: ۱۲۷، بحوالہ "اقبال اور تصوف"، ص: ۲۲۵

اندھے مقلدین، اسے تسلیم نہ کریں گے اور ان تحریفات وتلبیسات کو، بلند پایہ "علمی نکات" قرار دیتے رہیں گے۔

(۷): علامہ اقبالؒ کے خلاف ایک اور بہتان:

منکرین حدیث، علامہ اقبالؒ کے خلاف، یہ پراپیگنڈہ بھی کیا کرتے ہیں کہ وہ بھی منکرِ حدیث اور منکرِ سنت تھے۔ طلوع اسلام نومبر ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں "تین بڑے بڑے منکرین حدیث" کے زیر عنوان، امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ کو بھی یکے از منکرین حدیث قرار دیا گیا ہے۔ اوّل الذکر دو شخصیتوں کے بارے میں، حقیقتِ حال، کسی دوسری مجلس میں بیان کی جائے گی، فی الحال موضوع کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ کے بارے میں اس بہتان کی قلعی کھولنا مقصود ہے۔ طلوع اسلام نے حالیہ دنوں میں بھی یہ لکھا ہے:

> "اگر انصاف پسندی کوئی اصول ہے، تو ہم ناقدانِ پرویز سے التماس کریں گے کہ یا تو وہ علامہ محمد اقبالؒ کو بھی منکرین حدیث میں شمار کریں، کیوں کہ ان کے موقفِ حدیث اور علامہ پرویز کے موقفِ حدیث میں سرِ مو فرق نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو کم از کم انہیں اپنے تضادِ فکر ونظر پر کچھ تو ندامت محسوس کرنی چاہیے۔" ●

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کی تو کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے، جس سے کوئی راست باز شخص تجاوز نہیں کرسکتا، لیکن جھوٹ کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی، جہاں پہنچ کر کوئی کاذب ومفتری شخص رک جائے۔ منکرین حدیث کے چند نمایاں اکاذیب واباطیل میں سے، ایک واضح جھوٹ یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال منکرِ حدیث اور منکرِ سنت تھے۔ اس جھوٹ کو، اعادہ وتکرار کے ساتھ، بکثرت اور بار بار، دُہرایا جاتا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ کیوں؟.......... صرف اس لیے کہ:

> "نازیوں کے گوبلز..... کا مقولہ تھا کہ جھوٹ کو اگر سو دفعہ دُہرایا جائے، تو وہ سچ بن جاتا ہے۔ دنیا، اس کے اس مقولے پر ہنستی رہی، لیکن دوررس نگاہوں نے، اسے قیمتی متاع سمجھ کر، احتیاط سے رکھ لیا تھا کہ بوقتِ ضرورت، اس سے کام لیا جاسکے۔" ●

● طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، صفحہ ۲۲ ● طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۹

اب ظاہر ہے کہ منکرین حدیث سے بڑھ کر "دوررس نگاہ" کس کی ہوگی؟ انہوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر رکھ لیا، اور اس سے خوب کام لیا۔ علامہ اقبالؒ کے سلسلہ میں، یہ پراپیگنڈہ بھی، بڑی "دوررس نگاہ" کے ساتھ، اس متوسلے سے بھرپور کام لینے کی ایک کڑی ہے۔

یاد رکھیے، کسی شیطان نے آج تک، اپنی شیطنت کو، خود اپنے نام سے پیش نہیں کیا، بلکہ یہ کام، اُس نے ہمیشہ ان لوگوں کے نام کی آڑ میں کیا ہے، جن کا قوم میں احترام اور اثر ورسوخ پایا جاتا ہے۔ اگر شیطان اپنے باطل نظریات کو، خود اپنے نام سے پیش کرے، تو وہ جانتا ہے کہ معاشرے میں یہ قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ اس لیے باطل کوحق کا، اور بگاڑ کو صلاح کا لباس زور پہنا کر، اُن ہستیوں کے نام کی آڑ میں پیش کرتا ہے، جو معاشرے میں مقامِ احترام واکرام رکھتی ہیں۔ اس قسم کے شیطنت مزاج اور حیلہ جو لوگ، اُن ہستیوں کی بڑی مبالغہ آمیز مدحت وثنا کے ساتھ ساتھ، ان کی بڑی بڑی تصاویر اور پورٹریٹ کو اپنے آگے رکھتے ہیں، اور خود ان کے پیچھے رہ کر، ان کی آڑ میں، اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی زبانوں پر اسلاف کے حق میں زندہ باد کے نعرے، اور اُن کے ہاتھوں میں ان واجب الاحترام ہستیوں کی تصویریں، عامۃ الناس میں یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ انہیں، اِن ہستیوں سے بڑی عقیدت اور محبت ہے۔ اس کے بعد، یہ پُرفریب لوگ، جو چیز بھی ان اسلاف کی طرف منسوب کر دیں، لوگ اسلاف کے ساتھ اپنے احترام وعقیدت کے بل بوتے پر، بغیر کسی تحقیق وتفتیش کے درست مان لیتے ہیں۔ ٹھیک یہی ٹیکنیک ہے، جو انکارِ حدیث کے علم برداروں نے، ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (وغیرہ) کے بارے میں اختیار کی ہے۔ مجلہ طلوعِ اسلام کے ابتدائی دور میں، اس کے پہلے صفحے (Title Page) پر، حضرت علامہ اقبالؒ کی بڑی دلکش تصویر شائع ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد، کلامِ اقبال سے کوئی ایک قطعہ پیش کیا جاتا تھا، پھر علامہ اقبالؒ کو مختلف مقالات ومضامین کے ذریعہ، ان کی "شاعری" پر داد دی جاتی تھی، تاکہ ان کے نام کی آڑ میں، یہ دکانداری چلتی رہے، اور نامِ اقبال کے باعث، طلوعِ اسلام کے گاہکوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ آج تک، درجہ بدرجہ، اس ٹیکنیک میں وقتی تقاضوں کے تحت، کمی بیشی کے ساتھ، یہ سلسلہ جاری ہے۔ علامہ اقبالؒ سے متعلقہ مضامین ومقالات میں، اس

بات کا خاص التزام برتا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ، علامہ اقبال کے شغف کو تو نمایاں کیا جائے، لیکن ان کی اطاعتِ سنتِ نبویہ کا کہیں ذکر نہ آنے پائے۔ شاعرِ مشرق کے وہ اشعار تو پیش کر دیے جائیں، جن میں قرآنِ کریم کو اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، مگر ان اشعار سے پرہیز کیا جائے جن میں امتِ مسلمہ کے زوال و انحطاط کا سبب، ترکِ سنتِ نبویہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ "نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن" کو تو خوب اچھالا گیا، مگر "از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو" کے بیان سے اس طرح پرہیز کیا گیا جس طرح شیطان نیکی سے پرہیز کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مخصوص انداز کے تعارفِ اقبال نے، جسے طلوعِ اسلام نے اپنی منفرد ذہنی افتاد کے پیشِ نظر، تسلسل اور تواتر کے ساتھ برسوں جاری رکھا، ایک مخصوص حلقے میں یہ تاثر پیدا کر دیا کہ اقبالؒ بھی گویا یکے از منکرینِ حدیث تھے، حالاں کہ یہ تاثر، از سرتاپا بے اصل و بے بنیاد اور خالص کذب و باطل ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے، زیادہ نہیں تو، صرف ایک کتاب کا مطالعہ ہی کافی ہے۔ یہ کتاب، علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام کی ان یادداشتوں اور گفتگوؤں پر مشتمل ہے، جن میں حدیثِ رسول، اتباعِ رسول اور کتاب و سنت کے متعلق، علامہ اقبالؒ کے نظریات کی صراحت پائی جاتی ہے۔ اسے سید نذیر نیازی صاحب نے روزانہ کی ڈائری کی صورت میں مرتب کیا ہے، اور یہ وہی سید نذیر نیازی صاحب ہیں، جو پرویزی طلوعِ اسلام کے اجراء سے پہلے، خود طلوعِ اسلام ہی کے نام سے ایک مجلہ نکالا کرتے تھے۔ ان کی کتاب "اقبال کے حضور"، اس اعتبار سے بھی ایک ثقہ کتاب ہے کہ سید نذیر نیازی صاحب ایک تو علامہ مرحوم کے بہت قریبی ساتھی تھے، اور دوسرے خود طلوعِ اسلام سے وابستہ افراد بھی، انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں، حدیثِ رسول اور سنتِ نبی سے متعلق فرموداتِ اقبال، اُن کی زندگی کے بالکل آخری ایام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان فرمودات کے بعد، یہ ناممکن ہے کہ انکارِ حدیث پر مبنی، ان کا کوئی فرمان پیش کیا جا سکے۔

طوالتِ بحث سے دامن بچاتے ہوئے، میں نہ تو اس کتاب "اقبال کے حضور" میں سے کچھ اقتباس پیش کرنے کی گنجائش پاتا ہوں، اور نہ ہی کلامِ اقبال میں سے کچھ اشعار۔ میں صرف

دو ایسے اقتباسات پیش کر رہا ہوں جو مجلہ طلوعِ اسلام ہی سے ماخوذ ہیں، تا کہ اس موضوع پر، خود وابستگانِ طلوعِ اسلام پر حجت قائم ہو سکے، کیوں کہ:

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

طلوعِ اسلام کا مقصدِ اجراء:

طلوعِ اسلام نے، اپنے ابتدائی دور میں، اپنے مقصدِ اجراء کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا:

"پرچہ طلوعِ اسلام کے مقاصد کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا مسلک، حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے نورِ بصیرت کو عام کرنا، یعنی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق، ہر مسئلہ کا حل، کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کرنا ہوگا۔" ❶

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ علامہ اقبال کا مسلک کتاب وسنت ہی تھا۔ اُن کے نورِ بصیرت کو عام کرنے کا مطلب، اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسائلِ حیات کا حل، کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد، پرویز صاحب نے کھل کر حدیث کا انکار کیا اور قرآن وسنت کی بجائے لفظِ قرآن ہی کی رٹ لگانی شروع کی، اور یہ پراپیگنڈہ بھی شروع کر دیا کہ علامہ اقبال بھی پکے از منکرین حدیث تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص، اپنے پہلے سے مخفی رکھے ہوئے اصل عقائد و نظریات کا اب اعلان کرے، دوسری قابلِ احترام ہستیوں کے بارے میں بھی یہ کہتا ہے کہ ان کے عقائد بھی، اُس کے نئے اعلان شدہ عقائد کے مطابق تھے، وہ، علامہ اقبال کے کلام کی تشریح و توضیح کرے گا؟ یا ترمیم و تغییر؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ "مفکرِ قرآن" صاحب، علامہ اقبالؒ کے نام کی آڑ میں، اپنے افکارِ باطلہ کے کھوٹے سکوں کو، اسی طرح سوقِ علم میں لایا کرتے تھے، جس طرح یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکہ، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر، اپنے معتقداتِ باطلہ کو، منڈی کا مال بنا کر پیش کیا کرتے تھے۔ اسی لیے قرآن کو اُن کی تردید میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ: ﴿ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳

يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۶۷) آج ہم بھی یہ حقیقت واشگاف کرنے پر مجبور ہیں کہ علامہ اقبالؒ کا مسلک، مسلکِ انکارِ حدیث ہرگز نہ تھا، بلکہ قرآن وسنت ہی ان کا مسلک تھا، اور یہ کشفِ حقیقت بھی، ہم کسی اور ذریعہ سے نہیں، بلکہ طلوعِ اسلام ہی کے ذریعہ کررہے ہیں۔

دوسرا حوالہ..... مکتوبِ اقبال:

اب دوسرا حوالہ ملاحظہ فرمایے۔ یہ بھی طلوعِ اسلام ہی سے ماخوذ ہے۔ یہ دراصل علامہ اقبالؒ کے اس خط کا اقتباس ہے جو آپ نے جامعہ ازہر (مصر) کے شیخ مصطفےٰ المراغی کی خدمت میں ارسال کیا تھا، تاکہ وہاں سے کسی قابل، جہاں دیدہ، علومِ قدیمہ وجدیدہ سے بہرہ مند، جید عالمِ دین کو بلاکر، دارالاسلام کی سکیم کو بروئے کار لایا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ "دارالاسلام" کے زیرِ عنوان، جس مضمون سے یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے، وہ مضمون، خود پرویز صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لیجیے، ملاحظہ فرمایے، اقتباسِ مکتوبِ اقبالؒ:

> "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں قائم نہیں کیا گیا۔ ❶ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو، جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ حضرات ایسے ہوں، جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں، اور وہ اپنی زندگیاں، دینِ اسلام کی خدمت میں وقف کرنے پر تیار ہوں۔ ہم ان کے لیے تہذیبِ حاضرہ کے شوروشغب سے دور، ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں، جو کہ ان کے لیے ایک علمی اسلامی مرکز ہو، اور ہم ان کے لیے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتب موجود ہوں۔ علاوہ ازیں ہم ایک ایسا راہنما، جو کامل اور صالح ہو، اور قرآنِ حکیم

---

❶ یہ اقتباس طلوعِ اسلام سے ماخوذ ہے اس کے بعض جملے رکاکت سے گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جبکہ "اقبال نامہ" حصہ اول صفحہ ۱۵۱، (مرتبہ شیخ عطاء اللہ) پر اس خط کی عبارت بہت بہتر ہے۔

میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو، اور نیز انقلاباتِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں، تا کہ اُن کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی روح سے واقف کرے، اور تفکرِ اسلامی کی تجدید، یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے، تا کہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے، تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔"❶

مصر سے جب کوئی ایسی شخصیت میسر نہ آ سکی، تو ہندوستان میں، ان کی نگاہِ انتخاب، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر پڑی، اور انہیں حیدرآباد دکن سے، دارالاسلام (پٹھان کوٹ، پنجاب) میں منتقل ہونے کی دعوت دی، چنانچہ وہ علامہ اقبالؒ کی اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے، دارالاسلام میں تشریف لے آئے۔

مودودی صاحب ہی کیوں، پرویز صاحب کیوں نہیں؟:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر علامہ اقبالؒ، منکرِ حدیث اور منکرِ سنت تھے، اور پرویز صاحب کے ہم مسلک ہونے کی بنا پر، صرف حجیتِ قرآن ہی کے قائل تھے، تو انہوں نے دارالاسلام میں، اس دینی خدمت کے لیے، پرویز صاحب کو کیوں نہ دعوت دی؟ اور اُس مودودیؒ ہی کو کیوں دعوت دی، جس کا مسلک ابتداء ہی سے، قرآن کی حجیت اور سنت کی سندیت پر قائم تھا؟ اور مرتے دم تک، وہ، اسی مسلک پر برقرار رہے۔

حیاتِ اقبال کے آخری لمحات:

حدیثِ نبوی کے متعلق، اقبال کا رویہ کیا تھا؟ اس کی وضاحت کے لیے، اب میں، حیاتِ اقبال کے بالکل آخری لمحات کو، نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ موت سے چند ثانیے قبل، انہوں نے حدیثِ نبوی کے متعلق کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا:

"۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی شب، بڑی قیامت خیز شب تھی۔ وہ مفکرِ اسلام، جس نے اپنے نغموں سے مسلم معاشرے پر، خودی کے راز کو آشکارا کیا، جس نے رنگ و نسل،

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۲ تا ۸۳

علاقائیت اور زبانوں کی عصبیت سے بلند ہو کر، ساری انسانیت کو سربلندی کا پیغام دیا، جس نے اپنے شعر و ادب سے عالمِ اسلامی کو اتحاد کی راہ دکھائی، جس نے اپنی شاعری میں شرفِ انسانی کے رموز کو واضح کیا، جس نے اپنے کلام سے قومی تشخص کے امور کو ابھارا، جس نے اپنی فکر اور شاعری کو، اتحادِ اسلامی اور تحریکِ آزادی کو فروغ دینے کا ذریعہ بنایا، یہ دانائے راز، جاوید منزل کے ایک کمرے میں بسترِ مرگ پر، اس وقت کا انتظار کر رہا ہے، جب بندہ اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملتا ہے، اور موت، بندۂ مومن پر حیاتِ دوام کے دروازے کھول دیتی ہے۔

اس قیامت خیز شب میں تمام تیماردار، ساڑھے بارہ بجے شب کو رخصت ہو گئے، علامہ کو پچھلے پہر رات کو بے چینی شروع ہوئی۔ شب کے تین بجے، علامہ نے راجہ حسن اختر کو بلایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو علامہ نے اپنے ملازم دیوان علی سے فرمایا کہ تم سو جاؤ، البتہ علی بخش جاگتا رہے، کیوں کہ اب اس کے سونے کا وقت نہیں۔ پھر راجہ حسن اختر سے فرمایا کہ پیٹھ کی طرف کیوں بیٹھے ہو؟ راجہ حسن اختر، علامہ کے قریب ہو بیٹھے، تو فرمایا ''قرآن مجید کا کوئی حصہ سناؤ۔ کوئی حدیث یاد ہے؟ یہ فرما کر علامہ پر غنودگی طاری ہو گئی۔''..... ●

غور فرمائیے! وہ اقبال، جو آغوشِ موت میں جاتے ہوئے بھی، یا تو قرآن کریم کی سماعت کا خواہش مند ہے، یا حدیثِ رسول کے سننے کا آرزو مند، وہ اپنی زندگی کا آخری عمل، یا تو کتاب اللہ کی سماعت کو بنانا چاہتا ہے، یا فرمانِ نبوی کی سماعت کو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ احادیثِ نبویہ کو سرچشمۂ اسلام تسلیم نہ کرتا تھا۔ اقبال کی طرف، انکارِ حدیث کے مسلک کو منسوب کرنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف، یہودیت، عیسائیت یا دینِ شرک کو منسوب کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ، انکارِ حدیث کے مسلک کو، اقبال کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، وہ اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں کہ اس پر، نہ تو خالقِ حق کی طرف سے کوئی حیا محسوس کرتے ہیں اور نہ وہ

● اقبال اور علمائے پاک و ہند، از اعجاز الحق قدوسی، صفحہ ۸۳ تا ۸۴

مخلوق ہی کی طرف سے کوئی شرم۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جن لوگوں پر، ان کے مسلسل اور پیہم بولے جانے والے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے، ان کی نگاہ میں ایسے لوگوں کی کیا عزت و آبرو باقی رہ جائے گی؟۔ آخرت کی جوابدہی کا احساس تو رہا ایک طرف، اگر یہ لوگ دنیا ہی میں، اپنے جھوٹ کے انجام کا خیال کر لیں، تو کبھی ایسی حرکت نہ کریں، لیکن کیا کیا جائے! جن لوگوں نے بس اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہو، اور کذب و زور ہی کی بنیاد پر، لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کا وطیرہ اپنا رکھا ہو، اور اپنی الزام تراشیوں، کذب بافیوں اور افتراء پردازیوں ہی کے ذریعہ، کچھ لوگوں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر ڈالنے ہی کو کامیابی سمجھ رکھا ہو، اور اپنی غلط بیانیوں کے باعث، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے ہی کو فوز و فلاح قرار دے رکھا ہو، انہیں اس سے کیا غرض کہ ان کی یہ بہتان تراشیاں اور افتراء پردازیاں، سنجیدہ طبقے میں، ان کے متعلق کیا تاثر پیدا کر رہی ہیں۔

آخر میں، میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے لکھی ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد، ان کی ذات کے احترام، اور ان کے کلام کی تشریح کی آڑ میں، طلوعِ اسلام نے انہیں منکرِ حدیث قرار دے کر ان کی روح پر، اور حقائق پر جو ظلم روا رکھا ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ سدِ باب ہو جائے، بلکہ علامہ اقبالؒ کی نظر میں حدیث و سنت کا جو مقام ہے، وہ بھی لوگوں پر واضح ہو جائے، ورنہ ہمارے نزدیک، اقبالؒ کی ہرگز ہرگز یہ حیثیت نہیں ہے کہ انہوں نے اگر قرآن کے ساتھ حدیث کا نام لیا ہے، تو ہم بھی، ان کی اتباع و تقلید میں ایسا کر گزریں۔ ہم قرآن و سنت کو اسلام کا مستقل سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ ہم کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بلا محمدؐ کے قائل نہیں ہیں۔ علامہ اقبالؒ، اگر نہ بھی پیدا ہوتے، تب بھی اہلِ ایمان کے لیے ہدایت کا سرچشمہ، قرآن و سنت ہی مانے جاتے، جیسا کہ ان کی ولادت سے قبل بھی ان کی حیثیت مسلم رہی ہے۔ قرآن و سنت کا یہ مقام، دورِ نبوی سے اب تک تواتر و تسلسل کے ساتھ برقرار رہا ہے۔

(۸) امام شافعیؒ کے خلاف بہتان:

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، ان ائمۂ اربعہ میں سے ایک انتہائی ذہین، دقیقہ رس، نکتہ آفریں، اور سریع الفہم، پیشوائے فقہ تھے، جنہیں امتِ محمدیہ میں، بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی، ”مفکر

قرآن" کی تیر اندازی سے یہ جلیل القدر شخصیت بھی محفوظ نہ رہ سکی، وہ ان پر بہتان تراشتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعی نے پیش کیا تھا، اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امام اعظم نے کی تھی۔" ❶

ارباب علم سے یقیناً یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ "مفکر قرآن" انتہائی جھوٹ بولا کرتے تھے، اور اپنے مخالفین کی عبارات کو مسخ و تحریف کا نشانہ بنا کر، بناءِ فاسد علی الفاسد کی تعمیر کیا کرتے تھے، ہمیں آج تک امام شافعی کا کوئی ایسا فرمان نہیں مل سکا، اور نہ ہی کوئی ماں کا لعل، امام مذکور کی کوئی ایسی تحریر دکھا سکتا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہو، کہ ..... "ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں....."

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کی بات کو، کبھی تو سیاق و سباق سے کاٹ کر، ان کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں، اور کبھی کوئی ایسی بات، جو اُن کے ذہنی سانچہ میں ڈھل نہ سکتی ہو، اُسے بہتاناً، اپنے مخالفین کی طرف منسوب کر ڈالتے ہیں، اور کبھی ان کی بات، خود ان کے الفاظ میں پیش کرنے کی بجائے، اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں، اور مفہوم، کچھ اور ہی کر ڈالتے ہیں، اور پھر اس بدلے ہوئے مفہوم پر، اپنے ذوقِ تردید اور شوقِ تنقید کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن منکرینِ حدیث، اس معاملہ میں، سب سے آگے بڑھ کر، یہ حرکت بھی کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے ایک بات گھڑ کر، اسے اپنے مخالفین کے گلے مڑھتے ہوئے، "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے مصداق، یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ دوسرے لوگ، ان کے خلاف، یہی گھٹیا رویہ اختیار کرتے ہیں، جو دراصل، خود ان کا اپنا رویہ ہوتا ہے، چنانچہ ایک مقام پر طلوع اسلام یہ لکھتا ہے:

"ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۵

کچھ طلوع اسلام کہتا ہے، اسے اس کے الفاظ میں، اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے، اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں، وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینی شروع کر دیتے ہیں۔'' ❶

حالاں کہ ''مفکر قرآن'' اور طلوع اسلام کی یہ خصلت بد، یہاں کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ امام شافعیؒ کی بات کو، خود ان کے اپنے الفاظ میں، پیش کرنے سے اجتناب کر رہے ہیں، اور اپنی طرف سے یہ غلط بات وضع کرتے ہیں کہ...... ''کسی ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں''...... اور پھر اسے امام شافعیؒ کے گلے مڑھ رہے ہیں۔

جھوٹ اور وہ بھی سو فی صد:

اور اس سے بھی بڑا جھوٹ، جو یہاں ''مفکر قرآن'' نے بولا ہے، یہ ہے کہ...... ''امام شافعیؒ کے اس نظریہ کی مخالفت، امام اعظمؒ نے کی تھی''...... حالاں کہ امام اعظمؒ ۱۵۰ھ کو فوت ہوئے تھے، اور اسی سال (یعنی ۱۵۰ھ کو) امام شافعیؒ پیدا ہوئے تھے۔ پیدائش کے بعد، حصول تعلیم، اور تعلیم و تدریسِ علم میں، بہر حال، کئی سال لگے ہوں گے، اور یہ نظریہ، جو ''مفکر قرآن'' نے بہتانا، ان کی طرف منسوب کیا ہے، یقیناً، امام اعظمؒ کی وفات کے سالہا سال بعد ہی پیش کیا ہوگا، پھر اس صورت میں یہ کہنا کہ...... ''آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت، امام اعظمؒ نے کی تھی''...... واقعی اس لحاظ سے باعث حیرت ہی ہے کہ امام اعظمؒ کے اعصاب پر، امام شافعیؒ کی مخالفت کا بھوت ایسا سوار تھا کہ قبر میں مدفون ہو کر بھی، انہیں امام شافعیؒ کی تردید و مخالفت کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

اب رہا یہ امر کہ کیا امام شافعیؒ کی پیدائش اور امام اعظمؒ کی وفات واقعی، ۱۵۰ھ ہی میں ہوئی تھی، تو اس کا ثبوت کسی اور کتاب سے دینے کی بجائے، ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے دینا مناسب اور قرینِ مصلحت ہے۔

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۶۱

ان ائمہ کرام کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی:

امام اعظم	پیدائش ۸۰ھ	وفات ۱۵۰ھ
امام مالک علی مدنی	پیدائش ۹۳ھ	وفات ۱۷۹ھ
امام شافعی	پیدائش ۱۵۰ھ	وفات ۲۰۴ھ
امام احمد بن حنبل	پیدائش ۱۶۴ھ	وفات ۲۴۱ھ ❶

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "مفکر قرآن" بہتان تراشی اور کذب و زور سے کام لینے میں کس قدر دیدہ دلیری کا مظاہرہ فرمایا کرتے تھے۔

تخفیف جھوٹ کی بھونڈی کارروائی:

معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے توجہ دلانے پر "مفکر قرآن" کو اپنی اس تحریر میں سقم کا احساس ہوا، چنانچہ اگلے شمارہ میں "ایک ضروری وضاحت" کے زیر عنوان "ازالہ سقم" کی کوشش، بایں الفاظ کی گئی:

> "طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں، زیر مقالہ "فقہی قوانین کی دینی حیثیت" صفحہ ۵ پر لکھا گیا ہے:
>
> "ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امام اعظمؒ نے کی تھی۔"
>
> صحیح پوزیشن یوں ہے:
>
> "امام ابو حنیفہؒ نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ کسی دور کے قوانین ہمیشہ کے لیے غیر متبدل قرار نہیں پا سکتے، حالات کے تغیر سے ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور کہا کہ عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ کے قوانین ہمیشہ کے لیے غیر متبدل قرار پائیں گے۔ ائمہ فقہ حنفی نے ان کے اس نظریہ کی شدت سے

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۹

مخالفت کی۔"

قارئین ضروری تصحیح فرمالیں۔ ❶

لیکن یہ سخن سازی بھی، امام ابوحنیفہؒ کے سال وفات اور امام شافعیؒ کے سال پیدائش کے حوالے سے پائے جانے والے سقم ہی کا ازالہ کر سکی ہے، ورنہ جہاں تک تصحیح نوٹ میں دونوں ائمہ کی طرف منسوب کردہ اقوال کا تعلق ہے، وہ اب بھی نرے جھوٹ اور کذب خالص ہیں، کوئی شخص، ان اقوال کا ماخذ، قیامت تک پیش نہیں کر سکتا، کیوں کہ طلوع اسلام کی ٹکسال کے سوا، ان کھوٹے اور جعلی سکوں کا کوئی بھی اور کہیں بھی وجود نہیں ہے، بہرحال، کذب و زور کے ساتھ "مفکر قرآن" کا یہ پختہ، محکم اور مستحکم رشتۂ وفا، قابل داد و لائق تعریف ہے، کہ بقول غالب:

وفا داری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

(۹): قرآن مجید کے خلاف بہتان:

"مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی تہمت طرازی، افتراء پردازی، بہتان تراشی، دروغ گوئی اور کذب بیانی کی عادت ایسی پختہ تھی کہ انہیں خدا کی کتاب پر بھی تہمت طرازی کرتے ہوئے کوئی دریغ نہ تھا؛ چنانچہ وہ اپنے جوشِ خطابت میں، ہوش سے عاری ہو کر، ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں:

"اہل مکہ نے جب قرآن کریم کے کلام ربانی ہونے کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کیا، تو اللہ رب العزت نے انہیں چیلنج کے طور پر لکھا ❷ کہ "ان سے کہو کہ یہ اسے انسانی کلام سمجھتے ہیں تو اس جیسی کتاب بنا لائیں، اگر یہ نہیں تو ایک سورت۔ اور اگر یہ بھی ناممکن ہے تو کم از کم ایک ہی آیت اس کی مثل بنا لائیں۔" ❸

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۴

❷ کاش پرویز صاحب یہ واضح کر جاتے کہ اللہ نے ان کو چیلنج کے طور پر لکھا تو کس طرح لکھا؟ بذریعہ ڈاک خط لکھ کر بھیجا، یا خط جبریل چٹھی لکھ کر؟

❸ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۴ء، صفحہ ۷۴

کیا منکرینِ حدیث میں سے، کوئی مائی کا لعل، قرآن میں سے کوئی ایسا جملہ پیش کر سکتا ہے جس میں "ایک ہی آیت" بنا لانے کا چیلنج پیش کیا گیا ہو؟ ﴿ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ ﴾

آخر یہ "عشقِ قرآن" کی کونسی قسم ہے جس میں "مفکرِ قرآن" صاحب، منزلِ قرآن سے بھی آگے بڑھ کر چیلنج پیش کرتے ہیں؟ کیا یہ قرآن کی حدود سے تجاوز نہیں؟ کیا یہ قرآن اور خدائے قرآن پر بہتان نہیں؟ کیا اللہ میاں سے یہاں چوک ہوگئی کہ "ایک ہی آیت" بنا لانے کا چیلنج دینا بھول گئے؟ اور اب "مفکرِ قرآن" نے منزلِ قرآن کی اس لغزش کی (معاذ اللہ) تلافی کر دی ہے؟

(۱۰): حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر بہتان:

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی، ایسی بلند پایہ ہستی ہے کہ عشاقِ رسولؐ کے ہاں، ہزار بار بھی مشک و عنبر سے دہن و لسان کو دھو کر ان کا نام لیا جائے، تب بھی بے ادبی ہی نہیں بلکہ کمال بے ادبی ہے۔ آسمان کے نیچے یہ وہ ادب گاہ ہے جو عقیدت و احترام اور تعظیم و تکرام کے حوالہ سے، عرشِ خداوندی سے بھی نازک تر مقام ہے۔ ان کے طے کردہ فیصلہ سے سرتابی تو رہی ایک طرف، محض تنگی محسوس کرنا بھی غارت گرِ ایمان ہے۔ اُن کے حضور، بلندیٔ آواز کی اختیار کرنا، محض گستاخی ہی نہیں بلکہ زندگی بھر کی پونجی عمل کو برباد کرنا ہے۔ الغرض، بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، ایسی عظیم المرتبت، جلیل القدر، رفیع الشان اور بلند پایہ ہستی پر، اس کاذب و مفتری "مفکرِ قرآن" کا بہتان تراشی کرنا، انتہا درجے کی بے باکی، دیدہ دلیری اور جسارت ہے۔

حلقۂ طلوعِ اسلام میں سے کچھ لوگوں نے "مفکرِ قرآن" پر مالی خیانت اور روپے پیسے میں گڑبڑ کا الزام لگایا (اس کی پوری تفصیل آئندہ ایک باب میں آ رہی ہے) "مفکرِ قرآن" نے بھی الزام رسول اللہ ﷺ پر عائد کر کے، خود کو اُنؐ کے مقام پر، اور الزام لگانے والوں کو منافقین کے مقام پر رکھ کر، یوں جواب دیا:

"اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس داعیٔ انقلاب کے

خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیے جائیں .....اس ذات گرامی کے متعلق ، یہ بدنہاد مشہور کرتے ہیں کہ آپؐ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ﴾(۹/۵۸)۔ان میں وہ بھی ہیں ، جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے اور طعنے دیتے ہیں۔" ●

امر واقعہ یہ ہے کہ منافقین نے ہرگز ہرگز، آنحضرت ﷺ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ مالی معاملات میں خیانت اور گڑبڑ کرتے ہیں۔ وہ صرف یہ کہتے تھے کہ آپؐ صدقات کی تقسیم میں ان کی خواہش پوری نہیں کرتے ، چنانچہ قرآن کریم ، اس آیت میں ، جسے "مفکر قرآن" نے اپنی مطلب برآری کے لیے ادھورا پیش کیا ہے ، اس صورتِ واقعہ کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ۞ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ۞ ﴾ [التوبہ:۵۸]

"اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو تجھے صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں ، اگر انہیں اس میں سے دیا جائے تو راضی رہتے ہیں ، اور اگر نہ دیا جائے تو برہم ہو جاتے ہیں ، اور اگر وہ اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے عطا کردہ مال پر راضی رہتے ، اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے وہ اپنے فضل سے اور نوازے گا اور رسول بھی مزید دے گا اور ہم اسی طرف متوجہ ہیں (تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا)۔"

حضور نبی اکرم ﷺ لوگوں کی معاشی حالت اور دینی مصالح کو پیش نظر رکھ کر کسی کو کم ، کسی کو زیادہ اور کسی کو بالکل صدقات نہیں دیتے تھے۔ یہی بات منافقین کے لیے وجہ شکایت تھی۔ انہوں نے ہرگز ہرگز آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ (معاذ اللہ) مالی امور میں خیانت اور گڑبڑ

● طلوع اسلام ، دسمبر ۱۹۶۳ء ، صفحہ ۷

کرتے ہیں۔ وہ یہ بات جانتے تھے کہ آپؐ نے صدقات کو، خود پر اور اپنے افرادِ کنبہ پر حرام قرار دے رکھا تھا۔ وہ، بہر حال، منافق ہونے کے باوجود بھی، اس قدر بے حیا نہیں تھے کہ اس ذاتِ گرامی پر، وہ، خیانت و بددیانتی اور گڑبڑ کے الزامات لگاتے، جن پر کھلے کھلے کافر بھی، یہ افتراء پردازی کرنے کی بجائے، انہیں صادق اور امین مانتے تھے۔ اس گھٹیا اور کمینے الزام کو انہوں نے "مفکرِ قرآن" کے لیے چھوڑ دیا، اور "مفکرِ قرآن" نے بصرف اور صرف اپنی ذات کو اس الزام سے بچانے کے لیے، رسولِ خدا ﷺ پر، یہ الزام اپنی طرف سے عائد کر کے، اسے اپنی بے گناہی کے لیے ڈھال بلکہ بہانہ بناتے ہوئے، ذاتِ رسول کو بلند مقام سے اتار کر اپنی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہمیں سوفی صد یقین ہے کہ ایسا کرتے ہوئے، "مفکرِ قرآن" کے قریب قریب بھی، خوفِ خدا نہ پھٹکا ہوگا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس "مفکرِ قرآن" کے متعلق کیا کہا جائے، جس نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر، ایسا خسیس، گھناؤنا اور سنگین بہتان باندھا جس کی جرأت آپؐ کے بدترین دشمن بھی نہیں کر پائے۔ کیا دین کی میزان میں اس سے بڑا جرم کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ رسول پر بددیانتی کا الزام، محض اس لیے لگا دیا جائے کہ اسے اپنی مدافعت کا بہانہ بنانا مقصود ہے؟ کیا اسلام کے بدترین دشمنوں نے بھی کبھی آپؐ کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کیا ہے؟ لیکن ایک یہ "مفکرِ قرآن" ہیں جو اپنی طرف سے ایک الزام گھڑتے ہیں، اور دل میں قطعاً یہ خوف نہیں کھاتے کہ یہ کچھ میں کس ذاتِ گرامی کے متعلق کہہ رہا ہوں! اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق، جو انسانی شرف و عظمت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہے، اور جس کی اخلاقی فضائل کی رفعتوں پر، خود خدائے قدوس گواہ بن کر یہ فرماتا ہے کہ ﴿ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴾ وہ ہستی، جس کے نقوشِ قدم، ہر اس خوش بخت انسان کے لیے، جو دنیا سے لے کر آخرت تک کے سفر کا مسافر ہو، دلیلِ راہ اور خضرِ طریق ہیں۔ اس ذاتِ گرامی کے خلاف، مالی بددیانتی اور گڑبڑ کے الزامات عائد کرنا، اور خدا کے غضب سے نہ ڈرنا، اس کی جرأت، اسی شخص کو ہو سکتی ہے جس کے دل میں خدا کے حضور پیشی کا تصور تک نہ ہو، اور یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ "مفکرِ قرآن" کے دل و دماغ میں، اللہ تعالیٰ کی اُخروی عدالت میں جواب دہی کا شائبہ تک نہ تھا، کیوں کہ صرف اور

صرف خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کا شدید احساس ہی، انسان کو ایسی حرکات سے باز رکھ سکتا ہے۔ خود، پرویز صاحب ہی کا قول ہے:

"کسی کے خلاف، افتراء پردازی اور کذب بیانی سے، انسان کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے، اور وہ یہ کہ کہنے والے کو اس کا احساس ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، اسکے متعلق، اس کے خدا کے ہاں باز پرس ہوگی۔ اگر اس خیال کو دل سے نکال دیا جائے تو پھر اسے کوئی چیز تہمت تراشیوں اور کذب بافیوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔" ❶

اب اگر "مفکرِ قرآن" کائنات کی بلند ترین ہستی پر بھی کذب بافی اور تہمت تراشی سے باز نہیں رہتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا و آخرت پر ان کا ایمان، زبانی کلامی حد تک ہو تو ہو، ورنہ ان کی سیرت و کردار میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، اور نظر آئے بھی کیسے جبکہ زبانی کلامی ایمانِ آخرت کو بھی تاویل و تحریف کا نشانہ بنا کر، وہ جنت و دوزخ کو، عالمِ بعد الموت سے کھینچ کر، اسی دنیا میں لے آتے ہیں۔

پھر یہ شخص شاطر و عیار ایسا کہ منافقین کے نام کی آڑ میں، حضور اکرم ﷺ پر ایسا سنگین الزام لگاتے ہوئے، منافقین کو "بدنہاد، کمینہ فطرت" اور اس الزام پر "معاذ اللہ" بھی کہتا ہے تاکہ ان الفاظ کو یہ کہہ کر اپنی بے گناہی کی دلیل بنا لیا جائے کہ جو، اس الزام کے باعث، منافقین کو بدنہاد اور کمینہ کہتا ہے وہ خود الزام تراشی کیسے کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب کے کفر و الحاد اور زندقہ و ضلالت کے جملہ امور کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو حضرت نبی آخر الزمان ﷺ پر یہ افتراء پردازی اور بہتان تراشی، بجائے خود، سب سے بڑا کفر ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ منکرینِ حدیث، اس صریح توہینِ رسول اور گستاخیٔ پیغمبر پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ کہیں گے:

"جن احباب کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس امر کی شہادت دیں

❶ طلوعِ اسلام فروری ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۲

گئے کہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ حضور اکرمؐ کا اسمِ گرامی ان کے لب پر آیا، یا ان کے لیے فردوسِ گوش بنا ہو، تو ان کی آنکھ کے آبگینے سے آنسو نہ چھلک پڑے ہوں۔" ❶

اگر واقعی، ان کی آنکھ کے آبگینوں سے چھلکنے والے ان آنسوؤں کے پسِ پردہ، ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا جوہر موجود ہوتا، تو وہ حضور اکرم ﷺ کی ایسی شدید گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کجا یہ کہ عملاً اس کا ارتکاب ہو پاتا۔ اگر آنسو کسی کی صداقت پر کوئی لازمی دلیل ہوتے تو قرآن کریم یقیناً برادرانِ یوسفؑ کے آنسوؤں کی قدر کرتا اور حضرت یعقوبؑ کی شان کریمی انہیں موتی سمجھ کر چن لیتی، لیکن خدا کا جلیل القدر پیغمبر، ان آنسوؤں کو، دیکھ کر بھی، اگر یہی کہتا ہے کہ: ﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ﴾ تو ہمارا جواب بھی پرویز صاحب کے آنسوؤں پر یہی فرمانِ یعقوبی ہے۔

توہینِ حدیثِ رسولؐ اور تحقیرِ فرمانِ نبیؐ:

حضور اکرم ﷺ پر بہتان تراشی، اور ان کی شدید گستاخی کے بعد، یہ امر بھی ملاحظہ فرمایئے کہ "مفکرِ قرآن" صاحب اپنے پیروکاروں میں، حدیثِ رسولؐ کی توہین کے حوالے سے کس قسم کی ذہنیت پیدا کر گئے ہیں۔ بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ عربی زبان کا ایک شعر ہے۔

اذا كان رب البيت بالطبل ضاربا فلا تلم الاولاد فيه على الرقص

"جب صاحبِ خانہ خود طبلہ کی تھاپ پر اتر آئے، تو اس کی اولاد پر ملامت کی چنداں ضرورت نہیں، جبکہ وہ ناچنا شروع کر دیں۔"

جب "مفکرِ قرآن" خود، آخرت کی جوابدہی سے کورے ہو کر، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نشانہ بنانے سے نہیں شرماتے تو ان کی معنوی اولاد، آپؐ کے فرمودات کو استہزاء اور استخفاف کا نشانہ بنانے میں کیوں تامل کرے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے کہ: ((شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ

❶ طلوعِ اسلام، ورچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۹

مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ ۔)) ''شریعت میں بدترین امور، اختراعات ہیں، اور ہر اختراع ایک بدعت ہے، اور ہر بدعت ایک گمراہی ہے، اور ہر بدعت (کا انجام) جہنم ہے۔''

''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے چیلوں میں حدیثِ رسولؐ اور فرمانِ نبیؐ کے خلاف، جو بغض وعناد، اور عداوت وکینہ پیدا کر گئے ہیں، اسکی بنا پر وہ اس فرمودۂ پیغمبر کے متعلق سمجھتے ہیں کہ ایسی بات تو کسی انسان کے منہ سے صادر نہیں ہوسکتی کجا یہ کہ نطقِ رسول، اس کا مصدر قرار پائے۔ ان کے نزدیک ایسی بات کوئی جانور ہی اپنی زبان سے نکال سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے اس ''نادر تخیل'' کو، اپنے قارئین کے قلوب واذہان میں راسخ کر ڈالنے کے لیے، وابستگانِ طلوعِ اسلام، خود ایک پس منظر گھڑتے ہیں اور پھر ''علم جدید'' کے ساتھ، ''حسین امتزاج'' پیدا کرتے ہوئے، الفاظِ حدیث کو بندروں کے منہ میں ڈال کر، اس سے اُگلوا ڈالنے کے لیے، یوں داستان سرائی کرتے ہیں:

''میرے چھوٹے بھائی ورجینیا سٹیٹ یونیورسٹی امریکہ میں حیاتیات کے استاد ہیں۔ جب بھی وہ ملنے کے لیے آتے ہیں تو میں ان سے ارتقاءِ حیات اور ماحول اور بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے زندگی جو رویہ اختیار کرتی ہے، اس کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کرتا ہوں۔ ہماری گزشتہ ملاقات میں انہوں نے ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف کیا۔ ایک امریکی ماہرِ حیاتیات امریکہ میں پائے جانے والے کسی بندر نما جانور کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ یہ جانور اس علاقہ میں پیدا ہونے والی ایک مخصوص خودرو بوٹی کی جڑوں کو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ ایک دن مشاہدے کے دوران اس سائنس دان نے دیکھا کہ ایسے جانوروں کا ایک غول جنگل سے نمودار ہوا اور ایک چھوٹی سی پایاب ندی عبور کرکے ایک کھلے میدان میں آ گیا، اور اپنی مخصوص اور دل پسند بوٹیاں اکھاڑ کر ان کی جڑوں کو کھانے لگا اور جب اُن کی سیری ہوگئی تو ہر ایک نے ایک ایک دو دو بوٹیاں

ہاتھوں میں پکڑیں اور اپنے مسکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان جانوروں میں بوڑھے بھی تھے، ادھیڑ عمر کے بھی اور نوجوان بھی تھے۔ ندی پار کرتے ہوئے ایک نوجوان جانور کے ہاتھ سے ایک بوٹی ندی میں گر گئی۔ اس جانور نے دوڑ کر بوٹی کو پکڑ لیا جو اب بہتے پانی میں دھل کر صاف ستھری ہو گئی تھی۔ اب جو نوجوان نے اسے کھایا تو اسے پہلے کی نسبت زیادہ مزے دار معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے نوجوان دوستوں کو اس انکشاف سے آگاہ کیا، تو سب نوجوان جانوروں نے اپنی اپنی بوٹیاں دھونا شروع کر دیں۔ بوڑھے جانوروں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو پیشانی پر شکن ڈالے اور منہ میں غصے کے جھاگ بھرے فوراً فتویٰ دے دیا کہ یہ بدعت ہے اور: ((وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ.)) نوجوان جانوروں نے اپنے بزرگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو جواب ملا۔ ﴿ إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ ﴾ بس پھر کیا تھا قصہ دار و رسن چھڑ گیا۔ ادھیڑ عمر کے جانوروں نے دفع شر کے لیے بیچ بچاؤ کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ادھیڑ عمر کے جانور نوجوانوں کے ساتھ ہو گئے اور کچھ نے اپنے بزرگوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔'' [1]

یہ اقتباس اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ فرمودۂ رسول کی توہین فرمانِ خداوندی کی توہین کو مستلزم ہے۔ جو نبی کی قدر نہیں کرتا، وہ خدا کا بھی قدردان نہیں ہو سکتا۔ جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان کو، پیغمبر کے شایانِ شان سمجھنے کی بجائے، بندروں کے شایانِ شان جانتا ہے، اور دوان کے منہ سے اگلواتا ہے، وہ فرمانِ خداوندی کے ساتھ بھی، دانستہ یا نادانستہ یہی طرزِ عمل اپنانے پر مجبور ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ فرمانِ رسول کی تحقیر کرنے والا، توہینِ فرمانِ الٰہیہ سے گریز کر پائے۔ چنانچہ اس اقتباس میں، جس طرح حدیثِ رسول کو بندروں کے منہ سے اگلوایا گیا ہے، بالکل اسی طرح قرآنی آیت کو بھی انہی کی زبان سے اگلوایا گیا ہے، اور امر واقعہ یہ

[1] طلوعِ اسلام، مارچ اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۵۸

ہے کہ گفتۂ پیغمبر کا انکار واستخفاف کرنے والا شخص، فرمانِ خداوندی سے بھی یہی سلوک کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس قماش کی ذہنیت اور ایسی ذہنیت کو پیدا کرنے والی شخصیت، جسکے "اخلاق فضائل" وہ ہیں، جو گزشتہ، موجودہ، اور آئندہ ابواب سے واضح ہیں، جس قسم کی "قرآنی خدمات" انجام دے سکتی ہے، اس کا اندازہ قارئین خود ہی لگا لیں۔

استدراک بسلسلہ دار الاسلام:

کیا علامہ اقبالؒ، یکے از منکرینِ حدیث تھے؟ گزشتہ صفحات میں، سلیم الفطرت قارئین کے لیے، مختصر مگر تسلی بخش دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ علامہ اقبالؒ معتقدِ سنت اور حامیٔ حدیث تھے (نہ کہ منکرِ حدیث)۔ اس سلسلہ میں، مَیں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اگر واقعی علامہ اقبالؒ بھی، انکارِ حدیث کے حوالے سے، پرویز صاحب کے ہم مشرب ہوتے، تو وہ دار الاسلام کی سکیم کے لیے، انہیں تجویز فرماتے، نہ کہ اُس مودودیؒ کو، جو اول روز سے آخری ساعتِ حیات تک، حجیتِ حدیث اور سندیتِ سنت کے قائل ہی نہیں بلکہ علم بردار بھی رہے ہیں۔

یہ کتاب، اشاعت کے لیے، ادارہ بیت الحکمت کو بھیجی جا چکی تھی کہ ایک حوالہ کی تلاش میں، مجھے طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء کا شمارہ دیکھنا پڑا جس میں میرے اٹھائے ہوئے مندرجہ بالا سوال سے تعرض کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ عبارت پہلے بھی میرے مطالعہ میں آ چکی تھی اور میں اسے اپنے حوالہ جات کی فہرست میں درج بھی کر چکا تھا لیکن چونکہ ہر وقت، ہر حوالہ، انسان کے ذہن میں مستحضر نہیں رہتا، اس لیے، مندرجہ بالا سوال اٹھاتے وقت، یہ عبارت نظرانداز ہو گئی۔ اب میں اس اقتباسِ پرویز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، "استدراک بسلسلہ دار الاسلام" کے زیرِ عنوان، باب کے آخر میں شاملِ کتاب کر رہا ہوں۔ چنانچہ پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"علامہ اقبالؒ، ایک قرآنی مرکز قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں دنیائے اسلام کے

ممتاز اہلِ علم و تحقیق، مختلف موضوعات پر ریسرچ میں مصروف ہوں، مذاکروں کا اہتمام ہو، خطبات کا انصرام ہو، طلبا تعطیلات گزارنے وہاں آئیں اور اس علمی فضا سے بہرہ یاب ہوں۔ ان کے ایک والہانہ عقیدت مند، چوہدری نیاز علی خان نے (جن کا حال ہی میں انتقال ہو چکا ہے) اس مرکز کے لیے، یوں کہیے کہ ایک جاگیر وقف کردی۔ اس کا نام دارالاسلام تھا۔ حضرت علامہ کا ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا، لیکن جب اس کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو ان کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ سر دست کوئی ایسا شخص دیکھا دینا چاہیے، جو اس کے مبادیات کی دیکھ بھال کر سکے۔ پہلے خیال ہوا کہ میں ملازمت چھوڑ کر، وہاں چلا جاؤں، لیکن قائداعظم نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میرے اور چوہدری صاحب مرحوم کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس کام کے لیے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ انہوں نے (غالباً حضرت علامہ کے استصواب سے) مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مودودی صاحب، ان کی اس دعوت پر دارالاسلام جانے کے لیے، پہلے دہلی آئے۔ میرے ہاں ان کی نشستیں بھی رہیں.... ان نشستوں میں، جو میرے ہاں ہوئی تھیں، مجھے ان میں انانیت کے جراثیم کی جھلک نظر آئی تھی، لیکن میں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔"[1]

تین دعاوی:

اس عبارت میں، تین دعاوی پیش کیے گئے ہیں۔

(۱) پرویز صاحب نے دارالاسلام کی ذمہ داری اس لیے قبول نہ کی کہ قائداعظم نے انہیں اس کی اجازت نہ دی۔

(۲) دارالاسلام میں مودودی صاحب کو دعوت دینے میں پرویز صاحب کا مشورہ بھی شامل تھا۔

(۳) مودودی صاحب میں، پرویز صاحب کو انانیت کے جراثیم دکھائی دیے۔

---

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۲ تا ۳۳

پہلے دعویٰ کا جائزہ:

جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ کہ دارالاسلام کی ذمہ داری، پرویز صاحب کو سونپی جا رہی تھی، لیکن انہوں نے قائداعظم کے فرمان کی تعمیل میں، اسے قبول نہ کیا، تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے، جو نہ علامہ اقبالؒ کی کسی تحریر سے ثابت ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کے کسی ایسے فرمان سے، جس میں انہوں نے پرویز صاحب کو یہ ذمہ داری قبول کرنے سے منع کیا ہو۔ ایسے بلند بانگ دعاوی، وہ خود، اپنی روشِ خودستائی، عادتِ لاف زنی اور خوئے کذب بیانی کی بنیاد پر کیا کرتے تھے تاکہ ان کے اندھے مقلدین، ان کے حق میں جَلّی ثَنَاءُ لکَ کا ورد کرتے رہیں۔ جو شخص، علامہ اقبالؒ پر انکارِ حدیث اور دین و مذہب میں معنوی مغایرت کے حوالے سے بہتان تراشی کر سکتا ہے، وہ اپنے (جھوٹے) وقار کی بلندی کے لیے کونسا جھوٹ نہیں گھڑ سکتا؟ اس مقصد کے لیے، وہ بعض اوقات، دوسروں کے کارناموں کا سہرا بھی اپنے سر باندھنے سے چوکا نہیں کرتے تھے۔

پھر اس واقعہ کو بیان کرتے بھی ہیں، تو بغیر کسی حوالہ کے، گول مول انداز میں بیان کرتے ہیں: ..... ''پہلے خیال ہوا کہ میں ملازمت چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں، لیکن قائداعظم نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔'' ..... پہلے خیال ہوا ..... کس کا خیال ہوا؟ علامہ اقبالؒ کا؟ چوہدری نیاز علی صاحب کا؟ (جو اپنی زمین کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کیے ہوئے تھے) یا خود اُن کا اپنا خیال ہوا؟ آخر یہ واضح تو کیا ہوتا کہ کسے خیال ہوا؟ پھر اس کا کوئی تاریخی ثبوت؟

لیکن اس سو فی صد جھوٹ کو، اگر (بفرضِ محال، اور بر سبیلِ تنزل) صحیح اور سچ بھی سمجھ لیا جائے، تب بھی یہ اُس زمانہ کی بات ہے، جب پرویز صاحب، مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر، معتقدِ سنت بن کر، حمایتِ حدیث ہی نہیں، بلکہ دفاعِ حدیث میں مصروفِ جہاد تھے اور منکرین حدیث کے تمام گروہوں کے خلاف، جن میں ''امتِ مسلمہ امرتسر'' بھی شامل ہے، کی تردید و ابطال کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں وہ نیاز فتح پوری کے ماہنامہ نگار میں چھپنے والے ان عقائد و نظریات کی بھی مخالفت کیا کرتے تھے، جو بعد میں، خود ان کا وظیفۂ لسان و قلم بنے رہے۔ رہے علامہ اقبالؒ، تو ان کا تو مسلک تھا ہی قرآن و سنت، جیسا کہ گزشتہ صفحات کی بحث سے عیاں ہے۔ تب اگر علامہ

اقبالؒ (یا کسی اور کا) یہ خیال ہوا بھی ہو کہ دارالاسلام کے لیے پرویز صاحب کو دعوت دی جائے، تو یہ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کے تحت ہی ہوا ہوگا کہ پرویز صاحب، واقعی قرآن و سنت کے علمبردار تھے ۔ علامہ اقبالؒ (یا کوئی اور صاحب) عالم الغیب اور علیم بذات الصدور تو تھے نہیں کہ ان کے دل میں جھانک کر، حقیقت کو پا لیتے ۔ لیکن یہ توجیہہ بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ یہ واقعہ صحیح قرار پائے، اور اس کا صحیح و صادق ہونا، بجائے خود محتاج ثبوت بھی ہے اور امر محال بھی۔

دوسرے دعویٰ کا جائزہ:

پرویز صاحب کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دارالاسلام کے لیے، مودودی صاحب کو تجویز کرنے میں ان کا مشورہ بھی شامل تھا۔ یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے کوئی چپڑاسی یہ کہے کہ فلاں صاحب وجاہت لیڈر کو منصب وزارت کے ملنے میں میرا مشورہ بھی شامل ہے۔ حالاں کہ جس دور میں، دارالاسلام کی ذمہ داری کے لیے کسی موزوں عالم دین کی تلاش تھی، اُس میں، پرویز صاحب کی حیثیت، اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ اُن کے اکا دُکا مضامین، مختلف جرائد میں جگہ پا لیتے تھے۔ اُن کے طلوع اسلام کا پہلا شمارہ بھی، وفات اقبالؒ کے ہفتہ عشرہ بعد، منظر عام پر آیا تھا۔ کسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے بھی، اُن کا کوئی مقام نہ تھا۔ اُن کی سب سے پہلی کتاب ''معارف القرآن جلد اول'' بھی علامہ اقبالؒ کی وفات کے تقریباً تین سال بعد شائع ہوئی تھی، جبکہ اس کے بالمقابل، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اُس دور میں، اسلامی صحافت کے آسمان پر، ایک نیر تاباں تھے۔ تاریخ، سیاسیات و قانون، فلسفہ، اخلاق و عقائد کے باب میں اور بعض کتب کے تراجم کے سلسلہ میں ان کی متعدد کتب علامہ اقبالؒ کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ چند ایک کا تذکرہ درج ذیل ہے:

☆ **تاریخ** ... ''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ'' ۔ ۱۹۲۸ء۔ عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، تیسرا ایڈیشن بھی حیدر آباد ہی سے شائع ہوا۔ آخری دونوں ایڈیشن نواب بہادر یار جنگ نے مولانا کی اجازت سے شائع کیے، ان کی رائلٹی بھی مولانا کو ادا کی گئی۔

☆ **تاریخ**..... "تاریخ آل سلجوق"۔ ۱۹۲۹ء

☆ **تاریخ**..... "سیرتِ نظام الملک آصف جاہ اول"۔ ۱۹۲۹ء۔ حیدرآباد دکن۔ بعد میں یہ کتاب مضامین کی شکل میں، الجمعیت کے ماہ جون ۱۹۲۶ء کے مختلف شماروں میں بھی شائع ہوئی تھی۔

☆ **تاریخ** ..... "دکن کی سیاسی تاریخ" ۔ ۱۹۳۵ء۔ سید شبیر علی حاتمی نے دارالاشاعت، اشاعت منزل، اردو بازار، حیدرآباد دکن سے شائع کی۔

☆ **سیاسیات و قانون**..... "الجہاد فی الاسلام"۔ ۱۹۳۰ء۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

☆ **ایضاً**..... "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش اوّل"۔ ۱۹۳۷ء۔ ترجمان القرآن۔

☆ **فلسفہ**..... "مسئلہ جبر وقدر"۔ ۱۹۳۳ء۔

☆ **معاشرت، عمرانیات و اخلاقیات**..... "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی"۔ ۱۹۳۳ء۔

☆ **اخلاق وعقائد** ..... "رسالہ دینیات"۔ ۱۹۳۷ء۔ سررشتہ تعلیمات، حیدرآباد دکن۔

☆ **تراجم** ..... "المرأۃ الجدیدہ (قاسم امین)"۔ ۱۹۱۵ء۔ یہ ترجمہ بوجوہ شائع نہ ہوسکا۔ مولانا کی ذہانت وقابلیت کہ ۱۲ سال کی عمر میں یہ کام کر ڈالا۔

☆ ..... "الاسلام والاصلاح (الشیخ عبدالعزیز شاویش)"۔ ۱۹۱۹ء۔

☆ ..... "تحریکِ خلافت کے دورِ شباب"۔ ۱۹۲۲ء۔ دارالاشاعت، سیاسیات شرقیہ، دہلی۔

☆ ..... "سمرنا میں یونانی مظالم"۔ ۱۹۲۲ء۔ دارالاشاعت، سیاسیاتِ شرقیہ، دہلی۔ ❶

ان کتب کے علاوہ، علامہ اقبالؒ کی زندگی میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہ بیشمار نگارشات

❶ عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۶

بھی ہیں جو بحیثیتِ مدیر آپ کے قلم سے نکلیں۔ پروفیسر افتخار احمد مرحوم فرماتے ہیں:

"ابھی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی، آپ کی تحریریں، مدینہ بجنور، مسلم، پیام حق لاہور، ماہنامہ رہبر دکن، تاج جبل پور، ہمایوں، تمدن، نگار، خلافت دہلی، ترجمان القرآن، الجمعیت، معارف اور برصغیر پاک و ہند کے دیگر چوٹی کے جرائد میں موجود ہیں۔" ❶

اور یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ علامہ اقبالؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کا نہ صرف مطالعہ کیا کرتے تھے، بلکہ ان سے متاثر بھی تھے، اور علامہ اقبالؒ، باوجود یہ کہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ستائیس اٹھائیس سال بڑے تھے، مولانا محترم کو معنوی پدر جانتے ہوئے بنظرِ احترام دیکھا کرتے تھے۔

"سید صاحبؒ کے ساتھ، محبت کا رشتہ استوار کرنے میں، یہ پہلو اقبالؒ کے مدِ نظر تھا۔ وہ الجہاد فی الاسلام اور ترجمان القرآن کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور انہیں پنجاب منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔

اقبالؒ اور ابوالاعلیٰؒ کے تعلق میں، ہم سید صاحبؒ کی بے ریا، سیر چشم اور بے باک شخصیت کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔ لاہور میں، وہ اقبالؒ سے ملے اور دارالاسلام کے منصوبے پر اتفاقِ رائے ہو چکا، تو ان سے عرض کیا "میری ایک بات آپ مان لیجئے۔ سر کا خطاب واپس کر دیجئے کہ یہ آپ کو جچتا نہیں"۔ بعد میں ایک ذاتی دوست کو، ابوالاعلیٰؒ نے بتایا کہ یہ بات سن کر اقبالؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سید کو ملال ہوا کہ انہوں نے اقبالؒ کو رنجیدہ کر دیا۔ کیا اقبالؒ، اس بات پر رنجیدہ تھے کہ ۳۴ سالہ سکالر نے، جسے انہوں نے معنوی پدر کی نگاہ سے دیکھا تھا، اس کمزوری کا ذکر کیا؟ یا اس پر کہ انہیں اس خطاب کے قبول کرنے کی یاد نے دل گرفتہ کر دیا تھا؟" ❷

الغرض، اُس دور میں، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی علمی شہرت کے مقابلہ میں، پرویز صاحب کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی کہ وہ تجویز یا سفارش کرتے اور اس بنا پر مولانا مودودیؒ کو دارالاسلام کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ مولانا محترم کی عالمانہ تحریروں اور ان کی علمی وجاہت سے اقبال خود اس قدر

---

❶ عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین ... سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۱۱۷

❷ مقالہ "مردِ آزاد" (از ہارون الرشید، ممتاز کالم نویس اور ادیب، اسلام آباد) ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۳ء، صفحہ ۱۲۷ تا ۱۲۸

متاثر تھے کہ انہوں نے از خود انہیں دعوت دے کر یہ ذمہ داری سونپی۔ پرویز صاحب کا اسے اپنا تجویز یا مشورہ قرار دینا، نہ صرف لغو اور خلافِ حقیقت ہے، بلکہ: ﴿ يُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ﴾ کا مصداق بھی ہے، خصوصاً جبکہ "مفکر قرآن" جھوٹ بولنے کے عادی بھی تھے۔

تیسرے دعویٰ کا جائزہ:

پرویز صاحب کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ انہیں، اُن دنوں، سید مودودیؒ میں انانیت کے جراثیم نظر آئے۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ انانیت کے یہ جراثیم دیکھ کر بھی، اگر انہوں نے نہ صرف یہ کہ چنداں اہمیت نہ دی، بلکہ اس کے باوجود، دارالاسلام کے منصوبہ کی تکمیل کے لیے، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہی کے حق میں مشورہ دیا تھا، تو اُن کا یہ مشورہ خیانت کارانہ اور احمقانہ مشورہ تھا، جس کی توقع کسی ایسے شریف النفس انسان سے نہیں کی جا سکتی، جو تہہ دل سے اسلام اور امتِ مسلمہ کا خیر خواہ ہو۔ پھر انانیت کے ان جراثیموں کا ذکر، اس دور میں نہ کرنا، بلکہ اس کے برعکس، ایک مدت تک طلوع اسلام میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اوصافِ حمیدہ، مناقبِ جلیلہ، خصائلِ حسنہ اور فضائلِ علیہ بیان کرتے رہنا، اور اس واقعہ کے تقریباً اڑتیس انتالیس سال بعد، یہ ذکر کرنا کہ انہیں، مولانا مودودی میں انانیت کے جراثیم نظر آئے تھے، خود "مفکر قرآن" ہی کے قلبی روگ کا آئینہ دار ہے۔

جس شخص نے بھی طلوع اسلام کی فائل کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خود پرویز صاحب میں انانیت کے جراثیم بدرجہ اتم موجود تھے، لیکن اپنے اس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، وہ اس کا الزام اپنے مخالفین کے سر تھوپا کرتے تھے، تاکہ ان کے اپنے عیب کی طرف لوگوں کی نگاہیں نہ اٹھ سکیں۔ وہ اپنے آپ کو قرآنی تعلیمات کا چیمپئن سمجھا کرتے تھے اور طلوع اسلام ہی کو دعوت قرآنی کا واحد آرگن کہا کرتے تھے۔ ان کی انانیت اور غرورِ علم کا یہ عالم تھا کہ وہ دوسرے اہل علم کو اپنے مقابلے میں، ہیچ، کم علم ہی نہیں بلکہ بے علم، قرآن سے بے بہرہ اور کتاب اللہ کی ابجد تک سے ناواقف قرار دیا کرتے تھے۔ انانیت کے ساتویں آسمان پر محو پرواز ہوتے ہوئے دوسروں کو بنظرِ حقارت دیکھنا، اور کوتاہی کے انداز میں انہیں نصیحت کرنا، ان کا

وطیرہ تھا۔ انانیت اور غرورِ علم کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حدیث میں حتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتك کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اپنی کتاب "قوانینِ اسلام" میں دیا ہے۔ عسیلة کے بارے میں، "مفکرِ قرآن" سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی انانیت جوش میں آجاتی ہے اور وہ اپنی ہمہ دانی کا رعب جماتے ہوئے، یوں طنز کرتے ہیں:

"ایسے کثیر الاستعمال لفظ کا اس قدر طفلانہ اور مضحکہ خیز ترجمہ، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ فاضل مولف کی علمی سطح کیا ہے، اور انہیں کتبِ حدیث وفقہ پر کس قدر عبور حاصل ہے۔" ●

لیکن، خود "مفکرِ قرآن" کی طرف سے ایسے کثیر الاستعمال لفظ کا (اعراب کے ذریعہ) اس قدر طفلانہ اور مضحکہ خیز تلفظ، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ خود ان کی اپنی علمی سطح کیا ہے اور عربی الفاظ کے تلفظ سے وہ کس قدر واقف ہیں۔ یہاں انہوں نے لفظ عسیلة کو چار مرتبہ استعمال کیا ہے اور اس کا تلفظ عَسَیْلَۃ قرار دیا ہے، حالاں کہ یہ عُسَیْلَۃ برفع العین ہے، نہ کہ بفتح العین۔

(۲) ایک مقام پر، "اقتباس العلم" کو استعمال کرتے ہوئے، ڈاکٹر صبح الدین کے متعلق یہ لکھا گیا ہے:

"فاضل مصنف کا عربی زبان کا علم کچھ واجبی سا معلوم ہوتا ہے۔" ●

اور یہ "واجبی علم" کا فتویٰ وہ شخص عائد کر رہا ہے، جو خود عُسَیْلَۃ کے صحیح تلفظ اور درست اعراب سے قطعی جاہل و بے خبر ہے۔

(۳) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے متعلق تحقیر آمیز فرماتے ہیں:

"قریشی صاحب کو کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے؟ اور اسلام کیا کہتا ہے؟" ●

● طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹

● طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۹

● طلوعِ اسلام، یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص: ۱۷

(۴) مولانا مودودیؒ کے متعلق، پرویز صاحب، انانیت کی انتہائی بلندیوں پر براجمان ہو کر، لکھتے ہیں:

"یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر۔" ❶

(۵) ایک اور مقام پر، مولانا مودودی ہی کے متعلق یہ فتویٰ رسید کرتے ہیں:

"یہ صاحب، قرآنی حقائق و تصورات کی ابجد تک سے نابلد ہیں۔" ❷

(۶) مولانا مودودی مرحوم ہی کے متعلق، اپنی ہمہ دانی کے تبختر میں، یہ اعلان کیا جاتا ہے:

"جہاں تک آئینی معاملات کے سمجھنے کا تعلق ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔" ❸

(۷) جملہ علماء کرام کے متعلق یہ فتویٰ داغا جا رہا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔" ❹

سوال یہ ہے کہ کیا کبھی مولانا مودودیؒ نے بھی اہلِ علم کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟ اس سے خود اندازہ لگا لیجیے کہ انانیت کے جراثیم، کس میں پائے جاتے ہیں؟ سید مودودی میں یا غلام احمد پرویز میں؟

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۹

❷ طلوعِ اسلام، ۳، ستمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۷

❸ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۱

❹ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۶ء، صفحہ ۹

باب ۶

ناپ تول کے دوہرے معیار

جب آپ دیکھیں کہ کوئی شخص، دُہرے معیار رکھتا ہے، ایک اپنے لیے اور ایک دوسروں کے لیے۔ وہ جب لینا چاہتا ہے تو اس کے ترازو اور باٹ، اُن ترازوں اور باٹوں سے مختلف ہوتے ہیں، جو وہ دوسروں کو دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جانچ پڑتال کے لیے اس کی اپنی کسوٹی، اور ہوتی ہے اور دوسروں کو پرکھنے کے لیے وہ کوئی اور کسوٹی استعمال کرتا ہے۔ اپنوں اور غیروں، یگانوں اور بیگانوں کے لیے، الگ الگ پیمانوں کا وجود، اس بات کی علامت ہے کہ وہ عدل و انصاف سے ہٹی ہوئی روش اپنا رہا ہے، تو ایسے شخص کو دیکھتے ہی یہ سمجھ لیجیے کہ اس کی ایسی کاروائی کی تہہ میں جھوٹ ہی جھوٹ پایا جاتا ہے۔

''مفکرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کو، ہم نے ہمیشہ دُہرے معیار کا حامل پایا ہے، اور عدل و انصاف کے یکسر منافی، کذب و زور کی روش پر گامزن دیکھا ہے۔ ایک بات اگر جماعت اسلامی کے افراد کہیں تو وہ قابلِ اعتراض قرار پاتی ہے، لیکن وہی بات، اگر پرویز صاحب خود کہیں، تو نہ صرف یہ کہ قابلِ اعتراض نہیں بلکہ لائقِ تحسین بھی قرار پاتی ہے، اور اس میں ''قرآنی مصالح'' پائے جاتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل، اس امر کا غماز ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے سینے میں، حسد و کینہ کی بھڑکتی ہوئی آگ، انہیں ہمیشہ اپنے مخالفین کے خلاف اکسائے رکھتی تھی، جس کے نتیجہ میں، انہیں، اپنی مبغوض ہستیوں کی برمحل بات بھی بے محل نظر آتی تھی۔ ان کی فہمائش، ایک طعن دکھائی دیتی تھی، اور ہر نصیحت، ایک چوٹ۔ اس مخالفانہ بلکہ معاندانہ ذہنیت کے تحت، وہ اپنے مخالفین کا نہایت خوردبینی مطالعہ کیا کرتے تھے، جس کے نتیجہ میں ان کی خوردہ گیری، عیب جوئی اور نکتہ چینی کی ''صلاحیتیں'' بہت ترقی پا چکی تھیں، ان صلاحیتوں کا ہلکا سا اندازہ، گزشتہ باب کی، ان دو مثالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جن میں مولانا مودودیؒ

کی اُن عبارتوں سے، جو خود پرویز صاحب کی عبارتوں سے ملتی جلتی عبارتیں ہیں، وہ مفہوم وہ نکالتے ہیں، جو ان کی اپنی عبارتوں سے مختلف ہوتا ہے، ان میں سے ایک مثال وہ ہے جس میں وہ مولانا مودودیؒ کی ''یک گونہ مزاحمت'' سے جو مفہوم نکالتے ہیں، وہی مفہوم، اپنی ''مطلق مماثلت'' والی عبارت سے نہیں نکالتے، حالانکہ یہ عبارت، اقتباسِ مودودیؒ سے زیادہ سنگین عبارت ہے، اور دوسری مثال وہ ہے جس میں دونوں (مولانا مودودیؒ اور پرویز صاحب) کی عبارتیں، دین کا یہ تصور پیش کرتی ہیں کہ متمرد، سرکش اور جاہل افراد کے ہاتھوں سے اقتدار ''چھین لیا جائے'' اور نفاذِ اسلام کے لیے نیکوکار اور پاکیزہ انسانوں کے سپرد کیا جائے، لیکن مولانا مودودیؒ کی عبارت سے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کو ''فاشست عزائم'' کی بو آتی ہے، اور خود ان کی اپنی عبارت، مطالبۂ دین، تقاضائے اسلام اور مطلوب و مقصودِ مومن قرار پاتی ہے۔ دوہرے معیار کی ان دونوں مثالوں کے بعد، اب تیسری اور پھر اس کے بعد، بقیہ مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

دوہرے معیار کی تیسری مثال:

۱۹۵۵ء میں، بلوچستان کے کسی غیر معروف رسالہ میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس سے طلوعِ اسلام نے جو نتیجہ نکالا، اور جو کچھ اس پر تبصرہ کیا، وہ اُسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے، طلوعِ اسلام ''نیا فرقہ'' کے زیرِ عنوان لکھتا ہے:

> ''رشتہ مطلوب ہے'' کے زیرِ عنوان، جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں، ان میں آپ نے اس قسم کے الفاظ دیکھے ہوں گے، کہ ''سنی مسلمان کو ترجیح دی جائے گی'' یا ''حنفی المذہب کو ترجیح دی جائے گی''۔ اب یہ فرقہ پرستی ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے، چنانچہ جماعت کے ترجمان قاصد (کوئٹہ) کی ۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے:
>
> ''میرے لڑکے کے لیے رشتے کی ضرورت ہے، لڑکی پابندِ صوم و صلوٰۃ ہو، قوم و جہیز وغیرہ کی کوئی قید و شرط نہیں، البتہ جماعتِ اسلامی سے متعلق گھرانے کو ترجیح دی جائے گی۔''

جب ان حضرات سے پوچھیں گے تو یہ جواب میں کہیں گے تو یہ کہیں گے کہ... " یہ ٹھیک ہے کہ رشتۂ ازدواج میں خیالات کی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے، اس میں فرقہ پرستی کی کون سی بات ہے؟" ... لیکن جب یہی دلیل، مرزائی حضرات، اپنے اس مسلک کے جواز میں پیش کرتے ہیں کہ غیر احمدیوں سے رشتۂ مناکحت جائز نہیں، تو یہی جماعت اسلامی والے، ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ یہ جماعت کس طرح قدم بقدم مرزائیت کے پیچھے چلی جا رہی ہے، اور دونوں کی مدعی ہیں کہ ؎

آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے ❶

لیکن ہم کہتے ہیں کہ "یہ فرقہ پرستی اب ایک قدم نہیں، کئی قدم آگے بڑھ گئی ہے، اور اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ دیوبندی، بریلوی، سنی، شیعہ اور اہل حدیث، سب کو پیچھے چھوڑ گئی ہے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسے آگے بڑھانے میں، جس قدر مستعدی، سرگرمی اور جوش کا مظاہرہ، طلوع اسلام نے کیا ہے، کسی اور نے کاہے کو کیا ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے، طلوع اسلام کے "ضرورت رشتہ" کی نوعیت کے چند اشتہارات۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ سب کے سب اشتہارات، ۵/مارچ ۱۹۵۵ء کے بعد کے اشتہارات ہیں:

(۱) ... ایک غریب لیکن شریف خاندان کی اٹھارہ سالہ بچی کے لیے، جو گھریلو ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی اہل، اور قرآن کریم کی سادہ تعلیم سے بہرہ ور ہے، ایسے رشتہ کی ضرورت ہے جو قرآنی تعلیمات کا پابند ہو۔ جہیز وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ ❷

(۲) ... ایک برسرِ روزگار، خوش اخلاق، اور کنوارے نوجوان کے لیے، ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے۔ ان کی عمر تقریباً ۲۵ سال اور ماہوار آمدنی دو صد روپے ہے۔ رشتہ کے لیے ذات پات، اعلیٰ تعلیم یا جہیز کی کوئی قید نہیں البتہ لڑکی کا **قرآنی فکر کا** حامل ہونا ضروری ہے۔ (تفصیلات صیغۂ راز میں رہیں گی۔) ❸

❶ طلوع اسلام، ۲۶/مارچ ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۷ ❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۰ء، صفحہ ۶۳
❸ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۵۲

(۳)......قرآنی تعلیمات سے دلی وابستگی رکھتے ہوئے، طبعاً یہ چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی کا رشتہ قرآنی احباب کے حلقہ میں کروں تاکہ اسے شرفِ انسانیت نصیب ہو، اور وہ محض غلام بن کر نہ رہ جائے۔ لڑکی ان پڑھ ہے اور میں خود اس قدر غریب کہ جہیز وغیرہ رسوم کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ●

(۴)......قرآنی فکر سے وابستگی کی بنا پر، اسی حلقۂ احباب سے مجھے اپنی دو عزیز بچیوں (عمر ۱۶، ۱۷ سال) کے لیے رشتہ درکار ہے، مالی بے چارگی کی وجہ سے، ان بچیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلا سکا۔ بڑی لڑکی درجہ سوم تک تعلیم حاصل کر چکی ہے، اور چھوٹی لڑکی مڈل کے امتحان میں ہے۔ ●

(۵)......میں ایک سرکاری ملازم ہوں، اور میرے لیے یہ باعثِ اطمینان و مسرت ہوگا کہ میری عزیزہ بیٹی، عمر ۲۵ سال، جو میٹرک تک تعلیم حاصل کر چکی ہے، اپنے حلقۂ فکر کے کسی موزوں اور تعلیم یافتہ سلیم بیٹے کی شریکِ حیات بن سکے۔ ●

(۶)......ایک پنجابی ڈاکٹر (ایم بی بی ایس) سلیقہ شعار، بلند خیال، ناکتخدا لڑکی کے لیے تعلیم یافتہ سلیم الطبع، قرآنی فکر کے شائق برسر روزگار لڑکے کے رشتے کی ضرورت ہے، عمر ۳۰-۳۵ سال کے درمیان۔ ●

(۷)......ایک پنجابی ریٹائرڈ اسسٹنٹ انجینئر کی سلیقہ شعار، بلند خیال (عمر ۲۰ سال) ایف اے کی طالبہ ناکتخدا لڑکی کے لیے، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، قرآنی فکر کے شائق، برسرِ روزگار لڑکے (عمر ۲۵-۳۰ سال کے درمیان) کے رشتے کی ضرورت ہے۔ ●

(۸)......ایک نہایت شریف گھرانے کی سلیقہ شعار، ناکتخدا لڑکی کے لیے، جو بی اے کر چکی ہے، ایک تعلیم یافتہ اور فکرِ قرآنی کے شائق برسرِ روزگار لڑکے کے رشتہ کی ضرورت ہے، عمر ۲۵، ۳۰ سال کے درمیان ہو۔ ●

● طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۹۲
● طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۹
● طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۹۶
● طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۷۷
● طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۷۱
● طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹۲

(۹) ...ایک تیس سالہ کنوارے گریجویٹ نوجوان، جس کی تنخواہ ۳۲۵ روپے ماہوار ہے، اس کے لیے، فکرِ قرآنی کا شائق رشتہ درکار ہے، ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ ❶

(۱۰) ...دہلی کے ایک معزز اور متوسط گھرانے کی ایم اے بی ایڈ پی سی، برسرِ روزگار اور خانہ داری سے واقف دوشیزہ کے لیے قرآنی فکر سے ہم آہنگ پڑھے لکھے سلیم الطبع، با روزگار لڑکے کا رشتہ مطلوب ہے۔ ❷

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

یہ صرف دس اشتہارات ہیں، ورنہ طلوعِ اسلام کے صفحات میں بیسیوں ایسے اشتہارات اور بھی موجود ہیں، فرقہ پرویزیت اور دیگر مکاتبِ فکر کے اشتہارات کے تقابلی مطالعہ سے چند باتیں بالکل نکھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔

اولاً: ... یہ کہ سنی یا حنفی المذہب یا جماعتِ اسلامی کے متعلقہ گھرانے کے رشتہ کو صرف ترجیح دینے کا ذکر ہے، جس کا صاف معنی یہ ہے کہ ان رشتوں کے علاوہ دیگر رشتے بھی قابلِ قبول ہیں، لیکن طلوعِ اسلام کے اشتہاروں میں، ترجیحی اور غیر ترجیحی رشتوں میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلوعِ اسلام سے وابستہ افراد، رشتوں کی تجویت میں قرآنی فکر کے حامل ہونے کی شرط کو ضروری قرار دیتے ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح مرزائی حضرات بھی قادیانیوں ہی سے رشتہ مناکحت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ثانیاً: ... یہ کہ مطلوب رشتوں میں، اگر خیالات کی ہم آہنگی کو پیشِ نظر رکھنا، یہ معنی رکھتا ہے کہ "قدم بقدم مرزائیت کے پیچھے چلا جائے" تو پھر طلوعِ اسلام کی یہ روش، سنی، حنفی المذہب یا جماعتِ اسلامی کے افراد سے کہیں آگے بڑھ کر ہے۔ ... آخر یہ کیا دُہرا معیار ہے کہ اگر ایک بات، کوئی اور کہے تو وہ "مرزائیت کا قدم بقدم اتباع کرنے والا" قرار پائے ... اور اسی بات کو اگر طلوعِ اسلام کہے ... اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ دسیوں اور بیسیوں مرتبہ کہے ... تو وہ ایسا قرار نہ پائے؟ آخر یہ ثنویت کیوں؟ اور یہ دوہرا معیار کس لیے؟

❶ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۶۱ ❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۱ء، صفحہ ۶۴

ثالثاً: ...... یہ کہ، جماعت اسلامی سے وابستہ افراد ہوں، یا سنی اور حنفی المذہب لوگ ہوں، وہ تو قابلِ ترجیح رشتوں میں "خیالات کی ہم آہنگی" کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وابستگانِ طلوعِ اسلام کی بھی یہی دلیل ہے؟ یا کوئی اور؟ اگر یہی دلیل ہے تو پھر ازروئے انصاف وعدل، جو حکم طلوعِ اسلام دوسروں پر عائد کرتا ہے، وہی حکم خود اس پر بھی عائد ہوگا۔ کیا طلوعِ اسلام، اس تقاضاءِ عدل کو پورا کرنے کے لیے جرأت، ہمت اور جوان مردی سے کام لینے کے لیے تیار ہے؟ یا اخلاقی نامردی کا مظاہرہ کرے گا؟ لیکن اگر طلوعِ اسلام، رشتوں کی قبولیت میں "خیالات کی ہم آہنگی" کے علاوہ، کوئی اور دلیل رکھتا ہے تو ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ: ﴿ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ ﴾

رابعاً: ... آخر میں طلوعِ اسلام نے یہ فتویٰ رسید کیا کہ ..... "جماعت اسلامی قدم بقدم، مرزائیت کے پیچھے چلی جا رہی ہے، اور دونوں مدعی ہیں کہ ؎

"آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے"

اس فتوائے پرویز پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

کرو خود، لیکن الزام دوسروں پر:

"مفکرِ قرآن" صاحب کی یہ مستقل عادت تھی کہ وہ اپنی غلط حرکات پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، ان حرکات کا مرتکب اپنے مخالفین کو قرار دے کر، ان کے خلاف بھرپور پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ وہ "کرو خود، مگر الزام دوسروں پر لگاؤ" کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے، وہ جھوٹ خود بولا کرتے تھے مگر الزام دوسروں پر لگایا کرتے تھے، وہ قرآن کے نام پر خود باطل پرست تھے، مگر الزامِ باطل پرستی اپنے حریفوں پر دھرا کرتے تھے، وہ خود بہتان تراش تھے، مگر اس قبیح عادت کو منسوب، دوسروں کی طرف کیا کرتے تھے، وہ خود تضاد گو تھے، مگر اپنی اصلاح کی بجائے، وہ دوسروں کو ایسا کہا کرتے تھے۔ اب یہاں دیکھیے، کہ کس صراحت اور وضاحت کے ساتھ، وہ، پراپیگنڈہ کرتے ہوئے لوگوں کے قلوب واذہان میں یہ بات راسخ کیا کرتے تھے کہ ؎

آؤ لوگو! کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

اور یہ پراپیگنڈہ بھی تکرار لبسیار، اور اعادہ واصرار کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ نورِ خدا کا مخزن و مصدر، صرف طلوعِ اسلام ہی ہے، اور صحیح فکرِ قرآنی، ماسوا طلوعِ اسلام کے اور کہیں سے میسر نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ اعلانات:......

(۱)......آج نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام عالمِ اسلامی میں، ادارہ طلوعِ اسلام، وہ واحد ادارہ ہے، جو قرآنی فکر کو عام کرنے کی، اور اس فکر کے مطابق معاشرہ کو تشکیل کرنے کے لیے سوچ رہا ہے اور کام کر رہا ہے۔ ❶

(۲)......آج پاکستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں صرف یہی ایک گوشہ ہے جہاں سے شمعِ قرآنی کی کرنیں بغیر کسی قسم کی رنگ آمیزی کے، اصلی اور حقیقی شکل میں فضا میں پھیل رہی ہیں۔ ❷

(۳)......یاد رکھیے، خالص اسلام صرف قرآن کریم کے سرچشمہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے، یہ وہ اسلام ہے جسے پیش کرنے کی سعادت، طلوعِ اسلام کو حاصل ہے۔ ❸

(۴)......سارے ملک میں لے دے کے ایک طلوعِ اسلام کی آواز تھی (اور ہے) جو صحرا میں کھوئے ہوئے، اس کارواں کے منتشر افراد کے لیے بانگِ درا تھی۔ ❹

(۵)......اس وقت، ملک جن ہنگامی حالات سے دوچار ہے، ان میں قوم کی راہنمائی کی اشد ضرورت ہے، اور یہ راہنمائی اسے طلوعِ اسلام کے سوا، اور کہیں سے نہیں مل رہی۔ ❺

مرزائی حضرات کہتے ہیں کہ ختمِ نبوت کے عقیدہ کی بنا پر مسلمانوں نے وحیِ خداوندی کا جو دروازہ، تیرہ سو سال سے بند کر رکھا تھا، اسے مرزا غلام احمد قادیانی نے کھول ڈالا ہے، لہٰذا ؎

آؤ لوگو! کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

اور ان کے قدم بقدم چلتے ہوئے، وابستگانِ طلوعِ اسلام کا بھی یہی اعلان ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد، قرآن کی آواز بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اب تیرہ چودہ صدیوں کے بعد پہلی

❶ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۵
❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۳
❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۵
❹ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۵
❺ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۵۱

مرتبہ یہ آواز طلوع اسلام نے بلند کی ہے۔ لہٰذا "آؤ لوگو! کہ یہیں نور خدا پاؤ گے" اس حقیقت کے عکاس صرف دو اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

(۱)......اس سرزمین سے تیرہ سو سال کے بعد، پہلی بار قرآن کی آواز اٹھی ہے، اور قدرت کو یہ منظور ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد، پھر قرآنی نظام، اپنی عملی شکل میں سامنے آ جائے۔ ❶

(۲)......صدر اول کے بعد، ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ ❷

الغرض، یہ تمام اقتباسات، اس امر پر شاہد عدل ہیں کہ "آؤ لوگو! یہیں نور خدا پاؤ گے" کی صدا بلند کرنے میں، پرویزیت اور مرزائیت دونوں ہم آہنگ بھی ہیں، ہم قدم بھی اور نتیجہ و مقصد کے اعتبار سے دونوں باہم متفق بھی ہیں، کیونکہ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے پھیر کر، انہیں، مرزا صاحب اور پرویز صاحب کا مطیع فرمان بنایا جائے۔ اول الذکر، نبوت زائفہ کی آڑ میں یہ کام کرتا ہے، اور ثانی الذکر، قرآن کا نام لے کر لوگوں کو اپنی آراء و تعبیرات کا پیروکار بنانا چاہتا ہے۔ بہر حال، تشابهت قلوبهم کے رشتہ میں منسلک، دونوں میں جو وجوہ مماثلت پائی جاتی ہیں، انہیں ایک مقام پر، مولانا مودودیؒ نے خوب واضح فرمایا ہے:

"جس طرح مرزائی حضرات، ایک جعلی نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے، رسول اللہ ﷺ کو درمیان میں لاتے ہیں، اسی طرح منکرین حدیث، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور کتاب اللہ کا تعلق کاٹ پھینکنے کے لیے، کتاب اللہ کو استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائیوں نے تمام امت کے متفقہ عقیدہ ختم نبوت کے خلاف، ایک نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا، اسی طرح منکرین حدیث نے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر کے ایک دوسرا خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا، حالانکہ خلفاء راشدین کے عہد سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان، ہر زمانے میں، اس بات پر متفق

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۱ ❷ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۲ء، صفحہ ۸۰

رہے ہیں کہ قرآن کے بعد، سنت دوسرا ماخذ قانون ہے، حتیٰ کہ غیر مسلم ماہرین قانون بھی بالاتفاق اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائی ختم نبوت کی غلط تاویل کرکے، ایک نیا نبی سامنے لے آتے ہیں، اسی طرح منکرین حدیث، اتباع سنت کی غلط تعبیر کرکے یہ راستہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ساری ہدایات و تعلیمات کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور کسی مرکز ملت کو ہر زمانے میں وہی حیثیت حاصل ہوتی رہے، جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھی۔ مرزائی اپنے نبی کی نبوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے، ذاتِ رسول میں نقص نکالتے ہیں، اور منکرین حدیث، اپنے مرکز ملت کے لیے راستہ بنانے کی خاطر، سنت رسول اللہ ﷺ کی عیب چینی کرتے ہیں۔" ❶

حقیقت یہ ہے کہ وابستگانِ طلوع اسلام، اپنی اس مماثلت کو، جو وہ مرزائیوں سے رکھتے ہیں، چھپانے کے لیے الٹا یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی قدم بقدم مرزائیت کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

دوہرے معیار کا ایک اور پہلو:

یہاں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اور اہل تشیع، سب کے سب اپنی دعوت پیش کر رہے ہیں اور یہی سمجھ کر پیش کر رہے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت دعوتِ حق ہے۔ اور خود منکرین حدیث بھی، اور مرزائی حضرات بھی (جو بالاتفاق کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں) اپنی دعوت کو، دعوتِ حق جان کر ہی پیش کر رہے ہیں، لیکن طلوع اسلام، عدل و انصاف کا دامن ترک کرتے ہوئے بھی اور اس کے ساتھ دوہرے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے بھی، نشانہ صرف جماعت اسلامی کو ہی بناتا ہے کہ وہ مرزائیت کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اگر طلوع اسلام میں عدل وانصاف کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ اپنے فتوی کو بے لاگ انداز میں، سب پر، حتیٰ کہ خود اپنے آپ پر بھی عائد کرتا۔ لیکن وہ سب سے صرف نظر کرتے ہوئے، صرف جماعت اسلامی کو ہی اس طرح موردِ الزام

---

❶ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۹

قرار دیتا ہے کہ یہ لوگ اپنی دعوت کو مرزائی حضرات کی طرح دعوت حق قرار دیتے ہیں، حالانکہ خود طلوع اسلام بھی اپنی دعوت کو، دعوتِ باطل سمجھ کر پیش نہیں کر رہا ہے، بلکہ دعوتِ حق جانتے ہوئے ہی پیش کر رہا ہے۔ آخر یہ دوہرا معیار کیوں؟ کہ آپ اپنی دعوت کو، دعوتِ حق قرار دیں تو مرزائیوں سے مماثلت پیدا نہیں ہوتی، لیکن جماعتِ اسلامی ایسا کرے تو وہ مرزائیوں کے مشابہ قرار پائے؟

آمدم برسر مطلب:

الغرض، بحث یہ ہو رہی تھی کہ طلوع اسلام اور جناب ''مفکر قرآن'' صاحب کے ہاں دوہرے معیار ہیں، ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنے مخالفین کے لیے۔ رشتہ مناکحت میں جیسی شرط جماعت اسلامی کے افراد لگاتے ہیں، بالکل ویسی ہی شرط، بلکہ اس سے بھی شدید شرط، طلوع اسلام عائد کرتا ہے لیکن اس شرط کی بنا پر جو فتویٰ جماعت پر عائد کیا جاتا ہے، اسے طلوع اسلام اور ''مفکر قرآن'' خود اپنی ذات پر چسپاں کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، حالانکہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں ''مجرموں'' پر، جن کے ایک جیسے ''جرائم'' کی تہہ میں، ایک جیسے ہی محرکات و مقاصد کارفرما ہوں، ایک سے احکام ہی عائد کیے جائیں۔ لیکن طلوع اسلام اور ''مفکر قرآن'' صاحب، عدل و انصاف کے اس واضح اور صریح تقاضے کو پس پشت ڈال کر ''میٹھا ہپ ہپ، کڑوا تھو تھو'' کا سا یا نافتویٰ رسید کرتے ہیں۔

جھوٹ، کذب، دروغ گوئی اور بے سروپا الزام تراشی، جناب ''مفکر قرآن'' کا مستمر رویہ تھا۔ ان کی زبان و قلم سے جھوٹ، بے ساختہ نکل جایا کرتا تھا۔ طلوع اسلام کی اس عبارت کو (تکرار کی کوفت کے باوجود) دوبارہ پڑھنے کی زحمت فرمائیے:

> ''جب آپ ان حضرات سے پوچھیں گے، تو یہ جواب میں کہیں گے ''یہ ٹھیک ہے رشتۂ ازدواج میں خیالات کی ہم آہنگی، نہایت ضروری ہے، اس میں فرقہ بندی کی کون سی بات ہے؟'' لیکن یہی دلیل، جب مرزائی حضرات اپنے مسلک کے جواز میں پیش کرتے ہیں کہ غیر احمدیوں سے رشتۂ مناکحت جائز نہیں، تو یہی جماعت اسلامی والے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' ❶

❶ طلوع اسلام، ۲۶/ مارچ ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۷

کیا جماعتِ اسلامی سے وابستہ کسی شخص کی کوئی ایسی تحریر پیش کی جا سکتی ہے جس میں قادیانیوں کا اس بنا پر مذاق اڑایا گیا ہو، کہ وہ غیر احمدیوں سے رشتۂ نکاح کو جائز نہیں سمجھتے۔ یہ بے اصل، بے بنیاد اور بے سروپا الزام ہی نہیں بلکہ بہتان بھی ہے جسے حیا سے عاری ہو کر گھڑا گیا ہے۔ سچ فرمایا حضرت رسول اکرم ﷺ نے کہ: ((اذا لم تستحی فاصنع ماشئت.)) "بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن۔" اس بہتان کے بے اصل اور بے بنیاد ہونے کی واضح دلیل یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے سربرآوردہ قائدین ہوں یا عام اراکین و متفقین، سب کے سب قادیانیوں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیتے ہیں، اور اس بنا پر نہ ان سے رشتۂ مناکحت کو جائز سمجھتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے قبرستانوں میں ان کی اموات کو دفن کرنے کو جائز جانتے ہیں۔ کافر قرار پا جانے کے بعد، اگر قادیانی حضرات، اپنے ہی حلقے میں رشتۂ مناکحت کو محدود و محصور کر ڈالتے ہیں تو یہ تو عین اہلِ ایمان کی خواہش کے مطابق ہے، پھر ایسا کرنے پر ان کا مذاق اڑانا کیسے اور کیوں کر؟

دوہرے معیار کی چوتھی مثال:

متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ، جب مسلم نیشنلزم کی راہ چلتے ہوئے (نہ کہ اسلامی نصب العین کی راہ چلتے ہوئے) ہر اُس شخص کو جو مسلم گھرانوں میں پیدا ہوا تھا، مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دے رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی کہ اس کے قائدین، اگرچہ ناواقفِ اسلام ہیں لیکن مجوزہ پاکستان میں وہ اسلامی ریاست متشکل کر دیں گے، تو اس وقت، مولانا مودودیؒ، دو پہلوؤں سے مسلم لیگ کے موقف پر تنقید کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ جن مسلمانوں کی بھیڑ کو اکٹھا کر کے مجوزہ پاکستان میں مملکتِ اسلامیہ کی تشکیل پیشِ نظر ہے، وہ شعورِ اسلام سے ناواقف ہونے کے باعث، کسی اور کام کے ہوں تو ہوں، لیکن اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے قطعی بے کار ہیں۔ دوسرے یہ کہ، جن لوگوں کی قیادت میں یہ ہجومِ مسلمین اکٹھا ہو رہا ہے، اگر خود ان کی اپنی سیرت و کردار میں اسلام موجود نہیں، اور ان کے اپنے پانچ چھ فٹ کے وجود پر دین نافذ نہیں ہے، تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے پاکستان میں اسلامی نظام

نافذ کر دیں گے، بڑی خام خیالی ہے۔

جہاں تک مسلمانانِ ہند کی واقعی دینی حالت کے (پہلے) پہلو کا تعلق ہے، اسے مندرجہ ذیل اقتباسات میں بالتفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے جو کچھ لکھا تھا، اُسے طلوعِ اسلام، یوں پیش کرتا ہے:

(۱)..... یہ انبوہِ عظیم، جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد، نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے، اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں، نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے، ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے..... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنٰی میں مسلمان فرض کر لینا، اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا، اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ ۱۳۰) ●

قبل اس کے کہ اس ضمن میں سید مودودیؒ کے اگلے اقتباسات پیش کیے جائیں، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس اقتباس میں ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے دو خیانتوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اولاً یہ کہ نقطوں پر مشتمل ڈیش سے قبل والی عبارت، اصل کتاب میں بعد میں ہے اور بعد والی عبارت پہلے ہے، لیکن نامعلوم ''مفکرِ قرآن'' نے کس ''نظریہ ضرورت'' کے تحت، تقدیم و تاخیر کے ذریعہ تبدیلی کی ہے، ثانیاً یہ کہ ڈیش (جو مشتمل بر نقاط ہے) سے یہ تاثر دیا ہے کہ یہاں کوئی عبارت ہے، جسے حذف کر دیا گیا ہے، حالانکہ اصل ماخذ میں ایسی کوئی تحریر نہیں ہے۔

(۲)..... یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے

● طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۷

بھری ہوئی ہے، کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ ۱۲۶)●

(۳)......ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے، قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے، اس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا، تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ ۵۶)●

(۴)......اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا، مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی، کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے، جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں، اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (مسلمان اور سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ۳۱)●

(۵)......اسلام کو تانبے کے ان خزانوں کا سکہ مطلوب نہیں، جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو، وہ سکہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ، ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ ۱۶۷)●

پاکستان بننے کے بعد، ان عبارتوں اور ان جیسی دوسری عبارتوں کو "مفکر قرآن" نے خوب خوب Exploit کیا، اور مولانا مودودیؒ کے خلاف، انہیں معاندانہ پراپیگنڈہ کے لیے اس کثرت سے استعمال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ "مفکر قرآن" کا مقصدِ حیات ہی مخالفتِ مودودی تھا، چنانچہ پاکستان بن جانے کے بعد، "مفکر قرآن" صاحب، ان اقتباسات کو پیش کر کے، لوگوں کو مولانا مودودیؒ سے متنفر کرنے کے لیے، کبھی یہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں وہ پاکستان کے مخالف تھے، اور اُس زمانے کی تاریخ سے واقف لوگ، جانتے ہیں کہ

"مودودی صاحب نے اس مخالفت میں کس قدر شدت برتی تھی اور جداگانہ قوم

●،● طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۷ ●،● طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۸

بننے والے مسلمانوں اور ان کے "قائد" کو کس قدر گالیاں دی تھیں۔" ❶

جب کوئی شخص کسی کے خلاف اپنے دل و دماغ میں حسد و کینہ اور بغض و عناد کا زہر بھر لے تو اسے اپنے مخالف کی ہر دلیل، تذلیل محسوس ہوتی ہے، اور ہر تنقید، چوٹ دکھائی دیتی ہے، اور ہر مدلل اختلاف، مخالفت نظر آتا ہے، اور ہر نصیحت و فہمائش، اس کے ہاں طنز و تعریض بن جاتی ہے۔ یقیناً مولانا مودودیؒ نے مسلم لیگ سے اختلاف کیا تھا، اور دلائل و براہین اور عقل سلیم کی حجت کے ساتھ کیا تھا، اسے مخالفت یا گالیاں قرار دینا محض خبث باطن کا اظہار ہے، بالخصوص جبکہ وہ خود بھی تقسیم ہند کی تقسیم کی ایک تجویز دے چکے تھے، اور ساتھ ہی اسلامی حکومت کے بارے میں اپنا یہ عقیدہ بھی بیان کر چکے تھے:

"مجھے تو یہاں اگر ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔" ❷

الغرض، کبھی ان عبارات کی بنا پر، "منکر قرآن" یہ کہہ کر لوگوں کے دلوں میں مولانا مودودیؒ کے خلاف زہر بھرا کرتے تھے کہ وہ متحدہ ہندوستان میں:

"انہیں مسلم قوم کے افراد نہیں سمجھتے تھے۔" ❸

حالاں کہ مولانا مودودیؒ کی "مسلم قوم پرستی" کے مسلک پر تنقید ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ انہیں مسلمان سمجھتے ہوئے ہی، مسلم نیشنلزم کی راہ سے ہٹا کر انہیں اسلامی نصب العین کی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

اور کبھی، مولانا مودودیؒ کی اس مدلل تنقید کو عام مسلمانوں اور ان کے زعماء کو گالیاں، اور کبھی پوری مسلم لیگ کو گالیاں قرار دے کر، یوں پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے:

"مودودی صاحب بھی تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کی ہر کامیابی پر اسی قسم

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۹، ۷۰

❷ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ ۹۷ ❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۷ء، صفحہ ۷۰

کی گالیاں دیا کرتے تھے۔" ❶

اور کبھی یہ کہہ کر، لوگوں کو مولانا مودودیؒ کے خلاف مشتعل کیا کرتے تھے کہ قیام پاکستان سے قبل:

"وہ ان مسلمانوں کو، مسلمان ہی نہیں بلکہ جانور کہتے تھے۔" ❷

یہ تھا "مفکرِ قرآن" صاحب کا مولانا مودودیؒ کے خلاف معاندانہ اور زہریلے پراپیگنڈے کا انداز، جسے وہ پاکستان میں ساری زندگی اختیار کیے رہے، لیکن اگر کسی اور نے مودودی صاحب کے الفاظ سے کہیں زیادہ سنگین الفاظ میں، امت مسلمہ کی حالت کو بیان کیا، تو اسے "مفکرِ قرآن" صاحب نے عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اور اپنے دوہرے معیار کی پالیسی کو اپناتے ہوئے صرف اس لیے نظر انداز کر دیا ہے، کہ وہ شخص ان کے نزدیک مولانا مودودیؒ کی طرح مبغوض نہیں تھا، بلکہ ممدوح و محبوب شخص تھا، مثلاً علامہ اقبال نے بھی مسلمانوں کی بالکل وہی حالت بیان کی جو مولانا مودودیؒ نے قلم بند کی تھی۔

سید مودودیؒ اور علامہ اقبالؒ اور حالتِ مسلمین:

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۱ء، مسلمانوں کی جو حالت مولانا مودودیؒ نے بیان کی تھی، بالکل وہی کیفیت، اس سے تھوڑی دیر پہلے، علامہ اقبالؒ بیان کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کا جملہ کلام (خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی میں) اس حقیقت پر شاہد ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حوالوں سے ظاہر ہے:

وہ اپنی کتاب "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں جو کچھ فرما چکے تھے اسے پرویز صاحب ہی کی بیان کردہ تشریحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

گرچہ دارد لا الٰہ اندر نہاد   از بطونِ او مسلمانے نزاد

مسلمان اس کا اعتراف و اعلان کرتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ پر ان کا ایمان ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ انسان، قوانینِ خداوندی کے علاوہ، کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کر سکتا لیکن افسوس ہے کہ اس قدر بلند نظریہ زندگی رکھنے والی امت کے اندر،

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۲   ❷ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۲

ایک بھی مسلمان ایسا نہیں ہوا، جو اس نظریہ کی صداقت، عملاً دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ ❶
آگے چل کر، مندرجہ ذیل اشعارِ اقبالؒ کی تشریح بایں الفاظ کی گئی ہے:

آنکه بخشد بے یقیناں را یقیں　　آنکه لرزد از سجودِ او زمیں
آنکه زیر تیغ گوید لا اله　　آنکه از خونش بروید لا اله
آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند　　در حرم صاحب دلے باقی نماند

ایسا مسلمان کہ جس کے ایمان کی قوت بے یقینوں کے دلوں میں یقینِ محکم پیدا کر دیتی، جس کے سجدے سے زمین لرز اٹھتی، جو تلوار کے نیچے سر رکھ کر بھی لا الٰہ کہے، جس کے خون سے لا الٰہ کا شجرِ طیب پیدا ہو، افسوس کہ امت میں ایسا کوئی مسلمان پیدا نہ ہوا۔ ان میں وہ سرور و سوز، جس سے کائنات میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، باقی نہ رہا۔ حرمِ کعبہ میں ایک بھی مسلمان ایسا نہ رہا، جو سینے میں دھڑکنے والا دل رکھتا ہو۔

اے مسلماں! اندر ایں دھرِ کہن　　تا کجا باشی بہ بند اہرمن

"مسلمان اور اس کے گلے میں ابلیس کا پھندا! بالآخر اس انداز کی زندگی کب تک بسر کرو گے۔" ❷

فارسی کلام کے بعد، ان کے چند اردو اشعار بھی ملاحظہ فرما لیجیے، جن میں وہ مسلمانوں کی وہی حالت بیان کرتے ہیں، جسے بیان کرنے کا "جرم"، مولانا مودودیؒ سے سرزد ہوا، بلکہ علامہ اقبالؒ نے تو مسلمانوں کو، جانور تو رہے ایک طرف، نباتات بھی نہیں، بلکہ جمادات کی بھی، سب سے ہلکی اور حقیر چیز قرار دیا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی، یہی باتیں ہیں؟

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۱　　❷ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۲

وضع میں تم ہو نصاریٰ ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اور ایک مقام پر تو، علامہ اقبال نے مومن وکافر، سب کو، ایک ہی پلڑے میں رکھتے ہوئے، یہاں تک فرما دیا کہ: ؎

یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

رہ گئی امتِ مسلمہ اور ملتِ اسلامیہ کی قیادت، تو اس کے متعلق، اشعارِ اقبال کی تشریح کرتے ہوئے، پرویز صاحب لکھتے ہیں:

داغم از رسوائی این کاروان در امیر او نه دیدم نورِ جان

کاروانِ ملت کی زبوں حالی اور خواری کو دیکھ کر میرا سینہ داغ دار ہو جاتا ہے، ان کے لیڈروں میں مجھے وہ نور دکھائی نہیں دیتا جس سے انسان کی زندگی جگمگا اٹھتی ہے۔"

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

یہ ہر وقت اپنے مفاد کی سوچتے ہیں، انگریز کے ہاں سے جاہ ومنصب حاصل کرنا، ان کی زندگی کا منتہا ہے، اس قدر تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ قوم کے مستقبل کے متعلق کبھی نہیں سوچتے، بظاہر یہ قوم کے بڑے خیرخواہ اور سچے مسلمان بنتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی رتی نہیں ہے۔

در حرم زاد و کلیسا را مرید پردۂ ناموس ما را بر درید

"مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور انگریزوں کے مرید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی عزت وآبرو کو خاک میں ملا دیا ہے۔"

دامنِ او را گرفتن ابلہی است سینۂ او از دلِ روشن تہی است

ایسے لیڈروں کے پیچھے چلنا حماقت ہے، ان کے سینے میں دلِ زندہ موجود ہی نہیں۔ ●

● طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۰

ہر انصاف پسند آدمی یہ محسوس کرے گا کہ مولانا مودودیؒ اور علامہ اقبالؒ نے، انحطاط و زوال کے اعتبار سے، امتِ مسلمہ کی ایک ہی حالت بیان کی ہے، بلکہ علامہ موصوفؒ کی بیان کردہ حالت، مولانا مودودیؒ کی تحریر کردہ کیفیت سے کہیں زیادہ سنگین، خستہ اور ابتر ہے، لیکن اس کے باوجود، علامہ اقبالؒ تو پرویز صاحب کی نظر میں ممدوح و محمود فرد تھے لیکن سید مودودیؒ، مبغوض و مغضوب۔ دراصل، پرویز صاحب، ہوسِ شہرت میں بری طرح مبتلا تھے۔ وہ، اقبالؒ اور مودودیؒ کی بین الاقوامی شہرت کی ہستیوں میں سے، ایک سے مثبت اور دوسری سے منفی تعلق رکھنے کو، حصولِ شہرت کا ذریعہ گردانتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال کی مدح سرائی میں، بنیادی محرک یہ تھا کہ بھاری لکڑی کے ساتھ، حقیر وزن کا تنکا بھی تیرنے لگ جائے، اور مولانا مودودیؒ کی عیب چینی اور حرف گیری کے ذریعہ وہ یہ سمجھتے تھے، کہ اور کچھ نہیں، تو چھپکلی کم از کم، بلند بام تو ہو ہی جائے گی۔

طلوعِ اسلام اور مسلمانانِ ہند:

لیکن سوال یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو دینی اور اخلاقی حالت بیان کی تھی، وہ مبنی برحقیقت تھی یا خلافِ حقیقت تھی؟ ہمیں خوشی ہے کہ طلوعِ اسلام میں، پرویز صاحب نے اس سوال کا سامنا تو کیا، اگرچہ یہ جواب، عذرِ گناہ بدتر از گناہ، کا مصداق ہے۔

> ''نہایت معصومیت سے کہہ دیا جاتا ہے کہ ''فرمایئے! پیدائشی مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں ایک لفظ بھی غلط ہے؟ کیا اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان کی ٹھیک ٹھیک یہی حالت نہیں؟ اگر مودودی صاحب نے ان کے صحیح خدوخال واضح کر دیئے، تو اس سے کون سا گناہ لازم آ گیا؟..... بجا اور درست! لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ کچھ کہنے کا موقع کون سا تھا؟ اور اس کی ضرورت کیا؟''●

اگر یہ سب کچھ واقعی 'بجا اور درست' تھا، تو ایک طرف تو ہمیں خوشی ہوئی کہ چلو! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ لیکن دوسری طرف، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا ان اقتباسات

● طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۸

کو، "گالیاں قرار دینا"، اور وہ بھی، تمام مسلمانان ہند کے لیے، پوری مسلم لیگ کے لیے، اور زعمائے لیگ کے لیے، کیا محض گھٹیا درجے کا صحافیانہ ہتھکنڈہ نہیں ہے؟

یہاں پھر ہمارے سامنے "مفکرِ قرآن" صاحب کا دُہرے معیار کا اصول آجاتا ہے، مولانا مودودیؒ، مسلمانانِ ہند کی واقعی اخلاقی اور دینی حالت بیان کریں، تو ارشاد ہوتا ہے کہ...... اُس وقت یہ کچھ کہنے کا موقع کون سا تھا؟ اور اس کی ضرورت کیا؟...... لیکن ٹھیک اسی دور میں (علامہ اقبالؒ کے علاوہ) خود طلوعِ اسلام بھی اہلِ اسلام کی ایسی ہی حالت بیان کر رہا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے، چند اقتباسات:

(۱)...... ہندوستان میں مسلمان، جس حالت میں آج ہے، وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ ❶

(۲)...... دنیا میں نظام، اعتدال پر اس وقت ہوگا جب دنیا قرآنی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے گی اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نام فساد، اور اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے، جس سے دنیا آج گزر رہی ہے، اس جہنمی زندگی میں آج "مسلمان" بھی اسی طرح مبتلا ہے، جس طرح "غیر مسلم"۔ یہ چیز فی الواقعہ بڑی عجیب معلوم ہوگی۔ لیکن اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی "مسلمان" نام رکھانے والے کریں، یا "غیر مسلم"، نتیجہ دونوں کو بھگتنا پڑے گا۔ محض نام بدل دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سنکھیا کو سنکھیا سمجھ کو چاٹئے یا قند کا ٹکڑہ، نتیجہ، دونوں صورتوں میں ہلاکت ہوگا۔ ❷

(۳)...... آج تمام عالمِ اسلامی خدا کے ذلت آمیز عذاب میں گرفتار ہے، ملا بیچارے سے قرآن چھنا. تو اس کے ساتھ امورِ عامہ میں تدبر بھی چھن گیا، اس عالمگیر قیامت کا علاج سوچنا تو درکنار، اس ہمہ گیر کا سمجھ لینا بھی اس کے بس کی بات نہیں، اس نے "نجات" کے لیے نہایت آسان راستہ تلاش کر رکھا ہے، ایک

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۸

❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۳۵

خاص وضع قطع کا لباس، خاص وضع کی تراش خراش، چند بے ذوق سجدے، کچھ بے روح رسوم و مظاہر، لفظی اتار چڑھاؤ کی مناظرانہ بحثیں، کچھ خواب آور افسانے، اندھی تقلید کی لاٹھی، اور عوام کی حالت۔ یہ ہیں اس غریب کا متاعِ دنیا اور سرمایہ آخرت۔ یہ ارباب شریعت تھے۔ اہل طریقت ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ وہ زندہ انسانوں کی بجائے مُردوں کی دنیا سے اپنا دامن باندھے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچیے! جس قوم کا زندہ، مردوں سے مدد کا طالب ہو، اس سے بڑھ کر فریب خوردہ قوم بھی دنیا میں ہو سکتی ہے۔ جو "محسوس دنیا" کو تیاگ کر ایک "مثالی دنیا" کی تلاش میں بادہ پیمائی کر رہا ہو، اس سے بڑھ کر منزل سے دور کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! سوچیے اور ماتم کیجیے اپنی اس حالت پر۔ مسلمان ایک مدت سے انہی خود ساختہ خداؤں کی پرستش میں لگا ہوا ہے، اور اس کا زندہ و پائندہ حی و قیوم خدا اس سے منہ موڑے بیٹھا ہے بایں ہمہ مسلمان یہ سمجھ رہا ہے کہ میں خدا کا سب سے مقرب اور برگزیدہ ہوں۔ دنیا ساری جہنم میں چلی جائے گی، اور میں جنت کا واحد مالک قرار دیا جاؤں گا" ❶

اُس وقت مسلمان اور امت مسلمہ کی یہ حالت، جو خود طلوع اسلام نے بیان کی تھی، اور سید مودودیؒ کی بیان کردہ حالت میں آخر کیا جوہری فرق ہے؟ کیا اس دینی حالت اور اس اخلاقی طرز عمل کے ساتھ واقعی مجوزہ پاکستان میں حکومت الہیہ قائم ہو سکتی تھی؟ یا اب ہو سکتی ہے؟

پھر کیا ستم ظریفی ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں کی حالت، اگر مولانا مودودیؒ بیان کرتے ہیں، تو موقع و محل اور ضرورت و حاجت کے بغیر بیان کرتے ہیں، لیکن اگر خود "مفکر قرآن" صاحب (اور علامہ اقبالؒ) اس کا ذکر کریں، تو وہ برمحل بھی ہے، تقاضائے وقت بھی ہے اور مطالبۂ ضرورت بھی ہے، آخر یہ دہرا معیار کیوں؟

دوہرے معیار کی پانچویں مثال:

مغربی دنیا کے مستشرقین کی یہ عام روش ہے کہ وہ اپنے استعماری اور سامراجی مقاصد کے

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۴۲

پیش نظر عالم اسلام میں کثیر التصانیف مشاہیر اور امت مسلمہ میں ان کے لٹریچر کے اثر و نفوذ کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقی مطالعہ کرتے رہتے ہیں، پھر ان میں سے جن ہستیوں سے وہ خوش ہوتے ہیں، ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، اور جو اُن کی نگاہوں میں ناپسندیدہ شخصیت قرار پائے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اسی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، مستشرقین نے برصغیر میں جن اشخاص کی کتب پر ریسرچ کرنے کی ٹھانی، ان میں سے ایک (اور غالباً سب سے پہلے) شخص، مولانا مودودیؒ تھے، ''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب کو، بربنا حسد و کینہ، مولانا مودودیؒ کی ایسی شہرت ناگوار گزری جسکی بنا پر اہل مغرب نے ان کے افکار و نظریات کو بحث و تمحیص کے لیے منتخب کیا، چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب نے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، وہ انداز اختیار کیا جس سے قارئین کے دلوں میں، سید مودودیؒ کے خلاف نفرت و بیزاری کے جذبات ابھر آئیں۔ لیکن ابھی چند سال ہی گزر رہے تھے، کہ مغربی سکالرز نے افکار پرویز کا جائزہ لینا بھی شروع کر دیا، اس پر ''مفکر قرآن'' پھولے نہ سمائے، اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے، ایسا تبصرہ کیا جس سے ان کا جانچ پرکھ کا دہرا معیار واضح ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس قصہ کی یہ ہے:

ایک امریکی مستشرق پروفیسر اسمتھ، اپنی حکومت کی طرف سے، اس مقصد کے تحت، مسلم ممالک کی سیاحت کے لیے نکلا کہ مسلم مشاہیر علم سے مل کر، انہیں، اپنی یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دیں، اس ضمن میں طلوع اسلام لکھتا ہے:

> ''پروفیسر اسمتھ نے مختلف ممالک کے جن اسکالرز کی فہرست مرتب کی تھی، ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بھی شامل تھا، چنانچہ وہ انہیں خاص طور پر ملنے کے لیے کراچی آئے، اور ایک تفصیلی ملاقات میں اپنا مقصد بتایا، پرویز صاحب نے اسلام کے اُس تصور کو، ان کے سامنے رکھا جو انہوں نے قرآن سے اخذ کیا تھا، پروفیسر اسے خاموشی اور حیرت کے ساتھ سنتے رہے، اس سے گہری دلچسپی کا اظہار بھی کیا۔ کئی ایک مقامات پر کچھ نوٹ بھی کیا، لیکن اس کے بعد انہوں نے دبی زبان سے کہا

"اس قسم کے انقلابی اسلام کی ریسرچ، ہمارے ادارہ کے لیے موزوں نہیں رہے گی"۔ چنانچہ اس کے برعکس یہ معلوم ہوا کہ اس ادارہ میں جماعت اسلامی کا لٹریچر موجود ہے، اور اگر ہماری اطلاع درست ہے تو کسی صاحب کو اس پر ریسرچ کرنے کے لیے متعین بھی کیا گیا ہے۔"●

چونکہ پرویز صاحب کا قرآن سے اخذ کیا ہوا وہ تصورِ اسلام، جو دراصل اشتراکیت اور مغربی اطوار و عادات پر قرآنی ٹھپہ لگا کر تیار کیا گیا ہے، "انقلابی تصور" ہے، اس لیے ..... "اس قسم کے انقلابی اسلام پر ریسرچ، پروفیسر اسمتھ کے ادارے کے لیے موزوں نہیں ہے، وہاں جماعت اسلامی کے غیر انقلابی تصورِ اسلام پر ریسرچ کرنا ہی موزوں و مناسب ہے۔" ...... یہ ہے وہ تبصرہ، جو اس وقت کیا گیا تھا، جب پرویز صاحب کے قرآن سے اخذ کردہ "انقلابی اسلام" پر ریسرچ کرنے سے امریکی سکالر نے انکار کر دیا تھا۔

اس کے بعد، پرویز صاحب کی کتب پر ریسرچ ہوئی اور کفر کی مصلحتوں نے فکرِ پرویز کو اپنے مطلب کے مطابق، محمد رسول اللہ والذین معہ کے حقیقی اسلام کے خلاف پایا، تو اس فکر کی تعریف و تحسین کی گئی۔ عالم کفر کے سکالرز کی اس تحسین و تعریف سے طلوعِ اسلام باغ باغ ہو جاتا ہے، اور وفورِ مسرت سے یہ لکھتا ہے:

"ڈاکٹر (Freeland Abbot) امریکہ کی (Tufts) یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے صدر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، انہوں نے "اسلام اینڈ پاکستان" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں، ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی، اس میں انہوں نے فکرِ پرویز اور تحریک طلوعِ اسلام کے متعلق بڑی تفصیل سے داد و تحسین دینے کے بعد کہا ہے کہ: ..... "پرویز صاحب، اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے فعّال اسلامی ریفارمر ہیں" ..... یہ کتاب، فکرِ پرویز کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب بن گئی ہے۔"●

● طلوعِ اسلام، ۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۳ ● طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۸

طلوع اسلام، مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کرتے ہوئے، بڑے فخر و ابتہاج کے ساتھ، یہ اعلان کرتا ہے:

"امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیاں، فکرِ پرویز کو ڈاکٹریٹ کے لیے، تحقیقاتی مقالات کا موضوع منتخب کر رہی ہیں۔" ❶

ایک اور مقام پر، یورپ اور امریکہ میں مقبولیتِ پرویز کا ذکر کرتے ہوئے، بڑے ہی فرحت و انبساط کے ساتھ، طلوع اسلام، یہ لکھتا ہے:

"پرویز صاحب کی تمام کتابیں، بجز ایک، اردو زبان میں ہیں، اور ان کی پبلسٹی کا یہ عالم ہے کہ ماہنامہ طلوع اسلام کے سوا، ان کا کہیں ذکر تک نہیں آتا۔ انہیں اخبارات اور مجلات میں تبصرہ کے لیے بھیجا جاتا ہے، تو وہ کتابیں رکھ لیتے ہیں، لیکن ان پر (موافق نہ سہی، مخالف ہی سہی) تبصرہ نہیں کرتے، اس کے باوجود، آپ دیکھئے کہ یورپ اور امریکہ کی فکرگاہوں میں فکر و تحریکِ پرویز پر ریسرچ ہوتی ہے اور کتابیں اور مقالے شائع ہوتے ہیں۔" ❷

یہ اسی امریکہ کے اسکالرز کے کلماتِ تحسین و تعریف ہیں، جس کے متعلق کبھی طلوع اسلام نے لکھا تھا، کہ "اس قسم کے "انقلابی اسلام" کی ریسرچ، امریکی ادارے کے لیے مناسب نہیں ہے" اور اب جو اس "انقلابی اسلام" پر ریسرچ ہوئی، تو ایسی کتابیں، انہی امریکی سکالرز کے ہاتھوں لکھی گئیں، جو "فکرِ پرویز کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب بن گئیں"۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کہ اگر یہ "انقلابی اسلام"، واقعی صحیح اسلام ہے تو امریکہ کو اسلام کا یہ درد کیسے اٹھ آیا کہ وہ اس کو متعارف کرانے کا موجب بن جائے؟ کیا یہ "انقلابی اسلام" فی الواقعہ، اشتراکی نظامِ معیشت اور مغربی معاشرت کے لوازمات کو، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرنے کی وہ سازش نہیں ہے جو امریکہ اور یورپ کی مادہ پرست تہذیب کو اس لیے پسند ہے کہ اس "انقلابی اسلام" کو محمد رسول اللہ والذین معہ کے حقیقی اسلام کے

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۹ ❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۶۰

متبادل قرار دیا جا رہا ہے؟ یوں، دینِ اسلام میں رخنہ اندازی اور پیوند کاری، امریکی، یورپی اور اشتراکی حکومتوں کے سیاسی اغراض کے عین مطابق ہے، کیونکہ:

> ”مغربی ممالک، خواہ وہ یورپ ہو، یا امریکہ، اسلامیات کی طرف خالص علمی نقطۂ نگاہ سے توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ کے سامنے بھی اپنے سیاسی مقاصد تھے، اس طرح امریکہ کے پیشِ نظر بھی اپنے سیاسی مصالح ہیں۔“ ❶

اگرچہ اب تک کی یہ بحث، پرویز صاحب کے دہرے معیار کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، اور یہاں پہنچتے ہی ہمارے قلم کو رک جانا چاہیے، لیکن صرف یہ واضح کرنے کے لیے کہ خود ”مفکرِ قرآن“ کو اور ان کے ”انقلابی اسلام“ کو، دنیائے کفر، کس نظر سے دیکھتی ہے، ہم اپنے اسپ قلم کو مہمیز لگانے پر مجبور ہیں۔

دنیائے کفر میں پرویز صاحب کی پذیرائی:

مغربی دنیا، پرویز صاحب کو ان کے ”انقلابی اسلام“ کے تصور کی بنا پر، بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب، بڑے مسرور و مطمئن ہیں کہ چلو، عالمِ اسلام میں نہیں، تو عالمِ کفر میں تو ان کی پذیرائی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام، اہلِ کفر کے ہاں، ”مفکرِ قرآن“ (اور ان کی ”قرآنی خدمات“) کی پذیرائی اور قدر افزائی پر، خوشی سے نہال ہوتے ہوئے لکھتا ہے:

> (۱)......غالباً ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے، (Peter Schmid) پی ایک جرمن سکالر، ہندوپاک کی سیاحت کے لیے آیا، اور پرویز صاحب سے بھی آ کر ملا، بعد میں اس نے اپنے تاثرات اور افکار کو کتابی شکل میں مرتب کیا، جس کا انگریزی ترجمہ (India - Mirrage & Reality) کے نام سے شائع ہوا، جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا ہوا، اس نے پرویز صاحب سے اپنی ملاقات کا حال، بڑے شگفتہ اور ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۲ ❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۷

اس کے بعد "مفکر قرآن" کی تعریف و تحسین میں (Peter Schmid) کا درج ذیل اقتباس دیا گیا ہے:

"میں پچھلی مرتبہ پاکستان آیا تھا تو ایک مذہبی شخصیت، پیر مانکی شریف (مرحوم) سے ملا تھا۔ اس دفعہ ایک اور مذہبی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کی تعلیم اور وسعت ظرف، اسے بالکل ایک مختلف زمرہ میں شامل کرتی ہے۔ قرآنک ریسرچ سنٹر، جس کے سربراہ جی اے پرویز ہیں، گلبرگ کے ایک مکان کی نچلی منزل پر واقع ہے، اسی گلبرگ میں جو فلم اسٹارز اور دیگر ارضی مخلوق کا مسکن ہے۔ ان کے کمرے میں کھانے پینے کے برتن، اور ان کا (کتب خانہ اور) مسودات، اس امر کی شہادت دیتے تھے کہ وہی کمرہ، ان کا دفتر بھی ہے اور خواب گاہ بھی، اس مرد بزرگ کے چہرے کی عمیق لکیریں، اور اسکی نیند کو ترسی ہوئی آنکھیں، سادہ سی دھات کے فریم کا چشمہ اور سفید بال، اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ کس گہری سوچوں میں ڈوبا رہتا ہے، ان سوچوں کی پیدا کردہ علمی اور فکری صلابت میں کچھ لوچ پیدا کرتی تھیں، تو اس کی خواب آلود آنکھیں۔ اس کے نزدیک، تقویٰ، ترک دنیا کا نام نہیں بلکہ اس دنیا کو صفات خدا کا آئینہ دار بنا دینے کی بالا رادہ کوشش کا نام ہے۔" ❶

لادینیت کی علمبردار تہذیب مغرب کے ایک اور سپوت کی طرف سے، پرویز صاحب کو خراج تحسین پیش کیے جانے کا تذکرہ، بایں الفاظ کیا گیا ہے:

(۲)......ہالینڈ کے مشہور مستشرق (Dr. J.M.S. Baljon) نے ۱۹۶۱ء میں ایک کتاب شائع کی، جس کا عنوان ہے (Modern Muslim Koran Interpretation) یعنی "عصر جدید کے مفسرین قرآن"۔ اس مقصد کے لیے، اس نے برصغیر ہند و پاک سے تین مفسرین کا انتخاب کیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)، علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی (مرحوم) اور پرویز صاحب۔ ❷

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۷ ❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۷ تا ۵۸

ضمناً، یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عنوانِ کتاب کا جو ترجمہ "عصرِ جدید کے مسلم مفسرین" کے الفاظ میں کیا گیا ہے، وہ قطعی غلط ترجمہ ہے، صحیح ترجمہ یا تو یہ ہے کہ "تجدد پسند مسلمانوں کی ترجمانیٔ قرآن" یا پھر یہ کہ "قرآن مسلم کی تجدد پسندانہ ترجمانی"۔ طلوع اسلام کا غلط ترجمہ، خواہ جہالتِ علمی کے باعث ہو، یا جان بوجھ کر شعوری خیانت کے تحت ہو، بہر حال، اور بہر صورت، معیوب حرکت ہے۔ اس ضمنی وضاحت کے بعد، اس غیر مسلم مصنف نے "مفکر قرآن" کو، ان الفاظ میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے:

"پرویز صاحب کی شخصیت کے حقیقی جوہروں کو ان کی درخشندہ اور بلند پایہ علمی صلاحیتوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے، مبداء فیض نے انہیں، ان نوجوانوں کے لیے، جن کا موجوں کے تلاطم میں گھرا ہوا سفینۂ حیات، مذہبی لنگر کی تلاش میں ہو، اعلیٰ صلاحیتوں کا استاد اور باپ کی طرح شفیق دوست بنایا ہے، ان کی صاف اور شفاف نگاہ، پیش آمدہ مسائل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے اور ان کے متعلق، ان کے بلا کاوش و تردد، صائب رائے، آزادانہ فیصلے، ان کے اطمینانِ قلب و شرحِ صدر کے آئینہ دار ہوتے ہیں، اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے اثر و نفوذ کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جائے گا۔" ۞

مغربی اسکالرز میں سے ایک اور شخصیت کی طرف سے، پرویز صاحب کو ملنے والے شرفِ تہنیت و پذیرائی کو، طلوعِ اسلام ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

(۳)..... مستشرقینِ مغرب میں سے، پروفیسر (E.I.J. Rosenthal) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے Islam, In the Modern National State) کے عنوان سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی ہے، جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے پاکستان میں مختلف اسلامی تحریکوں کا وسیع جائزہ لیا، اور پرویز صاحب اور ان کی تحریک کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ ۞

۞، ۞ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۸

کینیڈا کی ایک یونیورسٹی کی علمی تحقیقات کا ذکر کرتے ہوئے، ایک کافر خاتون کے گل ہائے عقیدت (جو اس نے پرویز صاحب کی "قرآنی خدمات" پر پیش کیے ہیں)، طلوع اسلام میں، ان الفاظ میں مذکور ہیں:

(۴)......کچھ عرصہ ہوا، (McGill) یونیورسٹی (کینیڈا) کی طرف سے (Miss Sheila Mc Donough) نامی ایک طالبہ، ڈاکٹریٹ کے لیے اپنے تھیسس کی غرض سے پاکستان آئی تھی، وہ کافی عرصہ یہاں رہی، اور اس کے بعد، (The Authority of the Past) کے عنوان سے اپنا تحقیقاتی مقالہ لکھا، جسے امریکن اکادمی آف ریلیجن نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اس میں اس نے سرسید، اقبال اور پرویز کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے۔ مقالہ اگرچہ ایک طالب علم کا ہے، لیکن اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیاں، فکر پرویز کو ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقاتی مقالات کا موضوع منتخب کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ (Mc Donough) نے (Social Import of Pervez's Religious Thoughts) کے نام سے ایک اور تحقیقاتی مقالہ بھی شائع کیا ہے، وہ ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا، لیکن علمی حلقوں میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ ●

ایک اور عیسائی سکالر، جو کسی عیسائی مشنری سے وابستہ ہیں، پرویز صاحب کو جو خراج عقیدت پیش کرتا ہے، اسے طلوع اسلام یوں بیان کرتا ہے:

(۵)......سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹر (P. Robert A. Butler) پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لاطینی سے وابستہ اور عیسائی مشنری حلقہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ فکر پرویز کے ساتھ، ان کی وابستگی کا اندازہ، اس سے لگائیے کہ وہ طلوع اسلام کا التزاماً مطالعہ کرتے ہیں، اور پرویز صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں، جسے، وہ، اس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی حاصل نہ کر لیتے ہوں۔ سال گزشتہ انہوں نے

● طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۹

اپنے عرصۂ دراز کے اس مطالعہ کا ماحصل (Ideolo- -gical Revolution Through the Quran) کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ کی شکل میں پیش کیا، جس نے مشرقی دوائر میں بالخصوص بڑی شہرت حاصل کی، اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اب حال ہی میں، اس کا فرانسیسی زبان میں ایڈیشن، تیونس (مراکو) سے شائع ہوا ہے۔ ❶

یہ خراجِ تحسین، یہ تعریف و توصیف، یہ تہنیت و پذیرائی اور یہ گل ہائے عقیدت، "مفکرِ قرآن" صاحب کو، اُن یہودی، عیسائی، کافر، لادین، علماءِ مغرب کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔ کیوں؟ اور کس لیے؟ صرف اور صرف اس لیے کہ، جو "انقلابِ اسلام" اُنہوں نے پیش کیا ہے، وہ مغربی ممالک کے سیاسی اغراض و مصالح کے عین مطابق ہے۔ اس لیے وہ "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب سے انتہائی خوش ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح کل (اور آج بھی) انگریز، اپنے "خود کاشتہ پودے" مرزا غلام احمد قادیانی سے خوش تھے (اور ہیں)۔ آج روئے زمین پر پورا عالمِ کفر، پرویز صاحب، سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسی شخصیتوں کی "قرآنی خدمات"، "حق گوئی" اور "لبرل اسلام" سے راضی بھی ہے اور خوش بھی۔ قرآن کریم نے تو چودہ سو سال قبل ہی، اس حقیقت کو واشگاف کر دیا تھا کہ: ﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ ﴾ (البقرہ: آیت ۱۲۰) اس آیت کا ترجمہ، خود پرویز صاحب نے بایں الفاظ کیا ہے:

"یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکیں گے، جب تک تو (اپنا مسلک چھوڑ کر) ان کا مسلک اختیار نہ کر لے۔" ❷

طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب خوش تھے (اور اب بھی، وفاتِ پرویز کے بعد، طلوعِ اسلام، فرحاں ہے) کہ یہودی سکالرز، عیسائی منکر، لادین و بے دین محقق اور علم بردارانِ کفر، "مفکرِ قرآن" صاحب کے "انقلابی اسلام" سے راضی ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ "انقلابی اسلام" پھیلتا چلا جائے، اسی مقصد کے پیشِ نظر وہ اپنے مقالات و کتب کے ذریعہ سے، اس کی تعریف و تحسین

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۹ ❷ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۷

اور اشاعت و توسیع میں کوشاں ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کا ''انقلابی اسلام''، اشتراکیت اور مغربی معاشرت کے اقدار و اطوار اور عادات و آداب کے مخلوطہ پر اسی طرح مشتمل ہے، جس طرح اکبر کا دینِ الٰہی، ہندومت اور اسلام کے آمیزہ پر مشتمل تھا۔ یہاں ایک ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، الفاظ تو قرآن سے لیتے ہیں، مگر مفہوم، اشتراکیت اور مغربیت سے لیتے ہیں۔ آنکھیں تو اپنی استعمال کرتے ہیں، مگر نقطۂ نظر، یورپ سے لیتے ہیں۔ دماغ تو ان کا اپنا ہے مگر اس میں فکر، غیروں سے لے کر بھری ہوئی ہے۔ کان تو وہ اپنے رکھتے ہیں مگر مَا قَالَ الرَّسُوْلُ کو سننے کی بجائے، فلاسفۂ کفر و الحاد کو سنتے ہیں۔ زبان تو ان کی اپنی ہے، مگر وہ بولی غیروں کی بولتے ہیں۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۔

اور دوسرا المیہ یہ ہے کہ غیروں کی بولی بولنے والا آدمی، اگر حالتِ جنگ میں ایسا کرے تو غداروں کے چوکھٹے میں، اس کی تصویر کو محفوظ کر کے، تاریخ کے ایوانوں میں سجا دیا جاتا ہے، لیکن اگر یہی کام، حالتِ امن میں کیا جائے، اور قرآن کے نام پر، قرآن کھول کر کیا جائے، تو اسے ''وسیع النظری''، ''رواداری''، ''سپرٹ اسلام'' اور ''روشن خیالی'' کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اب غور طلب بات تو یہ ہے کہ جس ''انقلابی اسلام'' سے یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان، کفر و الحاد کے پیشوا، لادینیت کے حامل دانشور اور سیکولرازم سے وابستہ مفکرین، تو راضی اور خوش ہوں، مگر عالم اسلام کے علماء، اس ''انقلابی اسلام'' کی بنا پر، ایک دو نہیں، بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں، ''مفکر قرآن'' پر کفر کے فتوے لگا رہے ہوں، تو اس ''انقلابی اسلام'' کی قدر و قیمت معلوم شد۔

اس کے برعکس، مولانا مودودیؒ کے لٹریچر پر، علماء کفر و الحاد اور علمبردارانِ لادینیت نے، جو ریسرچ کی ہے، اس کے نتیجہ میں، وہ، مولانا مودودیؒ کی تعریف و تحسین کرنے کی بجائے، ان کی تحقیر و توہین کرتے ہیں، اور انہیں نامبارک، نامسعود اور منحوس قرار دیتے ہیں۔ صرف ایک حوالہ

ملاحظہ فرمایئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ اقتباس بھی، غالباً اُسی پروفیسر اسمتھ کا ہے، جس نے پرویز صاحب سے کراچی میں ملاقات کی تھی۔

Finally we come to the most ominous representative of this trend, back to religious conservatism: Syed Abu-al-A'la Mawdudi.❶

"(اب) آخرکار، ہم اس منحوس ترین شخص (کے تذکرہ) کی طرف آتے ہیں، جو مذہبی قدامت پسندی کی طرف چلنے والے رجحان کا نمائندہ ہے۔ (یعنی) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔"

مولانا مودودیؒ، کوئی مبرا عن الخطا یا کوئی معصوم شخصیت نہیں تھے، یقیناً، اُن سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی، (بلکہ یقیناً ہوئی ہیں اور خود ہمیں بھی ان سے بعض امور میں اختلاف ہے) لیکن وہ بہرحال، ایسے گناہ گار نہ تھے، کہ عالمِ کفر کے کافر سکالرز، ملحد پیشوا، زندیق فلاسفہ، یہودی ربی اور عیسائی احبار و رہبان، اُن سے خوش ہوتے۔ اگر کسی کی آنکھوں پر تعصب کی عینک نہ چڑھی ہو، سینے میں کینہ و کدورت نہ ہو، دلِ دردمند اور قلبِ حق پسند میں، ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہو، تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "مودودی صاحب کی یہی فضیلت و منقبت کیا کم ہے کہ کفارِ اہلِ مغرب کے ہاں، وہ، انتہائی، نامسعود، از حد نامبارک اور سب سے بڑھ کر منحوس (The Most Ominous) شخصیت قرار پاتے ہیں"..... اور وہ اپنی اس تحقیر و توہین پر، بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔

اِذَا اَتَتْكَ مَذَمَّتِيْ مِنْ نَاقِصٍ ۔۔۔ فَهِيَ الشَّهَادَةُ لِيْ بِاَنِّيْ كَامِلٌ

(جب کسی ناقص و کمتر آدمی کی طرف سے میری مذمت آئے، تو یہی، دراصل، میرے کامل ہونے کی شہادت ہوگی)

اور اس کے برعکس، ہمارے "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی یہی رذیلت و رسوائی کیا کم ہے کہ علماءِ یہود ہوں یا احبار و رہبانِ عیسائیت، علمبردارانِ کفر ہوں یا پیشتی بانانِ الحاد، فلاسفۂ زندقہ ہوں یا دانش ورانِ دہریت۔ وہ سب کے سب راضی اور خوش ہو کر،

❶ Modern Islam in India, by Wilfred Cantwell Smith, Page 164.

انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ﴿ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۝ ﴾

بہر حال، ہمیں افسوس ہے، بحث قدرے پھیل گئی۔ بات ہو رہی تھی ''مفکرِ قرآن'' کے دوہرے معیار کی۔ مولانا مودودیؒ کے لٹریچر پر مغرب میں ریسرچ ہونے لگی، تو پرویز صاحب نے اسے ایک اور معیار پر جانچا، اور جب خود پرویز صاحب کا لٹریچر، اہلِ مغرب کے ہاں معرضِ بحث و تمحیص میں آیا، تو جانچ پڑتال کے لیے ایک دوسرا معیار اختیار کیا گیا۔ معیار کا یہ دوغلا پن، جھوٹ ہی کی ایک شکل ہے، جو ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔

دوہرے معیار کی چھٹی مثال:

ضیاء الحق مرحوم کا عہدِ حکومت تھا۔ نفاذِ اسلام کے لیے وہ اپنی سی کاوش کر رہے تھے، اور اس مقصد کے لیے ادارے بنائے جا رہے تھے، جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے علما کو جمع کیا جا رہا تھا۔ اس دوران، کراچی کے بعض اہلِ حدیث علما نے ایک اخباری کانفرنس کی، جس میں:

> ''انہوں نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ خالص کتاب و سنت پر مبنی فکر رکھنے والے مکتبۂ فکر کو اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی بنچ اور سپریم کورٹ کے شرعی بنچ میں کوئی نمائندگی نہیں دی گئی...... انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے، بننے والی ہر کمیٹی میں اہلِ حدیث علماء کو مناسب نمائندگی دی جائے۔''●

طلوعِ اسلام نے، اہلِ حدیث علماء کے اس مطالبہ پر، جو ''نکتہ رسی'' کی ہے وہ اس کی خوردہ گیری کی ذہنیت کو بے نقاب کر دیتی ہے، وہ لکھتا ہے:

> ''مندرجہ بالا اقتباس میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ان حضرات نے کہا یہ ہے کہ...... ''خالص کتاب و سنت پر مبنی، فکر رکھنے والے مکتبۂ فکر کو بھی نمائندگی دی جائے'' ...... یعنی کتاب و سنت بھی دو قسم کی ہے، ایک خالص کتاب و سنت، اور دوسری (لامحالہ) نخالص کتاب و سنت ...... معلوم نہیں، اس کے جواب میں،

● طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۲

غیر اہل حدیث علماء کیا کہیں گے، اور جب کسی قانون کے مرتب کرنے کا سوال آئے گا تو "خالص کتاب وسنت" اور مخالص کے درمیان کس قسم کی سر پھٹول ہوگی۔"

کس قدر بدقسمت ہے وہ قوم، جس کے اربابِ فکر و دانش، اتنا نہیں سوچتے کہ ملک میں اسلام کے نام پر کیا ہو رہا ہے۔ ●

طلوع اسلام کی ژاژ خائی، ہرزہ سرائی اور خوردہ گیری، دراصل، اُس پست اور گھٹیا ذہنیت کی غماز ہے، جو اُسے (اور خود "مفکر قرآن" صاحب کو) ہمیشہ اور ہر وقت، اپنے مخالفین کی ٹوہ اور تجسس میں مبتلا رکھے ہوئے تھی، تا کہ اگر کہیں سے، بال برابر بھی کوئی چیز مل جائے، تو اُس پر اعتراض جڑ دیا جائے، اور پھر اسے، علما کو بدنام اور رسوا کرنے کا ذریعہ بنالیا جائے۔ ایسی ذہنیت کا مقابلہ کوئی کیسے کر سکتا ہے؟ اس لیے اس "نکتہ رسی" اور "دقیقہ جوئی" کا کوئی لمبا چوڑا جواب دینے کی بجائے، خود طلوع اسلام اور پرویز صاحب کے ایسے اقتباسات کا آئینہ، اُن کے مقابل کر دینا ہی کافی ہے، جس میں "خالص قرآنی فکر"، "خالص قرآن"، "خالص قرآنی قوانین"، "خالص قرآنی تصورات"، اور "خالص اسلام" ہی کی گردان کی گئی ہے۔ چونکہ یہ عبارات، طلوع اسلام ہی سے ماخوذ ہیں، اس لیے حوالہ میں صرف ماہ وسال اور صفحہ نمبر ہی دیا گیا ہے:

(۱)......خالص قرآنی فکر (جس کے کچھ آثار آپ کو پاکستان میں نظر آتے ہیں) کہیں نہیں۔ ●

(۲)......طلوع اسلام کا مسلک ظاہر ہے کہ یہ ہر مسئلہ کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ●

(۳)......اس وقت ساری دنیا میں قرآنِ خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ ●

(۴)......میں نے ہمیشہ آپ کے سامنے خالص قرآن پیش کیا ہے۔ ●

(۵)......جب تک قانون سازی کے سلسلہ میں خالص قرآن کو بنیاد قرار نہیں دیا جائے گا، پاکستان میں اسلامی قوانین مرتب نہیں ہو سکیں گے۔ ●

● طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۲ ● دسمبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۷ ● اکتوبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۸
● دسمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۸۷ ● ستمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۳ ● مئی ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۹

(۶)...... قرآن کا اصلی مقام امت نے قائم نہیں رکھا، بایں وجہ، پریشان فکری اور فرقہ بندی کو عروج ہوا، لہٰذا اب اس کا علاج صرف خالص قرآن ہے۔ ●

(۷)...... میں تو جب اپنی ہزار سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس میں بھی کوئی ایسا دور نظر نہیں آتا جس میں اس قدر التزام اور تسلسل، اس قدر ثبات و سکون، اور اس قدر یک نہجی اور یک جہتی کے ساتھ قرآن اور خالص قرآن کی آواز بلند ہوئی ہو۔ ●

(۸)...... میں تو بکمال عجز و نیاز، بطور تحدیثِ نعمت، یہاں تک کہنے کی بھی جرأت کر سکتا ہوں کہ صدرِ اول کے بعد، ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی، خالص فکرِ قرآنی کا اس قدر عالمگیر چرچا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ●

(۹)...... یہ بات ان لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جو خالص خدا کا قانون نہیں چاہتے۔ ●

سبحان اللہ! کیا کہنے، اس بلندیٔ فکر کے، کہ پہلے تو "خالص قرآنی فکر"، "خالص قرآنی نقطۂ نگاہ"، "خالص قرآن" ہی کی بات تھی۔ اب "مفکرِ قرآن" اور طلوعِ اسلام کی فکر میں ارتقاء واقع ہوتا ہے، تو بات "خالص خدا" تک جا پہنچتی ہے...... "کس قدر بدقسمت ہے وہ قوم، جس کے اربابِ فکر و دانش، اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ملک میں قرآن کے نام پر کیا ہو رہا ہے؟"......

(۱۰)...... مایوسی کی ان اتھاہ تاریکیوں میں، امید کی ایک کرن نظر آتی ہے، ایک طرف سے خالص قرآن کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ ●

(۱۱)...... آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی خالص قرآن) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست حلقہ گوارا کرتا ہے، نہ مغرب زدہ طبقہ۔ ●

(۱۲)...... اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ کہنا کہ "ہمارے نظام و قوانین کی اساس، قرآنِ خالص پر ہونی چاہیے"، جرمِ عظیم قرار پا گیا۔ ●

(۱۳)...... قرآنِ خالص، آئین اور قانون کی اساس قرار دیا جائے، کیونکہ قرآن، تمام فرقوں کے نزدیک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ●

● نومبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۷ ● دسمبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۲۵ ● نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹۷

● جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۷ ● فروری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۵ ● مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۵۸

● اپریل ۱۹۷۰ء، صفحہ ۹ ● جنوری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۲

(۱۴) ... معزز سامعین! یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا صاحبِ فکر موجود ہے، جس کے سینے میں قرآن کریم کی تڑپ موجود ہے، اور ایسی تحریک بھی موجود ہے، جس کی بنیاد خالصۃً قرآنی فکر پر استوار کی گئی ہے۔ ❶

(۱۵) ... میں اسے پھر دہرادوں کہ صدیوں کی ہولناک خاموشی کے بعد، قرآن خالص کی آواز، ہمارے زمانے میں بلند ہوئی ہے، اور پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں اس نغمۂ حیات افروز کے امین آپ ہی ہیں۔ ❷

(۱۶) ... قرآن خالص کو ضابطہ قوانین کی بنیاد قرار دیا جائے۔ ❸

(۱۷) ... مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر، ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا، اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا، طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ ❹

(۱۸) ... آپ کو ان کے اس مقالہ میں، اس ماضی کے کئی نقوش دکھائی دیں گے، جو بعد میں، قرآن خالص پر آنے سے مٹ گئے۔ ❺

(۱۹) ... حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ خالص سے متعلق، جو کچھ اور جتنا کچھ اور جس نوعیت کا، اس مفکر نے تنہا قوم کو دیا ہے، ہماری پوری تاریخ میں، انفرادی طور پر تو ایک طرف، بہ ہیئت مجموعی بھی کہیں اور نہیں ملتا۔ ❻

(۲۰) ... امت کی نگاہوں سے قرآن خالص کو اوجھل کرنے کے لیے، حکمران اور سرمایہ پرست طبقہ براہِ راست کچھ نہیں کر سکتا۔ ❼

مشتے نمونہ از خروارے، ان بیس اقتباسات کے بعد، اب کچھ ان حوالوں کو بھی ایک نظر دیکھ لیجیے، جن میں ”خالص اسلام“ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱) یاد رکھئے! خالص اسلام صرف قرآن کریم کے سرچشمہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ❽

---

❶ نومبر ۱۹۷۲ء، صفحہ: ۵۹ ❷ دسمبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۲ ❸ ستمبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۴

❹ مارچ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۷ ❺ مئی ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۱ ❻ دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۵

❼ فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۲ ❽ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۳

(۴)......"اسلامی" صرف اس نظام کو کہنا چاہیے جو عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ میں قائم ہوا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے مسلمانوں کی طرف منسوب کرنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ اس میں بعض چیزیں اسلام کے مطابق بھی نہ ہوں، لیکن اسلامِ خالص، اس دور میں باقی نہیں رہا تھا۔ ہمیں "اسلامی" صرف اس چیز کو کہنا چاہیے جو اسلامِ خالص کے مطابق ہو، نہ کہ ہر اس بات کو، جو مسلمانوں نے کیا ہو۔ ❶

ان اقتباسات کے آئینہ میں، طلوعِ اسلام اور وابستگانِ طلوعِ اسلام، خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ علماءِ اہلِ حدیث کے بیان سے جو دقیقہ رسی اور نکتہ آفرینی کی گئی ہے، اور پھر اس کی بنیاد پر جو طنز کی گئی ہے، کیا ان کی عبارتیں، اس قسم کی نکتہ آفرینی اور خوردہ گیری، اور پھر اس کی بنیاد پر، اس طنز وطعن سے بالاتر ہیں؟ ازراہِ کرم، آپ خود ہی اس سوال کا جواب اپنے ضمیر کو دے دیں، لیکن دُہرا نہیں بلکہ اکہرا اور واحد معیارِ انصاف کو اپناتے ہوئے۔

دوہرے معیار کی ساتویں مثال:

ہندوستان میں دینی لحاظ سے، مسلمانوں کی حالت کیا تھی؟ طلوعِ اسلام کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

"ہندوستان میں مسلمان جس حالت میں آج ہے، وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ اپنی حکومت کے بغیر یہ کبھی صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ ❷

اس جہنمی زندگی میں آج "مسلمان" بھی اسی طرح جلتا ہے، جس طرح "غیر مسلم"۔ یہ چیز فی الواقعہ بڑی عجیب معلوم ہوگی، لیکن اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی "مسلمان" نام رکھانے والے کریں یا "غیر مسلم"، نتیجہ دونوں کو بھگتنا پڑے گا۔ محض نام بدل دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سنکھیا کو سنکھیا سمجھ کر چاٹیے، یا قند کا ٹکڑا، نتیجہ دونوں صورتوں میں ہلاکت ہوگا۔" ❸

---

❶ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۵
❷ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۸
❸ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۳۵

یہ دونوں اقتباسات قبل از قیام پاکستان، ہندی مسلمان کو صرف نام کا مسلمان قرار دیتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان نام کے مسلمانوں کو، کام کا مسلمان بنانے کے لیے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سب سے پہلے ذہنِ مسلم سے تہذیبِ غالب کی ذہنی برتری کا طلسم توڑا۔ اس کی فلسفیانہ بنیادوں پر کاری ضرب لگائی، اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ سے، مغربی فکر سے مرعوبیت کو زائل کیا۔ اسلامی عقائد و نظریات کی دورِ حاضر کی ذہنی سطح کے مطابق تشریح فرماتے ہوئے ایک منفرد علم الکلام اپنایا۔ قرآن و سنت کی روشنی میں پوری اسلامی زندگی کا نقشہ واضح کیا۔ حیاتِ اجتماعیہ کے ہر گوشے کی وضاحت کی۔ اسلام کا حقیقی فہم اور اصلی شعور پیدا کیا۔ پیغمبرِ اسلام کے اس دنیا میں مقصود و مشن کی وضاحت کی اور امتِ مسلمہ کے سامنے دینِ اسلام کے مطالبات اور مقتضیات رکھے اور اقامتِ دین اور غلبۂ دین کے لیے، اہلِ ایمان کے سینوں میں نئے عزائم بیدار کیے، اور ولولوں کی نئی دنیا آباد کی، اور پھر نام کے ان مسلمانوں کو از سرِ نو اسلام اختیار کرنے کی دعوت دی، کیونکہ بقول پرویز:

"ہم مسلمان محض پیدائشی مسلمان ہیں، اور مسلمان گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے، خود کو مسلمان کہتے اور کہلاتے ہیں، ورنہ ساری عمر میں یہ موقع کبھی نہیں آیا کہ ہم ایمان کے اجزاء اور کلمہ کی اہمیت پر غور کریں۔ ❶

پیدائشی طور پر، نہ کوئی انسان مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ ہر شخص کو ایمان یا کفر کا نظریہ، خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔" ❷

ایک اور مقام پر، اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے اور مسلمانوں کو اپنے آزادانہ اختیار سے مسلمان ہونے کی ترغیب، پرویز صاحب بایں الفاظ دیتے ہیں:

"اسلام ایک سوسائٹی کا نام ہے، اور جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے، اسے مسلمان کہتے ہیں۔ جس طرح کوئی شخص پیدائشی طور پر کسی سوسائٹی کا ممبر نہیں ہوتا، وہ برضا و رغبت اور بطیبِ خاطر کسی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے، اسی طرح کوئی شخص پیدائشی مسلمان

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۷ ❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۵

نہیں ہوتا، اسے برضا و رغبت اور سوچ سمجھ کر مسلمان بننا ہوتا ہے۔ قومی اعتبار سے بے شک ہر وہ بچہ، جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو، مسلمان ہی کہلاتا ہے، اور اسے ایسا کہلوانا بھی چاہیے، لیکن جو مسلمان کبھی مٹ نہیں سکتا، اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیم و خلیل فاش ہوتا ہے، اسے مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود، مسلمان ہونا پڑتا ہے۔" ❶

لیکن جب ان پیدائشی مسلمانوں کو اسلام کی حقیقت اور مقتضیاتِ دین سمجھا کر، انہیں، تجدیدِ ایمان کی دعوت دی گئی اور اقامتِ دین کے لیے، منظم اور اجتماعی جدوجہد کے لیے، جماعتِ اسلامی کا پلیٹ فارم مہیا کیا گیا تو "مفکرِ قرآن" صاحب نے اسے معیوب اور قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"جب جماعتِ اسلامی کی پہلے پہل تشکیل کی گئی، تو اس میں شامل ہونے والوں کو مودودی صاحب نے کلمۂ شہادت پڑھوا کر ازسرِ نو مسلمان کیا۔" ❷

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اگر تجدیدِ ایمان کوئی جرم ہے، تو اس کا ارتکاب خود "مفکرِ قرآن" بھی کر چکے ہیں۔

"اسلام کی حقیقتوں پر میرا ایمان، تقلیدی نہیں۔ تقلیدی ایمان کو تو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ میرا یہ ایمان، ذاتی تحقیق، علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہے، اور اس جہت سے میں اپنے آپ کو "نومسلم" کہا کرتا ہوں۔" ❸

کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے تجدیدِ ایمان تو ایک خوبی ہے لیکن دوسروں کو اس کی دعوت دینا، کوئی معیوب چیز ہے؟ جب "مفکرِ قرآن" خود ازسرِ نو ایمان لا کر، "نومسلم" ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ تلقین فرماتے ہیں کہ...... "جو مسلمان کبھی مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیم و خلیل فاش ہوتا ہے، اسے مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود، مسلمان

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۳ ❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹

❸ شاہکارِ رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۳۹

ہونا پڑتا ہے"...... تاکہ وہ بھی "تقلیدی ایمان" سے دست بردار ہو کر، اپنے ایمان کو "ذاتی تحقیق، علم و بصیرت اور دلائل و براہین" پر استوار کرے، تو پھر آخر یہ دوہرا معیار کیوں؟ کہ اگر جماعتِ اسلامی کے افراد، تجدیدِ ایمان کریں، تو وہ مورد الزام ٹھہریں، اور آپ خود اس "جرم" کا ارتکاب کریں تو یہ آپ کا قابلِ فخر کارنامہ قرار پائے؟

کیا جماعتِ اسلامی سے باہر کے افراد غیر مسلم ہیں؟:

اس کے بعد خوفِ خدا سے عاری ہو کر، اور آخرت کی جواب دہی سے بے پرواہ ہو کر، یہ بہتان تراشی کی جاتی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک، جو لوگ، جماعتِ اسلامی سے وابستہ نہیں ہیں، وہ سب غیر مسلم ہیں، اور ان کے عقائد خلافِ اسلام ہیں:

> "جو شخص اس جماعت سے منسلک ہے وہ مسلمان ہے اور جس کے خیالات ایسے نہیں اس کے عقائد، اسلام کے خلاف ہیں۔ ❶
>
> یہاں کسی فرد یا گروہ کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلامی جماعت ہے، اور اس گروہ سے باہر کے مسلمان، غیر اسلامی جماعت کے افراد ہیں، ایک بہت بڑی بنیادی گمراہی ہے۔ ❷
>
> ان حضرات کے اس مسلک کی بنیاد کس چیز پر ہے، اس جذبۂ نفرت پر، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، نفرت عام مسلمانوں سے، بجز ان چند لوگوں کے جو ان کی جماعت کے ممبر بن جائیں، لیکن اس نفرت کو مقدس اور حسین بنا لیا گیا ہے، یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مسلمان ہی نہیں ہیں، اس لیے ان سے محبت کیوں کی جائے۔ مسلمان صرف ہم ہیں (جنہوں نے اسلامی جماعت کی رکنیت اختیار کر لی ہے)۔ ❸"

مجھے مولانا مودودیؒ یا جماعتِ اسلامی کی کسی کتاب میں، یہ "دعویٰ" دکھائی نہیں دیا کہ اس جماعت سے باہر کے افراد، غیر اسلامی جماعت کے افراد ہیں اور وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اور نہ ہی مجھے اس امر کے شواہد کہیں نظر آئے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے افراد، اپنے مخصوص دائرہ میں محبت

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۹
❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۲
❷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۹ء، صفحہ ۵۶

کا، اور اس سے باہر نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس، عین تشکیل جماعت کے موقع پر، خود مولانا مودودیؒ نے، یہ واضح فرما دیا تھا:

"جماعتِ اسلامی کے نام سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جماعت سے باہر جو لوگ ہیں، ہم ان کو غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ نام جس وجہ سے اختیار کیا ہے وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے مسلک میں نہ اسلام سے کم کوئی چیز ہو نہ اس سے زائد، جس کا عقیدہ وہی ہو جو اسلام کا ہے، نصب العین وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے، نظامِ جماعت وہی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ملتا ہے، اور کام کا ڈھنگ وہی ہو جو انبیاء نے سکھایا ہے، اس کے لیے آخر "جماعتِ اسلامی" کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہرگز یہ فرض نہیں کرتے، اور ایسا فرض کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے، کہ ایمان صرف بس اسی جماعت کے اندر منحصر ہے اور اس کے باہر جو لوگ ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس جماعت کی مخالفت کرے تب بھی مجرد اس کی مخالفت کی بنا پر ہم اسے غیر مومن نہیں کہہ سکتے۔"❶

ایک اور اجتماع جماعتِ اسلامی میں، مولانا مودودیؒ نے "عام مسلمانوں کے بارے میں، جماعت کا نقطۂ نظر" یوں واضح فرمایا:

"بعض حلقوں کی طرف سے، مسلمانوں میں یہ غلط فہمی بکثرت پھیلائی گئی ہے کہ ہم عام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر دربھنگہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کی عملی تردید کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ہم نے جمعہ کی نماز، عام مسلمانوں کے ساتھ ادا کی، لیکن اس پر بھی لوگوں کے لیے یہ سوال دریافت طلب ہی رہا، اور جواب میں امیر جماعت نے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ یہ محض ایک بہتان ہے جو ہماری دعوتِ اصلاح میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جان بوجھ کر لگایا جا رہا ہے۔"❷

لیکن منکرینِ حدیث نے خالق و مخلوق، ہر طرف سے بے شرم و حیا سے بالاتر ہو کر، اس بہتان

❶ رسائل و مسائل، جلد دوم، صفحہ ۳۹۸ ❷ روداد جماعتِ اسلامی، حصہ اول، صفحہ ۱۲۰

پر ایک اور تہمت کا اضافہ کرتے ہوئے، یہاں تک پراپیگنڈہ کیا:

"جماعتِ اسلامی کا عقیدہ، نصب العین اور کلمہ باقی سب مسلمانوں سے الگ ہے،
اور اسی بنا پر انہوں نے ایک الگ جماعت بنانا ضروری سمجھا۔" ❶

اس پر ماسوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ: ﴿ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ ﴾

دوہرا معیار اور پھر جانبدارانہ رویہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تشکیل کردہ "جماعتِ اسلامی" کے نام سے یہ نکتہ نکالنا کہ "جو جماعتِ اسلامی میں نہیں ہے، وہ مسلمان ہی نہیں ہے" ذہنِ پرویز کی عادتِ خوردہ گیری اور روشِ بہتان تراشی کا کرشمہ ہے، جو صرف اور صرف مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی کی مخالفت ہی کے لیے مخصوص ہے، ورنہ اگر وہ عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے، غیر جانبدارانہ انداز میں یہ "نکتہ رسی" کرتے، تو سب سے پہلے، وہ، منکرینِ حدیث کے اُس امرتسری ٹولے کو نشانہ بناتے، جس کے سربراہ خواجہ احمد دین امرتسری تھے، اور جنہوں نے اپنی جماعت کا نام "امتِ مسلمہ" رکھا ہوا تھا۔ کیا ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب، "امتِ مسلمہ" سے ناواقف اور بے خبر تھے؟ ہرگز نہیں۔ طلوعِ اسلام کی فائل میں اس کا ذکر موجود ہے:

"حضرت علامہ کی وفات کے بعد، ملک کے مختلف رسائل و جرائد نے، ان کی بارگاہِ عالیہ میں اپنی عقیدت و محبت کے نذرانے پیش کیے ہیں، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے، چنانچہ امتِ مسلمہ (امرتسر) کے ماہنامہ البیان کا زیرِ نظر پرچہ بھی، اسی گلدستہ کا ایک تر و تازہ پھول ہے۔ اس مجموعہ میں بعض جواہر پارے واقعی ایسے ہیں جن کی اس سے پہلے نمائش نہیں ہوئی۔" ❷

البیان کا زیرِ نظر پرچہ، دفتر امتِ مسلمہ امرتسر سے ۱۰ میں مل سکتا ہے۔ ❸

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۶

❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷۹

❸ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۴۰ء، صفحہ ۴۴

پھر عدل و انصاف کا یہ بھی تقاضا تھا کہ "مفکر قرآن" کی جس نکتہ وری اور سخن سازی کا نشانہ "جماعتِ اسلامی" بنی ہے، اُس کا نشانہ "امتِ مسلمہ" کے علاوہ، "مسلم لیگ" بھی بنتی، کیونکہ جس طرزِ استدلال کو اپنا کر، جو نکتہ علیہ "لفظ" جماعتِ اسلامی" سے کشید کیا گیا ہے اسی اسلوب استنباط کے ساتھ، وہی دقیقہ رسی "مسلم لیگ" سے بھی کی جا سکتی ہے، بالخصوص جبکہ مسلم لیگ، کھلے بندوں یہ اعلان اور نعرہ بھی بلند کرتی رہی ہے کہ "مسلم ہے، تو مسلم لیگ میں آ":

"۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا عہد افروز زمانہ، ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے، تھوڑا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم میں سے ہر شخص 'نشۂ' پاکستان سے سرشار تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا نعرہ تھا۔" ❶

ایک اور مسلم لیگی لیڈر نے تو یہ یہاں تک اعلان بھی فرما دیا:

"مسلم لیگ کبھی مر نہیں سکتی، اس لیے کہ اس کی موت دراصل، اسلامی آئیڈیالوجی کی موت ہے۔" ❷

اس بیان سے ساری دنیا کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون سا ستون ہے جس کے سہارے اسلامی آئیڈیالوجی کی عمارت کھڑی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ تحریکِ پاکستان کے ایک ممتاز راہنما، جناب لیاقت علی خان صاحب نے اپنی ایک تقریر میں یہاں تک بھی کہہ دیا تھا:

"اگر کوئی مسلمان، مسلم لیگ کو چھوڑتا ہے تو یوں سمجھئے، جیسے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر صداقت کی تلاش میں، کسی اور طرف جاتا ہے۔" ❸

لیکن "مفکر قرآن" صاحب کا، بجنے کا سا یہ فتویٰ، اگر عائد ہوتا ہے تو صرف جماعت اسلامی پر۔ وہ "امتِ مسلمہ" امرتسر کو بھی، اور "مسلم لیگ" کو بھی، اپنی اس "دقیقہ جوئی" کا نشانہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟...... صرف اور صرف اس لیے کہ وہ جاہلانہ عصبیت

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۹ ❷ طلوعِ اسلام ۲، جولائی ۱۹۵۵ء، ص: ۱۲

❸ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۳

میں مبتلا ہیں۔ وہ دو "مجرموں" میں، جن میں سے ہر ایک کا محرک جرم ایک ہی ہے، امت مسلمہ اور مسلم لیگ کو اپنا جان کر اپنے فتویٰ سے محفوظ رکھتے ہیں اور مولانا مودودیؒ کی عداوت و معاندت کا شکار ہو کر، "جماعت اسلامی" پر مشقِ ستم فرماتے ہیں۔ کیونکہ جماعت اسلامی کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پرویز صاحب کے خلاف اسلام اٹھائے ہوئے اعتراضات و اشکالات کا، دورِ حاضر کی علمی سطح کے مطابق، نہایت مسکت اور مدلل جواب دینے کا جو سلیقہ اللہ تعالیٰ کی کرم گستری سے پائے ہوئے ہیں، اُس نے "مفکر قرآن" کو بری طرح حسد و کینہ اور احساسِ کہتری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی احساسِ کمتری اور بغض و عناد کے جذبہ کے ساتھ، سید مودودیؒ کے خلاف، برپا کردہ "جہادِ اکبر" میں "مفکر قرآن" صاحب، جو اسلحہ استعمال کرتے رہے ہیں وہ ذاتی پرخاش، گندگیاں اچھالنے کی فنکاری، تہمت تراشی و بہتان طرازی، سب و شتم اور دشنام طرازی جیسے "قرآنی" حربے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ان کے دُہرے معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

باب ۷

تائیدِ باطل کا رویۂ پرویز

بعض اوقات، کسی غلط بات یا بے اصل الزام کی تردید، محض اس لیے نہیں کی جاتی، کہ جس کے خلاف یہ تہمت لگائی جا رہی ہے، آپ خود اس کے خلاف ہیں، اور یہ جانتے ہوئے بھی، کہ بلا ضرورت، بلا ثبوت اور بے سروپا الزام عائد کیا جا رہا ہے، آپ اس کی تردید کی بجائے، سکوت اختیار کر لیتے ہیں، بلاشبہ خاموش تائید کا یہ رویہ بھی، جھوٹ کی ایک صورت ہے، جسے علیم بذات الصدور ہستی کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، لیکن اگر آپ اسی بے بنیاد الزام کو، اپنی زبان سے اعلانیہ بیان کر دیں، یا اپنے قلم کے ذریعہ سے شائع کر دیں، تو آپ کا یہ عمل، خاموش تائید سے آگے بڑھ کر، آپ کو براہِ راست شریکِ الزام بنا دے گا، اور آپ تائیدِ باطل کے مجرم ہوں گے۔

خاموش تائید کا یہ عمل، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر، باطل کی کھلی کھلی تائید کا یہ رویہ، کسی شریف النفس آدمی کو زیب نہیں دیتا، کجا یہ کہ وہ مفکرِ قرآن ہو کر، کتاب اللہ کی تفسیر لکھ رہا ہو، اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کے سینہ میں، حسد و عناد کی آگ بھی بھڑک رہی ہو۔

تائیدِ باطل کی پہلی مثال:

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خلاف، ''مفکرِ قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کا یہی رویہ رہا ہے کہ جس کسی نے جو بات بھی، ان کے خلاف اُچھال دی، انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلط بات ہے، اس کی نہ صرف یہ کہ تردید نہیں کی، بلکہ اپنے مجلّہ میں اسے شائع کر کے تائید بھی کر ڈالی۔ مثلاً گجرات کے ایک وکیل صاحب، مولانا مودودیؒ کے خلاف، بڑے سوقیانہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''مودودی صاحب نے اپنی طباعی اور شوخیٔ قلم کے لیے، قرآن کریم کو ایک جولان گاہ بنا رکھا ہے۔ اچھا ہوتا، اگر وہ کسی اور شغل میں شغف کرتے، اور قرآن پر یہ ظلم بر پا نہ کرتے۔ مودودی صاحب نے اپنے خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے لغت

سے بھی انحراف کیا ہے، عقلِ سلیم، منطق اور دلیل سے تو کوئی سروکار ہی نہیں رکھا، ہاں قارئین کرام کی زود اعتقادی اور عقیدت مندی پر انحصار کر کے، جو جی میں چاہا ہے، لکھ دیا ہے، کسی لغت کی کتاب، قرآن کریم کے کسی حصہ میں "محصنت" کے معنی "بن بیاہی عورتیں" نہیں لیا گیا۔" ❶

اس عبارت میں، مولانا مودودیؒ کے جس جرم پر، یہ سلے دے ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے "محصنات" کا ایک معنی "بن بیاہی عورتیں" بیان کیا ہے، اور وکیل صاحب کو یہ معنی، نہ تو کسی کتابِ لغت میں ملا ہے، اور نہ ہی قرآن کریم کے کسی مقام پر، اور سید مودودیؒ کا قرآن کریم پر، "یہ ظلم برپا کرنا" اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے "اپنی طباعی اور شوخیٔ قلم کے لیے، قرآن کریم کو جولان گاہ بنا رکھا ہے"۔ اور ساتھ ہی، وکیل صاحب، اپنے پندارِ ہمہ دانی کے ساتھ، مولانا مودودیؒ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ "اچھا ہوتا، اگر وہ کسی اور شغل میں شغف کرتے۔"

وکیل صاحب کے اس مضمون کو، طلوعِ اسلام میں شائع کر کے، اس کے مندرجات کے ساتھ، خود اس نے اپنی تائید واضح کر دی۔ حالانکہ مولانا مودودیؒ کے بیان کردہ معنی کی تردید، بجائے خود، ایک باطل اور غلط چیز ہے، کیونکہ "محصنت" کے معانی میں، فی الواقعہ "بن بیاہی عورتیں" بھی شامل ہیں، اور مولانا مودودیؒ کا یہ معنی غلط نہیں ہے، لیکن چونکہ، خود "مفکر قرآن" صاحب کے سینہ میں، مودودیؒ صاحب کے خلاف، مخالفت و عداوت، حقد و کینہ اور حسد و عناد کی آگ، ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی، اس لیے بغضِ مودودیؒ میں، غلط بات کی تائید بھی، ان کے لیے لازم قرار پا گئی، اور یہ تائید باطل بھی شعوری طور پر، جانتے بوجھتے کی گئی ہے، کیونکہ خود "مفکر قرآن" کو بھی یہ علم تھا، کہ "محصنت" کے مفہوم میں "کنواری عورتوں" کا مفہوم بھی شامل ہے، ان کی لغات القرآن میں بھی یہ معنی موجود ہے:

"پاک دامن عورتوں کے لیے مُحْصِنَةٌ اور مُحْصَنَةٌ دونوں الفاظ آتے ہیں، لیکن شادی شدہ کے لیے صرف مُحْصَنَةٌ آتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں پاک دامن

---

❶ طلوعِ اسلام، ۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۲

عورتوں کے لیے اَلْمُحْصَنٰت آیا ہے۔(۲۴/۴)، جس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ، دونوں شامل ہیں۔لہٰذا، جہاں مُحْصَنَۃ آئے گا، وہاں سیاق وسباق کی رو سے دیکھنا ہوگا، کہ اس سے مطلب غیرشادی شدہ پاک دامن عورت ہے، یا شادی شدہ عورت۔"❶

کسی کے خلاف، حسد، ضد اور تعصب کے ساتھ، موقف باطل کی تائید کرنا، اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ایسا شخص اگر کسی کے ساتھ، اختلاف کرتا ہے، یا اس سے بھی آگے بڑھ کر مخالفت پر اتر آتا ہے، تو وہ نیک نیتی کے ہر شائبہ سے پاک ہے، اس قماش کا آدمی، نہ اپنوں سے عدل کرسکتا ہے اور نہ غیروں سے انصاف۔حالانکہ قرآن کریم کا حکم یہ ہے:

﴿ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ط ﴾ [المائدہ:۸]

"کسی قوم کی دشمنی، تمہیں اس بات پر نہ اکسا ڈالے کہ تم عدل نہ کرسکو، عدل ہی کرتے رہو، یہی تقویٰ سے قریب تر (عمل) ہے۔"

تائید باطل کی دوسری مثال:

مولانا مودودیؒ قرآن کریم کے ایک لفظ کا بالکل صحیح ترجمہ کرتے ہیں، طلوعِ اسلام کا ایک مضمون نگار، اپنی علمی بے بضاعتی کے باعث، یا شعوری بدنیتی کی بنا پر، اس ترجمہ کو غلط قرار دیتا ہے، طلوعِ اسلام، اس غلط ترجمہ کی تائید کر ڈالتا ہے، کیونکہ اسے تو بہر حال، مولانا مودودیؒ کی مخالفت ہی کرنی ہے، خواہ وہ کتنی ہی صحیح بات کریں، اور ان کے مقابلہ میں طلوعِ اسلام کو، بہر صورت، اس شخص کی حمایت ہی کرنی ہے، جو مولانا مودودیؒ کا مخالف ہو، خواہ وہ غلط موقف پر ہی کیوں نہ ڈٹا ہوا ہو۔

قرآن کریم، جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے، ایک مقام پر، جو کچھ کہتا ہے، اس کا ترجمہ مولانا محترم بایں الفاظ کرتے ہیں۔

---

❶ لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ ۵۱۸

﴿ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۝ ﴾

"شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر، ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔"

اس ترجمہ پر بایں الفاظ اعتراض کیا گیا ہے:

"اس آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں، جس کا ترجمہ شراب کیا جا سکے، لیکن مودودی صاحب، اسے اپنی طرف سے زیادہ کر دیتے ہیں۔" ❶

جبکہ مولانا مودودیؒ، اس کی دلیل، یہ دیتے ہیں:

"اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے، بلکہ صرف کاس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن عربی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے، جس پیالے میں شراب کی بجائے، دودھ یا پانی ہو، یا جس میں کچھ نہ ہو، اسے کاس نہیں کہتے، کاس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے، جب اس میں شراب ہو۔" ❷

اس پر طلوع اسلام کا یہی "لکھاڑی" لکھتا ہے:

"مودودیؒ صاحب، جب اس طرح کی ہمہ دانی کے دعویٰ کے ساتھ، غلط استدلال کرتے ہیں، تو حیرت ہوتی ہے، شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی طرح دوسروں کا عربی زبان کا علم بھی محدود ہوگا۔" ❸

اور ذرا آگے چل کر، یہی صاحب لکھتے ہیں:

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ مشروب جنت کو مودودی صاحب، شراب بنانے پر کیوں مصر ہیں۔" ❹

حقیقت یہ ہے کہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے، جو لوگ کسی سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں حق کی کوئی بات بھی نہیں آیا کرتی، ایسے لوگوں کا رویہ یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین پر "ہمہ دانی کے دعویٰ کے ساتھ غلط استدلال کرنے" کا الزام عائد کرتے ہیں، تاکہ ان کی اپنی "ہمہ دانی" ہر شک وشبہ سے بالاتر قرار پائے، اور خود ان کا اپنا غلط استدلال اور باطل موقف،

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۵ ❷، ❸، ❹ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۵

لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔

ایک اور مقام پر، یہی مقالہ نگار، اپنے عربی ادب کے وسیع مطالعہ کے پندار میں، غرور و تکبر کے ساتویں آسمان پر پرواز کرتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں:

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب، قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے پہلے، عربی ادب کا بھی مطالعہ کر لیتے۔'' ❶

ہر دور میں، ہوسِ شہرت میں مبتلا لوگ، اپنی بلند پروازی کے لیے، اعاظمِ رجال اور صنادید علم کے منہ لگتے رہے ہیں، حالانکہ چھپکلی خواہ کتنی ہی بلند بامی اختیار کر لے، وہ بہرحال، چھپکلی ہی رہتی ہے، اونچے شہتیروں اور بلند ستونوں کے ساتھ الجھنے سے، اس کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

لفظ کاس اور علماءِ لغت:

جہاں تک، لفظ کاس کے معنی و مفہوم کا تعلق ہے، مولانا مودودیؒ نے کوئی غلط بات نہیں کہی، لغت کی جملہ کتب، اس معنی کی شہادت دیتی ہیں، لیکن میں صرف تین کتبِ لغات کے حوالے، اس کی تائید میں پیش کر رہا ہوں، اور یہ تینوں کتابیں، اُن کتب میں شامل ہیں جنہیں ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے اپنی لغات القرآن کی تسوید میں پیشِ نظر رکھا تھا۔

امام ابو منصور ثعالبی، اپنی شہرہ آفاق کتاب فقہ اللغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) ((لا یقال کأس الا اذا فیھا شراب والّا فھی زجاجۃ ❷))

''کأس (کا لفظ) صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس میں شراب ہو، ورنہ (کاس کی بجائے) زجاجہ کہا جاتا ہے۔''

علامہ ابن منظور، اپنی مشہور کتاب لغت، لسان العرب، میں فرماتے ہیں:

(۲) ((وَالکأس: الزجاجۃ ماذام فیھا شراب وقال ابوحاتم الکأس الشراب لعینہ۔)) ❸

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۸ ❷ فقہ اللغہ، صفحہ ۳۰
❸ لسان العرب، جلد ۶، صفحہ ۱۸۹

"کاس، وہ کانچ کا برتن ہے جس میں شراب بھری ہوئی ہو، اور ابو حاتم کا قول ہے کہ کاس، بجائے خود شراب ہی ہے۔"

آگے چل کر، وہ، ابن سیدہ، کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

((الكأس الخمر نفسها اسم لها، وفي التنزيل العزيز: يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ٥)) [1]

"کاس کا نام بجائے خود شراب کے لیے بھی آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ٥ ﴾"

قدرے آگے چل کر، وہ بعض علماءِ لغت کے حوالہ سے، پھر یہ فرماتے ہیں:

((..... قال بعضهم: هي الزجاجة مادام فيها خمر، فاذا لم يكن فيها خمر فهي قدح، وكل هذا مؤنث وقال ابن الاعرابي: لا تسمى الكأس كأساً الا وفيها الشراب، وقيل هُوَ اسم لهما على الانفراد والاجتماع.)) [2]

"بعض علماءِ لغت نے کہا ہے کہ کاس وہ ساغر شیشہ ہے جس میں شراب ہو، اور جب اس میں شراب نہ رہے، تو پھر قدح (کہلاتا) ہے اور یہ سب مؤنث الفاظ ہیں۔ ابن الاعرابی کا قول ہے کہ کاس کو کاس کہا ہی اس وقت جاتا ہے جبکہ اس میں شراب ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کاس، اکیلی شراب کے لیے بھی آتا ہے اور شراب اور جام شراب، دونوں کے مجموعے کے لیے بھی آتا ہے۔"

لیکن بہر حال، اس لفظ کا اصلی، بنیادی اور غالب استعمال، اُسی ساغر پر ہوتا ہے، جو شراب سے بھرا ہوا ہو، اگرچہ توسعاً، بری شراب کو بھی، اور ساغر و شراب کے مجموعہ کو بھی کاس کہہ دیا جاتا ہے، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر، استعارۃً ہر قسم کی ناگوار اشیاء کے لیے بھی، اس کا استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ علامہ ابن منظور فرماتے ہیں:

---

[1] لسان العرب، جلد ۶، صفحہ ۱۸۹   [2] لسان العرب، جلد ۶، صفحہ ۱۸۹

((وتقع الكأس لكل اناء مع شرابه ويستعار الكأس في جميع ضروب المكاره كقولهم: سقاه كأساً من الذل، وكأساً من الحب والفرقة والموت .))❶

"کاس (کا لفظ) ہر اس برتن پر واقع ہوتا ہے، جس میں شراب ہو، پھر اسی سے جملہ مکروہات کے لیے، اسے استعارۃً استعمال کیا جانے لگا، جیسا کہ لوگوں کا قول ہے کہ "اس نے اسے ذلّت کا پیالہ پلایا، یا اسے محبت، جدائی یا موت کا پیالہ پلایا۔"

اور اس بناء پر، کاس السم (زہر کا پیالہ) کی ترکیب بھی شعراء کے ہاں مستعمل ہے، چنانچہ ایسا ہی ایک شعر، مقالہ نگار نے بھی پیش کیا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کاس میں یہ معانی استعارۃً داخل کیے گئے ہیں، اس کے اصل اور بنیادی معنی، بالکل وہی ہیں، جو مولانا مودودیؒ نے پیش کیے ہیں۔

اب آخر میں مفردات امام راغب کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

(۳) ((كأس قال ﴿ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴾ والكأس الاناء بمافيه من الشراب وسمى كل واحد منهما بانفراده كأساً، يقال شربت كأسًا طيبة يعني بها شراب .))❷

"لفظ کاس جو آیت ﴿ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴾ میں ہے، اس کا مطلب وہ برتن ہے جس میں شراب ہو، اور برتن اور شراب دونوں کے لیے فرداً فرداً بھی یہ نام آتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شَرِبْتُ كَأْسًا یعنی میں نے شراب پی، اور کاس طیبۃ وہ ساغر ہے جس کے ساتھ شراب ہو۔"

ان اقتباسات کو ملاحظہ فرمایئے، ہر ایک میں بنیادی اور اصلی مفہوم یہی مذکور ہے کہ کاس، شراب سے لبریز ساغر کو کہتے ہیں، کسی عالم لغت نے اس معنی کی کہیں بھی نفی نہیں کی، بلکہ انہی معانی کی تائید کی ہے، جو سید مودودیؒ نے بیان کیے ہیں، اگرچہ استعارۃً "ساغرِ زہر"، "پیالۂ

❶ لسان العرب، جلد ۶، صفحہ ۱۹۰ ❷ مفردات امام راغب، صفحہ ۴۴۳

موت" یا "جامِ فرقت" یا "شرابِ عشق کا پیالہ" وغیرہ کی تراکیب بھی قابلِ استعمال ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ طلوعِ اسلام ہو، یا خود پرویز صاحب ہوں، جھوٹ، افتراء پردازی، مغالطہ آرائی، خیانت کاری، قطع و برید ان کا شیوہ ہے، اور اس طلوعِ اسلام کا یہ فیضانِ نظر ہے کہ اس کے "کھاؤ پی" بھی لاماشاء اللہ ایسی ہی "قرآنی فضائل" سے آراستہ ہیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں، "مفکرِ قرآن" صاحب کی لغات القرآن کے دو اقتباسات بھی نذرِ قارئین کر دیے جائیں:

"الکأس: ..... پینے کا برتن جبکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو، اگر پینے کی چیز موجود نہیں، تو اسے کاس نہیں کہا جائے گا قدح کہا جائے گا۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ خالی پیالے کو زجاجہ کہا جائے گا، لیکن راغب نے کہا ہے کہ خالی پیالہ یا صرف شراب (پینے کی چیز) کو کاس کہہ دیا جاتا ہے، خود تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے۔" ❶

ایک دوسرے مقام پر، پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"جب پیالہ بھرا ہوا ہو، تو اسے کاس کہتے ہیں۔ اور جب خالی ہو تو زجاجہ کہلاتا ہے۔" ❷

یہاں "مفکرِ قرآن" نے، سید مودودیؒ کی موافقت سے بچنے کے لیے، بلکہ ان کی مخالفت کرنے کے لیے، کاس کا مفہوم، "شیشے کا وہ برتن قرار دیا ہے، جس میں (شراب کی بجائے) "پینے کی کوئی چیز" ہو۔" تا کہ اس کی فکر سے وابستہ لوگ، تمام اہلِ لغت کے خلاف، اپنے خود ساختہ معنی کو معیار بنا کر، مولانا مودودیؒ کو سرِ غلطی قرار دے سکیں۔

---

❶ لغات القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۴۰۹ ❷ لغات القرآن، جلد ۲، صفحہ ۸۰۰

باب ۸

تخیلاتی مقصود اور حکمتِ عملی

حق، قطع نظر اس کے، کہ فی الواقعہ، وہ حق ہے بھی یا نہیں، اس کی خدمت کے دو انداز ہیں۔ ایک یہ کہ حق کو صرف حق اور باطل کو صرف باطل کہنے پر اکتفا کیا جائے، دونوں کی ایک دوسرے کے بالمقابل وضاحت کی جائے تاکہ دونوں کا مفہوم واضح ہو جائے، اور انسان، پورے شعور اور فہم کے ساتھ، حق کو قبول کرے اور باطل سے اجتناب کرے، اس مقصد کے لیے درس و تدریس اور تلقین و تبلیغ کی جائے، اس کے نتیجہ میں جو لوگ مائل ہوں، ان کا ایک حلقہ بنایا جائے، ایسے ہم خیال افراد کی باہمی مشاورت سے، حلقۂ اثر کو بڑھایا جائے۔ حلقہ سے باہر، موافق افراد کو، شاملِ جماعت کیا جائے، اور ناموافق افراد کی مخالفت و مزاحمت کے خاتمہ کے لیے سوچ و بچار کی جائے۔ بس اس سے آگے، ان کی سعی و کاوش کا مقصود، اور جدوجہد کا منتہی نہیں ہوتا۔

خدمتِ حق کا دوسرا انداز، یہ ہے کہ حق کو صرف حق کہنے اور باطل کو صرف باطل کہنے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ حق کو بالفعل قائم کرنے اور پھر دائم رکھنے کی جدوجہد بھی کی جائے۔ اس کے بالمقابل، باطل کا خاتمہ بھی کیا جائے، بلکہ باطل کا سر کچلنا، شر کی سرکوبی کرنا اور فتنہ و فساد کو ختم کرنا، علمبردارانِ حق کی جدوجہد کا اولین مرحلہ ہوتا ہے، اور پھر جب شر و باطل کی مخالفت و مزاحمت کا ازالہ ہو جاتا ہے، تو پھر اقامتِ حق کا مرحلہ آتا ہے، مرحلۂ اولیٰ، لا الٰہ کا اور مرحلۂ ثانیہ الا اللہ کا مرحلہ ہوتا ہے، تخریبِ باطل اور تعمیرِ حق کے یہ دونوں مراحل، مجاہدینِ حق کی سرگرمیوں کے لازمی مراحل ہیں۔ ابتدائی مرحلے سے انتہائی مرحلے تک پہنچنے کے لیے، وہ بھی تعلیم و تربیت، تلقین و تبلیغ اور درس و تدریس سے کام لیتے ہیں۔ اپنی فکر سے متاثر افراد کو اپنے قافلہ میں شامل کرتے ہیں، قافلہ سے خارج افراد کو، اپنے نصب العین کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی میں انہیں اپنا شریکِ سفر بناتے ہیں۔ راستے کی مزاحمتوں کے ازالہ و خاتمہ کے لیے، ممکن تدابیر سوچتے اور انہیں اختیار کرتے ہیں۔ قطعِ سفر کے

لیے ہر اس ذریعہ اور وسیلہ کو استعمال کرتے ہیں، جسے وہ اپنے پیشِ نظر نصب العین کے حق میں مفید پاتے ہیں۔ پرستارانِ باطل سے، علم بردارانِ حق کی قدم قدم پر کشمکش، اقامتِ حق کے راستہ کی ایک ناگزیر منزل ہوتی ہے، اس کشمکشِ خیر و شر میں، ہر لمحہ ان کی نظریں، اپنے تخیلاتی مقصود اور نظریاتی ملتجا پر لگی رہتی ہیں۔ منزلِ مقصود کی طرف جانے والے راستوں میں سے موزوں ترین راستے کا، اور متنوع ذرائع میں سے مناسب ترین ذرائع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مزاحمت و مخالفت کی متفرق انواع میں سے ہر نوع کی مشکل سے نمٹنے کے لیے، بر وقت اور معقول تدبیر اپنائی جاتی ہے، بدلتے ہوئے احوال میں، بعض اوقات طرق و تدابیر بھی بدلنا پڑتی ہیں، حتیٰ کہ ایک وقت کی تدبیر دوسرے وقت میں ناکارہ قرار پا جاتی ہے۔ لیکن ایسے ہر موقع پر، خواہ کتنے ہی وسائل و ذرائع اور طرق و تدابیر کو بدلنا پڑے، ان کی نگاہیں، اپنے تخیلاتی مقصود پر جمی رہتی ہیں۔ دورانِ کشمکش بعض اوقات، بدلتے ہوئے حالات کے دباؤ میں، جب انہیں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کرنا، ناگزیر دکھائی دیتا ہے، تو وہ کمتر درجے کی برائی کو اپناتے ہیں، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کے سامنے بھلائی کے یک لخت دو راستے آ جاتے ہیں جن میں سے کسی ایک کو اپنانا اور دوسرے کو چھوڑنا، لابدی ہو جاتا ہے، تو ایسی صورت میں، چھوٹی بھلائی کے راستہ کو چھوڑتے ہوئے، بڑی بھلائی کے راستہ کو اپنایا جاتا ہے، اور کبھی ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک مبنی بر صحت اصول پر عمل پیرا ہونا، ان کے نصب العین کے حق میں، اس اصول کو ترک کر دینے کی نسبت، کہیں زیادہ نقصان دہ واقع ہوتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں، ترکِ اصول ہی کا عمل، قرینِ مصلحت ہوگا۔ اور کبھی ایسی نوبت بھی آ جاتی ہے، جس میں خیر کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، اور شر کو کسی عظیم تر مصلحت کی روشنی میں اختیار کرنا ہی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح، بعض اوقات، کسی غلط حکم کی پیروی ہی کسی بڑے شر سے بچاؤ کا ذریعہ بن جاتی ہے، اور بعض اوقات، مطالباتِ حق پر ...... باوجود یہ کہ وہ مطالباتِ حق ہیں ...... زور نہ دینا بھی تقاضاءِ مصلحت قرار پاتا ہے، اور کبھی ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جہاں جھوٹ یا کسی ایسی ہی برائی کو اپنائے بغیر، کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ اور کبھی اپنے ایسے صحت

مندا صولوں میں لچک پیدا کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے، جنہیں ایک مستقل روایت کی حیثیت سے ہمیشہ اپنائے رکھا گیا ہو، لیکن تقاضاءِ وقت، ان میں لچک پیدا کرنے، یا بالکلیہ ترک کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن ان تمام صورتوں میں، خواہ مجبوریوں کی بنا پر، مثبت راہ اختیار کرنی پڑے، یا منفی راہ پر عارضی اور وقتی قدم اٹھانا پڑے، فیصلہ، بہرحال، اپنے نصب العین کی روشنی میں، عظیم تر مصلحت ہی کی بنا پر کیا جائے گا۔

نفاذِ اسلام کی راہ میں آنے والی یہ تمام منزلیں، ناگزیر اور لازمی امر ہیں۔ ان کا واقع ہونا، عقلی بدیہیات میں سے ہے، ان کا انکار، خود عقل و دانش کا انکار ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، کسی شخص کے خط کے جواب میں، اس مسئلہ کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ”آپ نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اپنی تحریک خلاء میں نہیں چلا رہے ہیں، بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد، محض اعلان و اظہارِ حق ہوتا، تو ہم ضرور بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے، لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم کرنے کی کوشش بھی کرنی ہے، اور اس کی اقامت کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے، اس لیے ہمیں نظریت (Idealism) اور حکمتِ عملی (Practical Wisdom) کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے، چلنا پڑتا ہے، آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیشِ نظر رکھیں، بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں اور حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں، اور واقعات کی دنیا میں، ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے، ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑیں، اور اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس غرض کے لیے، ہمیں اپنے آخری مقصود کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے، ہم آگے بڑھتے جائیں۔“ ❶

❶ ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۱

مولانا مودودیؒ، مکتوب نگار کے دوسرے مکتوب کے جواب میں، پاکستان کے حالات، اس کی فضا، اور اس میں پائے جانے والے مختلف عوامل، اور پھر ان عوامل کا وہ اثر، جو مختلف سوچ رکھنے والے لوگوں پر، پڑتا ہے، ان سب کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد، یہ فرماتے ہیں:

''ہمیں لامحالہ واقعات کی اس دنیا میں، موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے، اور مزاحم طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوئے، بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہوگا، ہر قدم جس کے لیے گنجائش، نکل آئے، فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہوگا، دوسرے قدم کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے، پورا زور لگانا پڑے گا۔ اور سمتِ مخالف کی دھکا پیل، اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی، کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے، اس کشمکش کے دوران میں، جتنی بات یہ ضروری ہے کہ ہمارا آخری اور اصلی مقصود، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں، جو قدم رکھا جا چکا ہے، اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں، آگے کے قدم کے لیے، زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں، اور جونہی اس کے لیے جگہ پیدا ہو، اس پر فوراً قبضہ کر لیں، آخری مقصود پر نگاہ جمانا، اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے، تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر قریبی مطمحِ نظر (Immedite Objective) کی حیثیت دینا، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا نہ کرنا ہو، بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا ہو، اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے، تمام ممکن الحصول، موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔ ❶''

اس کے ساتھ ہی متصل، مولانا محترم یہ فرماتے ہیں:

❶ ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۲۱ تا ۲۲

"اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی، بلکہ اس کے ساتھ، عملی حکمت ناگزیر ہے، اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی، طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے، کیوں کہ دوہا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا، نہ پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری، اس پر نہیں ہوتی، مگر جسے چلنا ہی نہ ہو، بلکہ چلانا بھی ہو، وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنا پر قبول نہیں کر سکتا، اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہوتا ہے، جو قوت اس وقت، اس کے پاس موجود ہے، یا فراہم ہونی ممکن ہے، اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں، ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے، اور کونسی نہیں۔ اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے، "براہِ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے، آخر "براہِ راست" کیسے بڑھ جاؤں؟ ان کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں؟ یا زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر پہنچوں؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے، اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے، سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا جاؤں؟ نظری آدمی، اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھہر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر کر، یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو، اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس ایک ہی ہلے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورے کا پورا قائم ہوجائے، مگر کام کرنے والے کو، ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے دیکھنا پڑتا ہے، کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھہر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ پیچھے ہٹوں تو بیک وہلہ منزل پر پہنچنا تو درکنار، اُس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے، جہاں سے پلٹنے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ اور کیا میرے ٹھہرنے یا ہٹنے کی

صورت میں، مزاحم طاقتیں بھی ٹھہر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ سازگار بنانے کے لیے رک جائیں اور میں اسے خوب سازگار بنا کر، اور خود پوری طرح، تیار ہو کر، بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کر سکوں؟ غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابلِ تصور تجویز لے آنا ممکن ہے، کیونکہ جن تخیلات کے عالم میں وہ رہتا ہے، وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے، صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں۔ مگر کام کرنے والا، واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے، اور اس پر کام چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔'' ❶

یہ اقتباس، صرف نظریت اور حکمتِ عملی کے باہمی توازن ہی کو واضح نہیں کرتا، بلکہ نظری آدمی کی ذہنیت کو بھی بے نقاب کر ڈالتا ہے، لیکن اگر ایسا نظری شخص، کسی کام کرنے والے شخص کے خلاف، علمی حسد اور معاصرانہ چشمک کا بھی شکار ہو، تو اس کی بے جا تنقید میں تلخی کا زہر بھی پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ محض یہ جاننے کے لیے کہ کام کرنے والی ٹیم اور اس کے قائد میں کہاں کوئی لغزش واقع ہوئی ہے، تاکہ اسے، اس کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈے کے لیے استعمال کیا جا سکے، نہایت خوردبینی مطالعہ کرتا ہے، اور اپنی پوری توجہ نکتہ چینی اور عیب جوئی پر مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں مل پاتی تو اسے یہ زحمت بھی اٹھانا پڑتی ہے کہ از خود ایسی کوئی چیز گھڑ کر، اس جماعت اور اس کو چلانے والے کی طرف منسوب کر ڈالے۔ جس شخص نے بھی، پرویز صاحب اور ان کے مجلّہ طلوعِ اسلام اور اس تحریک کے لٹریچر کا استقلال و دوام کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، وہ اس لٹریچر میں اسی ذہنیت کو کارفرما پائے گا۔

بہرحال، آئیڈیلزم اور حکمتِ عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنے کی ضرورت اور اہمیت کو، مولانا مودودیؒ، ایک اور پہلو سے بھی واضح فرماتے ہیں:

''ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمتِ عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا،

❶ ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۲۲

اس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو، آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے، ان پر سختی کے ساتھ جما رہے، مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات، جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار، ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں، دوسری طرف ان مواقع پر ہے، جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں، اور تیسری طرف، موافق اور ناموافق حالات کے گھٹنے بڑھنے اُس تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے، یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار مل سکتی ہیں۔ کم از کم، اہل حق کو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں، اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں، اس صورتِ حال میں، جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم، منزل پر ہی رکھوں گا، اور پھر دورانِ سعی، کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر، اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا، وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا، یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ، برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے، وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو، آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بننا چاہیے، اور کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کو ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے، اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا، اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر، حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔''❶

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا آئیڈیلزم اور حکمتِ عملی کے باب میں یہ موقف آیا ان کا خانہ زاد موقف ہے یا فی الواقعہ قرآن و سنت پر مبنی موقف ہے؟ اس ضمن میں، وہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اس معاملہ میں توازن کا بہترین نمونہ، نبی ﷺ کے طرزِ عمل میں ملتا ہے، آپ

❶ ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۲

کی زندگی میں، اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، ان میں سے میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا، آپؐ جو نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا، صرف عرب کے لیے نہ تھا، مگر عرب میں اس کا قائم ہونا اور پوری طرح جم جانا، دنیا میں اس کے قیام کا ناگزیر ذریعہ تھا، کیونکہ آپ کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے، جو مواقع عرب میں حاصل تھے، وہ اور کہیں نہ تھے، اس لیے آپؐ نے اس کو مقصدی اہمیت دی، بیرونی دنیا میں دعوت پہنچانے کی صرف ابتدائی تدبیروں پر اکتفا فرمایا، اپنی پوری توجہ اور پوری طاقت صرف عرب میں اقامتِ دین پر صرف فرمائی، اور بین الاقوامیت کی خاطر، کوئی ایسا کام نہ کیا جو عرب میں اس مقصدِ عظیم کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے، اس برادری میں شامل ہونے والے تمام لوگوں کو یکساں حقوق دیے جائیں، اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے، اس چیز کو قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا، اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا، بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے منصب دے کر، واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی، لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ آیا، تو آپؐ نے ہدایت دی کہ الائمة من قریش "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے، جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے اہم اصول میں اتنے بڑے استثناء کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس وقت عرب کے حالات میں، کسی غیر عرب تو درکنار، کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے حضورؐ نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا، کیونکہ اگر عرب ہی میں، حضورؐ

کے بعد، اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامت دین کا فریضہ کون انجام دیتا، یہ اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار، جس نے اس اصول کی بہ نسبت، بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمت عملی ہی نہیں، حکمت دین کے بھی خلاف ہے۔"●

امامت قریش والی حدیث سے مولانا مودودیؒ نے، مندرجہ ذیل اصولوں کا استنباط فرمایا ہے:

اولاً:...... "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی، جن لوگوں کو قائم کرنا اور چلانا ہو، انہیں آنکھیں بند کر کے حالات کا لحاظ کیے بغیر، پورا کا پورا نسخہ اسلام یکبارگی استعمال نہ کر ڈالنا چاہیے، بلکہ عقل اور بینائی سے کام لے کر، زمان و مکان کے حالات کو ایک مومن کی فراست اور فقیہ کی بصیرت و تدبر کے ساتھ ٹھیک ٹھیک جانچنا چاہیے، جن احکام اور اصولوں کے نفاذ کے لیے حالات سازگار ہوں، انہیں نافذ کرنا چاہیے، اور جن کے لیے حالات سازگار نہ ہوں، ان کو مؤخر رکھ کر، پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ان کے نفاذ کے لیے پہلے فضا موافق ہو سکے، اسی چیز کا نام حکمت یا حکمت عملی ہے، جسکی ایک نہیں بیسیوں مثالیں شارع علیہ السلام کے اقوال اور طرز عمل سے ملتی ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامت دین، بدھوؤں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔"

ثانیاً:...... "اس سے سبق ملتا ہے کہ جب زمان و مکان کے حالات کی وجہ سے، اسلام کے دو احکام یا دو اصولوں یا دو مقاصد کے درمیان عملاً تضاد واقع ہو جائے یعنی دونوں پر بیک وقت عمل کرنا ممکن نہ رہے تو دیکھنا چاہیے کہ شریعت کی نگاہ میں اہم تر چیز کون سی ہے، اور پھر جو چیز اہم تر ہو، اس کی خاطر، شرعی نقطہ نظر سے کم تر اہمیت رکھنے والی چیز کو اس وقت تک ترک کر دینا چاہیے جب تک دونوں پر ایک ساتھ عمل کرنا ممکن نہ ہو جائے، لیکن اسی حد تک ایسا کرنا چاہیے، جس حد تک یہ

● ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۲

ناگزیر ہو۔ نبی ﷺ نے خلافتِ اسلامیہ کے استحکام کو، اصولِ مساوات کے قیام پر ترجیح دی، کیونکہ خلافت کے استحکام پر پورے اسلامی نظامِ زندگی کا قیام و نفاذ موقوف تھا... اور یہ کُل، اسلام کی نگاہ میں ایک جزو کی بہ نسبت، عظیم تر اہمیت رکھتا ہے، لیکن آپؐ نے اس مقصد کے لیے اصولِ مساوات کو بالکلیہ نہیں بلکہ اس کے صرف اس حصے کو معطل رکھا ہے جو منصبِ خلافت سے متعلق تھا، کیونکہ صرف اسی حد تک اس کا تعطل ناگزیر تھا۔ یہ ایک مثال ہے قاعدہ واھون البلیتین کی۔ اس سے وہ موقع و محل بھی معلوم ہو جاتا ہے جس میں یہ قاعدہ جاری ہوگا اور اس کے حدود و شرائط پر بھی روشنی پڑتی ہے۔"

ثالثاً: ....."اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جہاں قبائلیت اور برادریوں کے تعصبات یا دوسری گروہی عصبیتیں زندہ و متحرک ہوں، وہاں ان سے براہِ راست تصادم کرنا مناسب نہیں ہے، بلکہ جہاں جس قبیلے، برادری یا گروہ کا زور ہو، وہاں اسی کے نیک لوگوں کو آگے لانا چاہیے، تاکہ زور آور گروہ کی طاقت، اسلامی نظام کے نفوذ کی مزاحم بننے کی بجائے، اس کی مددگار بنائی جا سکے، اور بالآخر نیک لوگوں کی کارفرمائی سے وہ حالات پیدا ہو سکیں جن میں ہر مسلمان مجرد اپنی دینی و اخلاقی اور ذہنی صلاحیت کی بنا پر، بلا لحاظِ نسل و نسب و وطن، سربراہی کے مقام پر آ سکے۔ یہ بھی اسی حکمت کا ایک شعبہ ہے، جسے حکمتِ عملی کے نام سے یاد کرنے کا گناہ، مجھ سے سرزد ہوا ہے۔" ❶

امامتِ قریش والی حدیث کے علاوہ، حکمتِ عملی کے باب میں، مولانا مودودیؒ نے، جو کئی مثالیں پیش فرمائی ہیں، ان میں سے ایک مثال، ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"راست بازی اور صداقت شعاری، اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے، اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے، لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں

❶ تفہیمات، جلد سوم، صفحہ ۱۴۲

ایسی ہیں جن کی خاطر، جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں، اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔'' ❶

جن بعض حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، ان کی وضاحت بھی، مولانا مودودیؒ نے اس وقت فرما دی تھی، جب کسی معترض نے یہ کہا تھا، کہ ''ایسی اجازت، شخصی حاجات و مشکلات رفع کرنے کی حد تک تو درست ہے مگر دین کے لیے، یا اقامتِ دین کے کام میں، اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا''۔ اس پر مولانا محترم نے یہ فرمایا تھا:

''یہ سراسر ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کے لیے کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں ہے، اور اس کے خلاف دلائل کثرت سے موجود ہیں، خلافت وامامت سے بڑھ کر، اقامتِ دین کا کام اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اور آپ ابھی دیکھ چکے ہیں کہ اس کے قیام واستحکام کی خاطر، نبی ﷺ نے خود اھون البلیتین کے قاعدے کو استعمال فرمایا۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر، اقامتِ دین کا کام آپ کس کو کہہ سکتے ہیں؟ اور اس کی جنگی ضروریات کے لیے جہاں ناگزیر ہو، وہاں جھوٹ کی اجازت حضور نے خود دی ہے جیسا کہ مسلم اور ترمذی کی مستند احادیث سے ثابت ہے۔ اس چیز سے جس شخص کو انکار ہے، اس سے میں پوچھتا ہوں کہ آج اگر آپ ایک حکومت، خلافت علی منہاج النبوت کی بنیاد پر قائم کریں، تو فرمایئے آپ کی حکومت، دشمن ملکوں میں، جاسوس بھیجے گی یا نہیں؟ اور اگر بھیجے گی تو انہیں بہت سے احکام شرعیہ کے معاملے میں ڈھیل دے گی یا نہیں؟ کیا وہ انہیں اس امر کا پابند بنائے گی کہ دشمن ملک میں پورے ناپ تول کی ڈاڑھی رکھیں، تہبند بالکل ٹخنے سے اونچا رکھیں، کھانے پینے کے معاملہ میں تمام شرعی قیود کا لحاظ رکھیں، اور اپنا کام بس سیدھے سادے حلال وطیب ذرائع ہی سے انجام دیں؟ فرض کیجئے، کسی قوم سے آپ کو لڑائی پیش آتی ہے، اور آپ ایسے مواقع پاتے ہیں کہ دشمنوں میں روپیہ پھیلا کر، پھوٹ ڈلوا سکیں، ان کے

❶ تفہیمات، جلد سوم، صفحہ ۹۸

کام کے آدمیوں کو توڑ سکیں، ان کے جنگی راز معلوم کر سکیں، اور ان میں اپنا ایک پانچواں کالم پیدا کر سکیں، آپ ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں گے یا تزویر تیں گے؟
فرض کیجئے، آپ خود اللہ کی راہ میں لڑنے جاتے ہیں، اور دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جاتے ہیں، دشمن، آپ سے اسلامی حکومت کے جنگی راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نہ خاموش رہنا ممکن ہے، نہ توریہ سے کام چلتا ہے، اس حالت میں آپ اپنی فوج اور حکومت کے راز بتا دیں گے یا دشمن کو قصداً جھوٹی اطلاع دے کر، خلافت اسلامیہ کو نقصان اور تباہی سے بچانے کی کوشش کریں گے؟
اس کا جواب نفی یا اثبات، جس میں بھی ہو، صاف ہونا چاہئے تا کہ آپ کا صحیح مؤقف معلوم ہو سکے، اور ساتھ ہی یہ بھی وضاحت فرما دیں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا کام، اور قتال فی سبیل اللہ بھی، آپ کے نزدیک، اقامتِ دین میں شمار ہوتا ہے یا نہیں؟"[1]

یہ ہے مولانا مودودیؒ کا موقف، حکمتِ عملی کے باب میں، جسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس کے حق میں، انہوں نے کتاب وسنت سے جو دلائل پیش کیے ہیں، ان کو ہم نے، بجز امامتِ قریش اور ناگزیر حالات میں اذنِ کذب، کے، جملہ نصوص کو نظرانداز کر دیا ہے۔ تاہم عقل ودانش کی روشنی میں، اس کا وزن، ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے، جو فہمِ اسلام اور تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ، غلبۂ حق کے لیے عملاً میدانِ کشمکش میں سرگرمِ کار ہے۔

"مفکرِ قرآن" نے باوجودیکہ مولانا محترم کی ان جملہ تحریروں کو پڑھا بھی، اور ان میں سے بغرضِ اعتراض حوالے بھی دیئے، لیکن وہ، اقتباسِ بالا میں پیش کردہ جملہ سوالات کا جواب دینے کی جرأت نہ کر سکے، اور صرف ایک سوال کا جواب بایں الفاظ پیش کر سکے:

"جہاں تک جنگ میں گرفتار ہونے والے سپاہی کا تعلق ہے، تو (اگر وہ مومن ہے، تو) جان دے دے گا، لیکن نہ جھوٹ بولے گا اور نہ لشکر کے راز افشا کرے گا۔"[2]

[1] تفہیمات، جلد سوم، صفحہ ۱۲۷ [2] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۰

جہاں تک حکمت دین کے پہلو سے، اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ بعض ناگزیر امور میں جھوٹ بولنے کی شرعاً اجازت ہے، اور ایسے ہی ناگزیر حالات میں، اھون البلیتین کا قاعدہ استعمال کرتے ہوئے، دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی اختیار کرنے کی تاکید ہے تو اس کے دلائل، خود مولانا مودودیؒ نے کتاب وسنت سے پیش کیے ہیں۔ پرویز صاحب، قرآنی دلائل میں تاویل کرتے ہوئے، اس کا مفہوم کچھ اور ہی بیان کر ڈالتے ہیں، اور سنت کے دلائل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ جن احادیث میں، یہ واقعات مذکور ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ "خلافِ قرآن" ہیں، بلکہ "قادحِ منصبِ نبوت" بھی ہیں۔ کیونکہ اس سے معاذ اللہ، نبی اکرم ﷺ پر "اصول شکنی" کا الزام عائد ہوتا ہے۔ للہذا یہ روایات اور یہ واقعات ناقابلِ قبول ہیں۔

حکمتِ عملی اور "مفکرِ قرآن" کا لٹریچر:

مجھے یاد ہے کہ مولانا مودودیؒ کے موقف کی تائید وحمایت میں، عاصم نعمانی صاحب نے روزنامہ جنگ میں، مورخہ ۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو ایک مقالہ شائع کیا تھا، جس میں "مفکرِ قرآن" صاحب کے نقطۂ نظر کی تردید ومخالفت کی گئی تھی۔ عاصم نعمانی صاحب کا یہ مقالہ، دلائل کے اعتبار سے صحیح اور درست ہونے کے باوجود، محض اس بنا پر کمزور تھا کہ انہوں نے یہ ساری قلمی جنگ، خود اپنی سرزمین میں، قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ لڑی تھی، جبکہ اسے فی الواقع، معترض "مفکرِ قرآن" ہی کی گراؤنڈ پر، خود اُن ہی کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہیے تھی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ منکرینِ حدیث، قرآنی دلائل کو اپنی تاویلاتِ فاسدہ کا نشانہ بنا دیتے ہیں، اور پرویز صاحب کے اندھے مقلدین، ان "قرآنی تحریفات" کو، بلند پایہ "علمی نکات" قرار دیتے ہیں۔ صاحب تردید اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ میں نے معترضین کے "قرآنی دلائل" کا جواب دے دیا ہے، اور اِدھر کی قومِ عمون، ان "قرآنی جواہر پاروں" پر مطمئن رہتی ہے۔ رہے سنت کے دلائل، تو وہ ان کے نزدیک سرے سے حجت ہی نہیں ہیں، باقی رہ گئے فقہا و مجتہدینِ امت کے فتاوی ونظریات، تو ان کو، یہ لوگ، بھلا کیا وزن دیں گے، جو خود رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو رد کرنے کے عادی ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کے سامنے نہ قرآنی دلائل ہی کارگر ہیں، نہ نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل

پیش کرنا سود مند ہے، اور نہ فقہاء وعلماءِ امت کے ارشادات۔ ان لوگوں کی گردنیں اگر جھکتی ہیں تو صرف ''مفکرِ قرآن'' کے مقولات و مقالات اور طلوعِ اسلام کی عبارات و اقتباسات ہی کے سامنے جھکتی ہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب ہی کے لٹریچر سے وہ دلائل پیش کریں، جو، خود ''مفکرِ قرآن'' کی تردید اور مولانا مودودیؒ کی تائید پر شاہدِ عدل ہیں۔

(۱) تخیلاتی نصب العین اور عملی صورتحال:

متحدہ ہندوستان میں، جب کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا، کہ ''ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصے (مجوزہ پاکستان) میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی بجائے، پورے ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم کرنا چاہئے''، تو اس وقت ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے ''تخیلاتی نصب العین'' اور ''ہندوستان کی واقعی صورت حال'' میں، موازنہ کرتے ہوئے، مندرجہ ذیل الفاظ میں ''حکمتِ عملی'' کو واضح کیا:

> ''چونکہ اس اعتراض میں ایک خاص اسلامی ولولہ نظر آتا ہے، (اور ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ، واقعی، اسلامی جذبہ کے ماتحت یہ اعتراض کرتے ہوں) اس لیے اس پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا نصب العین، تمام ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہونا چاہئے، لیکن سوال اس وقت صرف تخیلاتی نصب العین کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ عملی طور پر کیا صورت اختیار کی جائے کہ جس سے ہماری حالت آج کی حالت سے بہتر ہو جائے۔'' ❶

اس کے عقلی دلائل دیتے ہوئے، یہ کہا گیا:

> ''یہ ظاہر ہے کہ تمام ہندوستان میں ریت کے منتشر ذروں کی سی زندگی بسر کرنے کے مقابلے میں، (کہ جنہیں ہوا کا ہر تیز جھونکا جدھر چاہے، اڑا کر لے جائے) یہ یقیناً بہتر ہے کہ یہی ذرے سمٹ کر، کسی ایک گوشے میں چٹان بن جائیں، تاکہ حوادثِ زمانہ کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکیں۔ سارے ہندوستان میں ذلت و محکومی کی

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۹

زندگی بسر کرنے کے مقابلے میں، ایک خطے میں عزت اور وقار کی زندگی کا حصول، کون سا خسارے کا سودا ہے۔''❶

یہ اقتباس، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ایک طرف ہمارا نصب العین ہے کہ سارے ہندوستان میں (نہیں، بلکہ ساری روئے زمین پر، کیونکہ ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست) اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے، لیکن یہ ایک ایسا نصب العین ہے، جو تخیلاتی اور تصوراتی نصب العین ہے، عملاً صورتِ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہیں، البتہ ان بعض علاقوں میں اس کا امکان ہو سکتا ہے، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ لہٰذا حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ، تخیلاتی نصب العین کے تحت نہیں، بلکہ واقعاتی صورتِ حال کی روشنی ہی میں کیا جائے، یہی دراصل وہ حکمتِ عملی ہے، جس کا اثبات سید مودودیؒ نے کیا ہے۔

(۲): أهون البليتين:

متحدہ ہندوستان میں، مسلم لیگ کے ایک دھڑے نے، جس کی قیادت، سر سکندر حیات خاں کر رہے تھے، مسلم لیگ کے مجموعی موقف سے انحراف کیا، جس پر تعزیری کاروائی لازم تھی، لیکن قائد اعظم نے اس سرتابی پر، کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا، کیوں؟ اس لیے کہ مسلم لیگ کے قائد اعظم، اگر کوئی ایسا قدم اٹھاتے، تو خدشہ تھا کہ سر سکندر حیات اپنے دھڑے کے ساتھ علیحدہ ہو جاتے اور مسلم لیگ کی قوت دو حصوں میں بٹ کر کمزور ہو جاتی، نیز یہ کہ یہ علیحدگی، علیحدگی کے مزید دروازوں کو کھول کر، مسلم لیگ کی شکست وریخت کا باعث بن جاتی۔ اب صورتِ حال یہ تھی، ایک طرف، سر سکندر حیات کی سرکشی اور عدوان کے مضرات تھے، اور دوسری طرف تعزیری قدم اٹھانے کے بھی سنگین نتائج متوقع تھے، چنانچہ قائد اعظم نے محسوس کیا کہ تعزیری قدم اٹھانے کی نسبت، نہ اٹھانا، کم ضرررساں ہے، اس لیے انہوں نے کوئی تعزیری قدم اٹھانے سے گریز کیا۔

اس پر طلوعِ اسلام نے یہ تبصرہ کیا:

---

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۹

''ایک طرف، خود غرض ''رفقائے کار'' کی سرکشی و عدوان کے ملکی نقصانات۔ دوسری طرف، ان کے خلاف تعزیری اقدامات کی صورت میں، ان کی مفسدہ پردازیوں کی روک تھام کے لیے قوت کی کمی۔ اس مقام پر یہ تولنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان دونوں مفسدوں میں سے کون سا مفسدہ ملت کے لیے کم نقصان کا باعث ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں، جذبات کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ سرکشی، سرتابی کی سزا ضرور دی جانی چاہیے، ورنہ وقار (Prestige) پر حرف آتا ہے، اس لیے یہ امتحان اور بھی سخت ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جذبات پر قابو رکھنا، اور پھر یہ طے کرنا کہ ہر دو نقصانات میں سے کون سا نقصان نسبتاً کم ضرر رساں ہے، صاحب ہمت و بصیرت کا کام ہے۔ ملت اسلامیہ کی خوش بختی ہے کہ ان کے سیاسی مدار الیہ کو اللہ تعالیٰ نے ہمت و بصیرت سے بہرہ وافر عطا فرمایا ہے۔ مسٹر جناح نے حالات کی نزاکت پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور گہرے تدبر کے بعد وہ راہ اختیار کی، جو مفاد ملت کے لیے کم ضرر رساں ہے۔''❶

اس ضمن میں آگے چل کر، پرویز صاحب نے اھون البلیتین کی وہی اصطلاح استعمال کی ہے، جسے مولانا مودودی نے استعمال کیا ہے:

''مسٹر جناح کا یہ فیصلہ، شدائد پر مبنی ہے، نہ دوں ہمتی پر، بلکہ قوم کے موجودہ حالات کے پیش نظر، اھون البلیتین (Lesser Evil) کا انتخاب ہے۔''❷

اس کے ساتھ ہی، اھون البلیتین کے حق میں قرآن کریم سے ان الفاظ میں استدلال کیا جاتا ہے:

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر معتکف ہونے کے لیے گئے، تو قوم کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں سامری نے بچھڑا بنایا، اور قوم اس کی پرستش کرنے لگ گئی۔ جب حضرت موسیٰ نے آ کر دیکھا کہ قوم گؤسالہ پرستی

---

❶ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۹ ❷ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷

میں الجھ رہی ہے، تو نہایت خشم ناک ہو کر حضرت ہارونؑ سے پوچھا کہ: ﴿ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ﴾ "جب تو نے دیکھا کہ قوم یوں گمراہ ہو رہی ہے تو تمہیں کس چیز نے اس بات سے روکا کہ تو انہیں شرک سے منع کرتا۔" حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں نے اگر سختی سے نہیں روکا، تو اس خیال سے کہ: ﴿ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۝ ﴾ (۲۰/۹۴) "میں ڈرا کہ تم یہ نہ کہو کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، اور میری بات کا خیال نہ کیا....." اس پر حضرت موسیٰ نے انہیں کچھ اور نہیں کہا۔ دیکھیے، حضرت ہارونؑ خود نبی ہیں، قوم ان کی نگرانی میں دی گئی ہے، اس نے گئو سالہ پرستی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس جرم کے نتائج ان کے سامنے ہیں، لیکن سختی نہیں کرتے، کیا انہیں ڈر ہے کہ اس سے ان میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا اور تفرق و تحزب کے عواقب سختی میں التواء کے نتائج سے کہیں زیادہ ضرر رساں ہیں، اس لیے وہ انتظار کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ واپس تشریف لے آئیں تو پھر ان کی قوت کے ساتھ وہ قدم اٹھایا جائے کہ گئو سالہ پرستی بھی ختم ہو، اور تفرقہ بھی پیدا نہ ہو۔" ❶

اھون البلیتین کا یہ قاعدہ، جسے "مفکر قرآن" نے قرآن مجید سے اخذ کیا، اور پھر اسے قائد اعظم کے حق میں استعمال کیا، وہی قاعدہ ہے، جسے مولانا مودودیؒ نے، ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

"قاعدہ اختیار اھون البلیتین یہ ہے کہ جب کبھی آدمی کو ایسے حالات سے سابقہ پیش آئے، جن کے اندر دو برائیوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے، تو وہ اس برائی کو اختیار کرے جو شریعت کی نگاہ میں کم بری ہو، اسی طرح جب شریعت کی دو قدروں یا دو مقاصد کو بیک وقت حاصل کرنا ممکن نہ ہو، یا دو احکام پر ایک ساتھ عمل نہ ہو سکے تو ان میں سے اس چیز کو اختیار کیا جائے، جس کی قدر و اہمیت شریعت کی

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۰ تا ۲۲

نگاہ میں زیادہ ہو، اور کم تر قدر و اہمیت کی چیز کو زیادہ بیش قیمت چیز پر اس حد تک قربان کیا جائے، جس حد تک کہ وہ اس موقع و محل میں ناگزیر ہو۔ اس قاعدے کے استعمال کی صحت کا انحصار بھی اس پر ہے کہ آدمی، جس چیز کو جس چیز پر ترجیح دے رہا ہے، اس کے اہم تر ہونے کی دلیل، اس کے پاس کتاب وسنت سے ہو، اور وہ یہ ثابت کر سکے کہ اس وقت یہ ترجیح فی الواقع ناگزیر ہے۔" ❶

اب اگر اس قاعدہ (اھون البلیتین) کو "مفکر قرآن"، اُس قائد اعظم کے حق میں استعمال کر سکتے ہیں، جنھوں نے بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی کو اختیار کرنا، ناگزیر سمجھا، تو محمد رسول اللہ ﷺ، خلافت و امامتِ قریش کے معاملہ میں، اسی قاعدہ کو کیوں استعمال نہیں کر سکتے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مساوات کے عام اصول پر عمل پیرا ہونا، پورے دین کی اقامت کو خطرے میں ڈال دینے کا موجب تھا؟

(۲) وسیع تر مفاد میں "اصول شکنی":

پاکستان بنتے ہی، طلوعِ اسلام نے، جب اپنے تصورِ قرآن کو حدیثِ رسولؐ اور سنتِ نبیؐ سے کھلے بندوں جدا کر لیا، تو ان لوگوں سے اُس کا اختلاف ناگزیر ہو گیا جو قرآن وسنت ہی کو اسلام کا سرچشمہ تسلیم کر رہے تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ کتاب وسنت ہی کی روشنی میں، طرز یثرب پر، پاکستان کی اسلامی ریاست کی تعمیر کی جائے۔ طلوعِ اسلام نے ان کے بالمقابل، یہ کوشش کی کہ فقط قرآن ہی کے نام کی آڑ میں، یہاں وہ نظام نافذ کیا جائے، جسے تہذیب مغرب کی فاسد معاشرت کے لوازمات کو، اشتراکیت کے ساتھ پیوند کاری کرتے ہوئے، قرآن کریم کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے "مفکر قرآن" صاحب نے پاکستان کی مقننہ کے ارکان کو "قرآنی دستور" کے مسودات بھیجے تاکہ اسمبلی میں یہ منظور ہو کر ملکی آئین بن سکے، لیکن ارکانِ اسمبلی نے طلوعِ اسلام اور جناب پرویز صاحب کی اس کارگزاری کا کوئی اثر نہ لیا، اور حکمران، اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر، محلاتی سازشوں میں الجھتے رہے، جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا

---

❶ تفہیمات، جلد ۳، صفحہ ۱۲۵

کہ وہ آئین بھی فن کے گھاٹ اتر گیا، جو قرآن وسنت کی روشنی میں مدون کیا گیا تھا۔ چنانچہ اُس وقت:

''طلوعِ اسلام کی ساری امیدیں، اب اس خیال سے وابستہ تھیں کہ جب اس کانسٹی ٹیوشن کے بعد، نئی اسمبلی کے بننے کا وقت آئے گا، تو اس وقت ایسی کوشش کی جائے گی کہ اس میں ایسے لوگ آجائیں جو قرآنی تصورِ زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھیں، اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی تڑپ، ان کے دل میں موجود ہو۔ لیکن یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس سارے غلط آئین کو، جو انہوں نے بنایا تھا، یوں کالعدم کر دیا، اور اس کا موقع بہم پہنچا دیا، کہ قوم کے نئے نمائندے ازسرنو آئین مرتب کریں۔ لہٰذا، ہمارے پاس آج سے لے کر الیکشن ہونے تک کا وقت ہے، اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا، تو اس کا امکان ہے کہ اس مملکت میں قرآنی نظام نافذ ہو سکے، لیکن اس کے لیے بڑا کام کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں پہلی ضرورت یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی مشینری کو تیز تر کر دیا جائے۔''❶

یہ وہ مقام ہے، جہاں طلوعِ اسلام کو، وسیع تر ''قرآنی مفاد'' میں اپنے ایک اصول کو توڑنا پڑ رہا ہے، کیونکہ ''قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی مشینری کو تیز تر'' کرنے کے لیے، طلوعِ اسلام کو، اگر ایک روزنامہ کی شکل میں نہیں، تو کم از کم ہفتہ وار صورت میں ضرور اشاعت پذیر ہونا چاہئے، لیکن اس کی راہ میں شدید ترین رکاوٹ قلتِ سرمایہ ہے۔ طلوعِ اسلام، اب تک عطیات نہ لینے کے اصول پر قائم رہا ہے، لیکن اب ایک طرف، اس اصول کو نباہے رکھنے کی روایت ہے، تو دوسری طرف، ''قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی مشینری کو تیز تر'' کر دینے کا شدید تقاضا ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصول کا دامن تھامے رکھا جائے؟...... یا...... اصول شکنی کی جائے؟

''طلوعِ اسلام نے اس سے پہلے ایک اسکیم پیش کی تھی، کہ طلوعِ اسلام کو روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ وار کر دیا جائے، اور اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے،

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۱

لیکن سرمایہ اکٹھا نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ہم سمجھتے ہیں اب وہ وقت نہیں رہا کہ اس میں مزید تاخیر کی جائے۔ طلوعِ اسلام نے آج تک کسی سے عطیے قبول نہیں کیے، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اب کوتاہی کی، تو وہ قرآن کی بارگاہ میں بہت بڑا مجرم سمجھا جائے گا، لہٰذا، وہ اس عظیم مقصد کے لیے، اپنے سابقہ اصول کو توڑ کر، عطیوں کے لیے جھولی پھیلانے پر آمادہ ہو گیا ہے۔"❶

یہ عبارت، اس امر کی واضح دلیل ہے کہ بعض حالات میں، "اصول شکنی" ہی تقاضائے دین قرار پاتی ہے، اور طلوعِ اسلام نے، خود اسے "اصول شکنی" ہی سے تعبیر کیا ہے، اور، لاریب، یہ "اصول شکنی" اس موازنہ کے بعد ہی کی گئی ہے کہ سابقہ اصول کو نباہے رکھنا، بارگاہِ قرآن میں خسارے کا سودا ہے، اور اسے توڑ کر، عطیات کے لیے جھولی پھیلانا، دینی نقطۂ نظر سے افضل اور اولیٰ ہے۔ ٹھیک یہی بات ہے، اور یہی مصلحت ہے، جس کے پیشِ نظر، نبی اکرم ﷺ نے، امامتِ قریش کے مسئلہ میں، اصولِ مساوات کے توڑنے کو، عرب کے مجموعی ماحول میں، حالات کا ناگزیر تقاضا سمجھا، کیونکہ اس وقت، اصولِ مساوات پر جمے رہنا، اسے ترک کر دینے کی نسبت، زیادہ نقصان دہ تھا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے، ترکِ مساوات کی ادنیٰ برائی کو مجبوراً اختیار فرمایا، تاکہ اس سے تمسک کا نتیجہ، اعلیٰ و عظیم تر برائی کی صورت میں یہ نہ نکلے کہ تیئیس سالہ پیغمبرانہ جدوجہد کے باوجود بھی، عرب میں وہ اسلامی نظام قائم نہ ہو سکتا، جو پوری روئے زمین پر اقامتِ دین کا ایک ابتدائی ذریعہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے اصولِ مساوات پر اصرار نہ فرمایا، جس سے یہ سبق ملتا ہے:

"ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار، جس سے اس اصول کی بہ نسبت، بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں، حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔"❷

حضور اکرم ﷺ کے آخری دور میں، ان قبائل کی، جو فتح مکہ کے بعد، جوق در جوق اور

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۱ ❷ ترجمان القرآن: دسمبر ۱۹۵۶ء، تفہیمات، جلد ۳، صفحہ ۲۷

فوج در فوج، دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس درجہ کی ایمانی پختگی اور ذہنی تربیت اور عملی اصلاح نہیں ہوئی تھی، جس درجہ کی مہاجرین وانصار کی ہو چکی تھی۔ ایسے حالات میں، نومسلمانانِ عرب کی بہت بڑی اکثریت میں، اصولِ مساوات کی رو سے، کسی غیر عرب کو تو درکنار، غیر قریشی کو بھی خلیفہ بنا دیا جاتا، تو اس کی خلافت عملاً کامیاب نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ پورے عرب کی قیادت، زمانہ دراز سے، صرف قریش ہی کے پاس تھی، عامۃ الناس میں سے اچھے لوگ صالحینِ قریش کی، اور بُرے لوگ فاسقینِ قریش ہی کی پیروی کرتے چلے آ رہے تھے۔ افرادِ عرب، قریش کے علاوہ، نہ کسی کی قیادت کو جانتے تھے اور نہ ماننے ہی کے لیے تیار تھے، مدتِ دراز کی قیادتِ قریش سے لوگوں کے قلوب واذہان میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی، کہ وہی عربوں کو اپنی سربراہی میں متحد رکھ سکتے تھے، اور خود عرب بھی، ان ہی کی سربراہی میں مجتمع ہو کر کام کر سکتے تھے، اور قریش ہی کی قوت وطاقت، عربوں کے انحراف کی صورت میں، انہیں دبا سکتی تھی، اسی لیے آپؐ نے خلافت وامارت کے لیے قریش ہی کے حق میں ہدایت فرمائی۔ روایات واحادیث میں، نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور کا یہ پورا نقشہ موجود ہے، ان روایات کو پیش کرنے کے بعد، مولانا مودودیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے جس بنا پر قریش کے لیے خلافت مخصوص کرنے کی ہدایت فرمائی، وہ یہ تھی کہ عرب میں ان کا اثر واقتدار پہلے سے قائم چلا آ رہا تھا، اصولِ مساوات قائم کرنے کے لیے، اگر اس وقت خلافت کا منصب ہر عربی وعجمی مسلمان کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا، تو نہ صرف یہ کہ عرب قبائل، اس کے قابو میں نہ رہتے بلکہ خود قریش کے اندر جو بُرے لوگ تھے، ان کو بھی سر اٹھانے کا موقع مل جاتا، اور قریش کی طاقت کا بڑا حصہ، خلافتِ اسلامیہ کی مزاحمت میں صرف ہوتا۔ اس میں یہ خطرہ تھا کہ سرے سے وہ اسلامی نظام ہی مستحکم نہ ہو سکتا جس کے بے شمار اصولِ خیر میں سے صرف ایک یہ اصولِ مساوات تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اولیٰ وانسب یہی سمجھا کہ ان حالات میں قریش کے صالحین کو کام کرنے کا

موقع دیا جائے، تاکہ اس قبیلے کی طاقت، اسلامی خلافت کی مزاحم بننے کی بجائے، اس کی پشت پناہ بنے، اس صورت میں یہ غالب توقع تھی کہ اسلامی نظامِ زندگی غالب اور مستحکم ہو کر رہے گا، اور جب وہ پوری طرح نافذ و مستحکم ہو گا تو جہاں اور بے شمار بھلائیاں قائم ہوں گی، وہیں ایک روز خلافت کے معاملے میں بھی اصولِ مساوات قائم کرنے کے لیے ساز گار حالات پیدا ہو جائیں گے۔"❶

اس صورتِ حال میں، قیادت وخلافت کے باب میں، نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دی گئی ہدایت پر جو شخص بھی تعصب اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر غور وفکر کرے گا، وہ نبی اکرم ﷺ کی بصیرت وفراست اور معاملہ فہمی کو خراجِ عقیدت اور ہدیۂ تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا کجا یہ کہ وہ، اسے آپ کی "اصول شکنی" قرار دے کر، انکارِ حدیث کا طرزِ عمل اختیار کرے، اور ہر اُس عالم کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ پڑے، جو اس واقعہ کو اھون البلیتین کی ہدایت کا ماخذ قرار دے کر تصدیقِ حدیث کرے۔

(۴) تغیرِ احوال میں تغیرِ حکم:

قواعدِ شرعیہ میں، ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ حالات کے بدلنے پر حکم یا فتویٰ بھی بدل جایا کرتا ہے، ایک چیز، اگر ایک وقت میں جائز ہے، تو دوسرے وقت میں، وہی چیز، تغیرِ احوال کے پیشِ نظر، ناجائز قرار پا سکتی ہے، عین ممکن ہے کہ کل جس چیز کی ضرورت تھی، آج اس کی حاجت نہ ہو، "مفکرِ قرآن" کا مندرجہ ذیل اقتباس، اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہے، یہ اقتباس، اُس وقت ایک اعتراض کے جواب میں، "مفکرِ قرآن" کے قلم سے برآمد ہوا تھا، جس وقت کسی نے اُن سے یہ سوال کیا:

> "کیا اصول، وقت کے مطابق بدل جاتے ہیں؟ اُس زمانے میں (قیامِ پاکستان سے قبل، متحدہ ہندوستان میں ...قاسمی) مسلمانوں میں سیاسی پارٹی بازی جائز تھی، اور اب قرآن، اسے شرک قرار دیتا ہے؟"

❶ طلوعِ اسلام، جلد ۳، صفحہ ۱۴۰

اس پر "مفکرِ قرآن" صاحب فرماتے ہیں:

"وہاں ہندو اور مسلم ایک ملک میں رہتے تھے، ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ اس وطن میں رہنے والے (تمام باشندے) ایک قوم یا ایک جماعت ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے حامیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم یا جماعت ہیں۔ اس دعویٰ کو منوانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہاں کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو منظم کیا جائے، اس تنظیم کا نام مسلم لیگ تھا جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں سیاسی پارٹی تھی، پارٹی ہی نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم یا ملتِ اسلامیہ کی نمائندہ جماعت تھی، چونکہ ملت کے اندر سیاسی پارٹیوں کا وجود جائز نہیں ہوتا، اس لیے قائدِ اعظم مسلمانوں کی دوسری سیاسی پارٹیوں کے خلاف تھے اور انہیں بار بار دعوت دیتے تھے کہ وہ اپنی پارٹیوں کو ختم کر کے، ملت کی نمائندہ جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں، تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہندوؤں کے مقابلہ میں، مسلمانوں کی ملی تقسیم کا سوال باقی نہ رہا، اس لیے مسلم لیگ کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔" ❶

تفاوتِ احوال کی یہی وہ صورت ہے جس کی بنا پر، بقول پرویز صاحب، متحدہ ہندوستان میں، ایک مسلمان سیاسی پارٹی کے وجود کو جائز قرار دیا گیا، اور پاکستان کے بدلے ہوئے حالات میں، اس کا وجود، ناجائز بلکہ "شرک" قرار پا گیا۔

لاریب، تغیرِ احوال کے ساتھ تغیرِ احکام، کی یہ صورتِ حال، ہر اس تحریک کو پیش آ سکتی ہے جو اقامتِ دین کے لیے کوشاں ہو، لیکن یہی عقلی اور معقول اصول، کسی روایتِ حدیث میں مذکور ہو، تو منکرینِ حدیث، اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر، اسے "اصولِ مضحکی" بنا کر پیش کرتے ہیں، مگر "مفکرِ قرآن" کے برعکس قرآن و سنت میں ایسی کوئی چیز مذکور نہیں ہے، جو ایک وقت میں، جائز قرار پائے، اور وہ دوسرے وقت میں وہ کفر و شرک بن جائے۔ تاہم تغیرِ احوال کے ساتھ تغیرِ احکام کے اصول کو، خواہ قرآن سے مستنبط مانا جائے، یا سنتِ رسول سے، بہرحال، فی نفسہٖ، امرِ حق ہے۔

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۹

(۵) امرِ معصیت میں اطاعتِ حکومت:

حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری، کیا امرِ معصیت میں جائز ہے یا نہیں؟ خود طلوعِ اسلام، اس باب میں، اپنا موقف یوں پیش کرتا ہے:

"قرآنی مملکت کے ہر فرد کے لیے، حکومت سے باز پرس کا دروازہ، ہر وقت کھلا رہتا ہے، اور اگر حکومت اس کے باوجود، اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہتی ہے، تو اس کی اطاعت کا جوا، معاشرہ کی گردن سے اتر جاتا ہے، اس لیے کہ حکومت کی طرف سے اس ذمہ داری کی عدمِ ادائیگی، احکامِ خداوندی کی معصیت ہے، اور قرآن کریم کی رو سے اطاعت، معروف کی ہے، معصیت کی نہیں۔"❶

لیکن "مفکرِ قرآن" صاحب، اس مسئلہ کو، قرآن کی روشنی میں طے کرنے کی بجائے، قاعدہ اھون البلیتین کی اساس پر طے کرتے ہیں، ایک طرف، اگر تقاضائے قرآن یہ ہے کہ غلط حکم دینے والے حکام کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا جائے، تو دوسری طرف، ایسا کرنے سے تفرقہ و انتشار کے پیدا ہونے کا خطرہ بھی ہے۔ اب سوال یہ سامنے آ گیا کہ ..."حکمرانوں کے امورِ باطلہ میں بھی اطاعت کی جائے" ...... یا ..... پھر ان کی اطاعت سے دست کش ہو کر، تفرقہ و انتشار کا موجب بنا جائے؟..... "مفکرِ قرآن" صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر اس (حکومت) کا کوئی فیصلہ ایسا ہے، جسے آپ اپنی بصیرت کے مطابق صحیح نہیں سمجھتے، تو اس کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی، نہ کہ آپ پر، لیکن بایں ہمہ، اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس کی اتباع سے آپ گنہگار ہوں گے، تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی مخالفت سے آپ امت میں، جو تفرقہ اور انتشار پیدا کریں گے، تو اس کے لیے آپ خدا کے فیصلہ کے مطابق مشرک قرار پائیں گے۔ سوچیے کہ ان دونوں میں سے کونسا جرم زیادہ سنگین ہے؟"❷

یہ وہی اھون البلیتین کا قاعدہ ہے جسے مولانا مودودیؒ نے بیان فرمایا ہے، اور جو خود پرویز

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۹ ❷ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۷ء، صفحہ ۸

صاحب کو بھی مسلم ہے۔ نظری اعتبار سے تو یقیناً ہر حکم، نہ صرف یہ کہ قابلِ اتباع بلکہ واجب الاطاعت بھی ہے، لیکن عملی زندگی میں ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جہاں ایک حکم شرعی پر عمل کرنا کہیں زیادہ فتنہ و فساد کا موجب بنتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ اس حکم شرعی کو ترک کر دیا جائے۔ یہی بات ہے جس کی مولانا مودودی نے یوں توضیح و تشریح فرمائی ہے:

”نظری حیثیت سے تو ہر حق اصول قائم کرنے کے لیے، اور ہر غلط چیز ترک کرنے اور مٹا دینے کے لائق ہے، لیکن عملی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش کے درمیان انسان کو بہت سے مواقع پر ایسے حالات سے بھی سابقہ پیش آ جاتا ہے جن میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے ایک بڑی بھلائی کا نقصان ہوتا ہے یا ایک چھوٹی برائی کو ترک کرنے سے ایک بڑی برائی لازم آتی ہے، ایسے مواقع پر شکل بھی یہ پائی جاتی ہے کہ ایک کم قیمت چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے۔ اور شریعتِ الٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بڑی برائی سے بچنے کے لیے چھوٹی برائی کو گوارا کیا جائے اور چھوٹی بھلائی کی خاطر بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔“ ❶

امامت قریش کے معاملہ میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی۔ حضور اکرم ﷺ اگر عدم اصول مساوات کی چھوٹی بھلائی پر اصرار فرماتے، تو یقیناً اس کے نتیجے میں اس بڑی بھلائی کا نقصان لازم آ جاتا، جو اسلامی ریاست کے عدم وجود کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ چنانچہ آپ نے حکومت الٰہیہ کے عدم وجود کے بڑے شر سے بچنے کے لیے اس چھوٹی برائی کو قبول کرنے کی ہدایت فرمائی، جو اصول مساوات کی جزوی معطلی کی صورت میں واقع ہوئی۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اہون البلیتین کے تقاضوں کی روشنی میں خود پرویز صاحب فیصلہ کریں، تو وہ درست قرار پائے، اور حضور اکرم ﷺ فیصلہ فرمائیں، تو وہ ”اصول شکنی“ قرار پائے۔

❶ تفہیمات، جلد سوم، صفحہ ۷۶

(۶) مطالباتِ حق پر زور نہ دینا، تقاضاءِ مصلحت:

کبھی ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ حق پر قائم رہتے ہوئے بھی، مطالباتِ حق پر زور نہ دینا، اور سکوت اختیار کر لینا بھی، تقاضاءِ وقت اور قرینِ مصلحت قرار پاتا ہے۔ چنانچہ خود پرویز صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم میں انڈیا سے نمٹنے کی طاقت نہیں، تو سرِ دست مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی راہ اختیار کریں جس میں ہمیں کم از کم نقصان اٹھانا پڑے، اور اس کے بعد، اپنے اندر طاقت پیدا کرنے کے لیے، ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ہمیں اس وقت صلح حدیبیہ سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہئے۔ اس وقت حضورؐ نے اندازہ فرمالیا تھا کہ ہم میں ہنوز اتنی طاقت نہیں جس سے قریش مکہ کے ظلم و ستم کا سدباب کیا جا سکے۔ اس لیے حضور نے اپنے مطالبات پر، جو یکسر حق پر مبنی تھے، زور نہ دیا۔'' ❶

اگرچہ یہ استدلال، بہت حد تک محلِ نظر ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، وہ قرآن و سنت کی دوسری نصوص سے بھی ماخوذ ہے، اس لیے وہ قابلِ قبول ہے۔ یہ استدلال بھی، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ کبھی انسان ایسے حالات سے بھی دوچار ہو جاتا ہے جس میں ایک صحیح اور مبنی بر حق مطالبہ پر زور نہ دینا، اقتضاءِ مصلحت بن جاتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں، اگر منکرین حدیث، سلیم الفطرت ہوں، اور حدیث و سنت کے خلاف، انہیں خواہ مخواہ کا بغض و عناد یا ضد اور چڑ نہ ہو، تو کیا وہ امامتِ قریش کے سلسلہ میں ہدایت نبوی کی معقول توجیہہ نہیں کر سکتے؟

(۷) بہتر کے مقابلہ میں کم تر کو قربان کرنا:

شارع نے اسلام کے جو احکام بھی دیئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی فرداً فرداً اپنی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ جملہ احکام کی ایک ہی اہمیت اور قیمت نہیں ہے، بلکہ بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے۔ اگر کبھی دو احکام پر ایک ساتھ عمل ممکن نہ ہو، یا شریعت کے دو مقاصد کو بیک وقت حاصل کرنا ممکن نہ ہو، تو ان میں سے اس کو اختیار کیا جائے گا، جس کی قدر و قیمت، شریعت کی نگاہ

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۱

میں زیادہ ہے، اور کم تر قدر و اہمیت کی چیز، زیادہ بیش قیمت چیز پر اس حد تک قربان کی جائے گا، جس حد تک کہ موقع و محل میں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا انکار طلوع اسلام اور پرویز صاحب بھی نہیں کر پائے۔ چنانچہ ایک مقام پر پرویز صاحب لکھتے ہیں:

(۱)... عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ قدر کی خاطر، کم قدر کو قربان کر دے۔ ❶

(۲)... "جان صدقہ آبرو۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے، لیکن اگر ایسا وقت آ جائے کہ جان اور آبرو میں (Tie) پڑ جائے، جب ان دونوں میں سے صرف ایک کو بچایا جا سکے، تو پھر انسان کو چاہئے کہ جان دے دے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص، آبرو کو بچانے کے لیے جان دے دیتا ہے، ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے، اس کے برعکس، جو شخص، آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچالے، اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔ ❷

انسانی جان کی بھی ایک قیمت ہے، اور انسانی آبرو کا بھی ایک وزن ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بچانا ممکن ہو، تو کسے بچایا جائے؟ کسے قربان کیا جائے؟ اور کس کو کس کی خاطر چھوڑا جائے؟ جان کی خاطر آبرو کو؟ یا آبرو کی خاطر جان کو؟ ظاہر ہے کہ تحفظ آبرو کو تحفظ جان پر ترجیح حاصل ہے، اسی بنا پر، خود "مفکر قرآن" نے قیام پاکستان کے وقت، خون خرابہ اور قتل و غارت کا میدان گرم تھا، تو اس وقت کا منظر بیان کرتے ہوئے اپنی خواتین خانہ کو یوں نصیحت کی:

"اس وقت میرے گرد و پیش کچھ معصوم بچے، غباروں سے کھیل رہے تھے۔ میری نگاہیں کبھی ان آتشیں گولوں کی طرف اٹھتیں، اور کبھی ان ننھے معصوموں کے مستقبل کی طرف۔ میں ان احساسات کو، جن سے اس وقت میرا خون منجمد ہو رہا تھا، کیسے بھلا سکتا ہوں؟ اس سے بھی بڑھ کر، وہ منظر، کہ ادھر سے میرے کانوں میں سکھ "ستو ماکڑی" اور مرہٹہ "جلوانوں" کے پاؤں کی آہٹ آ رہی تھی، اور ادھر میری

❶ طلوع اسلام فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵ ❷ طلوع اسلام فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳

آنکھوں کے سامنے، وہ جوان بیٹیاں اور بہنیں پھر رہی تھیں، جن کے کھلے سر کو، آسمان کی آنکھ کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سوچیے کہ میں ان تاثرات کو کیسے فراموش کرسکتا ہوں؟.... نہیں! اس سے ایک قدم اور آگے بڑھیے، اور اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ دوپہر کے وقت، جب میں اپنی بچیوں کے ہاتھ میں بندوق دے کر کہہ رہا تھا کہ "بیٹیو! اگر خدانکردہ، ایسا وقت آجائے کہ دشمن ہمارے دروازے تک آپہنچے، اور ہم ختم ہوچکے ہوں، تو تم اس بندوق سے اپنا خاتمہ کرلینا۔" ❶

یہ اقتباس، اس امر کو واضح کردیتا ہے کہ تحفظِ عصمت وآبرو کی قدر، تحفظِ جان سے بھی بڑھ کر ہے، حتیٰ کہ خودکشی، جو بالصراحت اسلام میں فعلِ حرام ہے، پرویز صاحب کے نزدیک تحفظِ آبرو کی خاطر، اس (فعلِ حرام) کا ارتکاب بھی جائز ہے، اور اسی بات کی "مفکرِ قرآن" نے اپنی خواتینِ خانہ کو تلقین کی۔

الغرض، یہ جملہ پیراگراف، اور ان میں مذکور اقتباسات، یہ واضح کردیتے ہیں کہ شریعت کے ہر حکم کی ایک قدر وقیمت ہے، اور تمام احکام واقدار مساوی القیمت نہیں ہیں، بعض کو بعض پر قدر واہمیت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے، اور ٹھیک یہی بات ہے جسے مولانا مودودیؒ نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

"دین کے سارے اصول اور احکام، اپنی قدر وقیمت اور اپنے وزن میں یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان مراتب کا فرق ہے اور دین کا ہر قاعدہ بے لچک نہیں ہے بلکہ بہت سے قواعد میں لچک کی گنجائش ہے۔ اس باب میں اصولی ضابطہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی نیکی سے اگر بڑا گناہ لازم آتا ہو تو اس کا ترک اولیٰ ہے، اور ایک چھوٹی برائی، اگر بڑی نیکی یا عظیم تر مصلحتِ دینی کے لیے ضروری ہو تو اسے اختیار کرلینا بہتر ہے، اور دو برائیوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونا، بہرحال، ناگزیر ہو جائے تو نسبتاً کمتر درجے کی برائی کو قبول کرلینا چاہیے۔ اس کے ساتھ انہی مثالوں سے یہ بھی

❶ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۹

معلوم ہو سکتا ہے کہ نظام شریعت میں قدروں کے درمیان فرق مراتب کا معیار کیا ہے، کس طرح کی چیزوں پر، کس طرح کی چیزوں کو فوقیت دی گئی ہے، اور کون سی قدریں ایسی ہیں جن سے بالاتر قدر کوئی نہیں ہے کہ اس پر انہیں قربان کیا جا سکتا ہو۔"●

بہتر کے مقابلہ میں کم تر کو، اور زیادہ نفع کی خاطر کم نفع کو قربان کرنا بھی، ایک ایسا شرعی ضابطہ ہے جسے علماءِ امت، خواہ متقدمین ہوں یا متاخرین، اور جناب پرویز صاحب ہوں یا ان کا مجلّہ طلوعِ اسلام، سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس ضابطہ کی روشنی میں، اگر امامتِ قریش کے مسئلہ کو دیکھا جائے، تو نہ وہ شریعت سے متجاوز کوئی قدم قرار پاتا ہے، اور نہ کوئی مداہنت یا اصول شکنی۔ بلکہ بصیرتِ رسول، فراستِ نبی اور معاملہ فہمیٔ پیغمبر کی بہترین مثال بن کر، یہ واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہاں، اگر کسی کو ویسے ہی احادیث سے ضد، چڑ یا بغض و عناد ہو، تو اسے تو ہر معاملہ میں مخالفت ہی کرنی ہے، لیکن اگر کوئی سلیم الفطرت شخص، کسی خاص رنگ کی عینک لگائے بغیر، انصاف کے ساتھ، ان قواعد کی روشنی میں، خلافتِ قریش کے مسئلہ پر غور کرے گا تو وہ اس کو کوئی برائی نہیں، بلکہ عملِ خیر ہی پائے گا۔

● تفہیمات، جلد ۳، صفحہ ۸۲-۸۳

باب ۹

"مفکرِ قرآن" کے اکاذیب و اباطیل

گزشتہ باب میں، حکمتِ عملی کے زیرِ عنوان، امامتِ قریش کے، جس واقعہ کو، پرویز صاحب نے اصولِ ظنّی قرار دے کر، انکارِ حدیث کا راستہ ہموار کیا، اس پر "مفکرِ قرآن" ہی کے مسلّمہ قواعدِ شرعیہ کی روشنی میں بالتفصیل بحث ہو چکی ہے۔ اسی حکمتِ عملی سے وابستہ دوسرا مسئلہ، جسے انہوں نے، مولانا مودودیؒ کے خلاف، معاندانہ پراپیگنڈے کے لیے خوب استعمال کیا ہے، وہ جوازِ کذب کا مسئلہ ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، حکمتِ عملی کے باب میں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، راست گوئی کے متعلق، یہ لکھا:

"راست بازی اور صداقت شعاری، اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے، اور جھوٹ، اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے، لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں، جن کی خاطر، جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں، اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔" (ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء، صفحہ) ❶

اس عبارت میں، جو کچھ کہا گیا ہے، وہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اسے فی الحال نظر انداز کیجیے، اور یہ بات ملحوظِ خاطر رکھیے، کہ یہ موقف، تنہا سید مودودیؒ ہی کا نہیں ہے، بلکہ سلفاً خلفاً، تمام علماءِ امت بھی، اس کے ہمنوا ہیں۔ صحابہؓ کرام کی زندگیوں میں، اور خود روایاتِ احادیث میں، اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن نشانہ صرف مولانا مودودیؒ ہی کو بنایا جاتا ہے، اور یہ تاثر اچھالا جاتا ہے، کہ صرف سید مودودیؒ ہی کے نزدیک:

"اقامتِ دین جیسے اہم مقصد کے لیے، اصولوں میں لچک اور استثناء، تو ایک طرف، ان کے لیے جھوٹ بولنا بھی، نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔" ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۳ء، صفحہ ۴۹ ❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۳

جہاں تک روایاتِ احادیث میں، حضور اکرم ﷺ کی طرف سے صحابہؓ کو تاگزیر امورد واقعات میں، اذنِ کذب گوئی کا تعلق ہے، تو ان کا انکار یہ کہہ کر کر دیا جاتا ہے کہ ایسی باتیں، منافیٔ شانِ رسالت اور خلافِ مقامِ صحابیت ہیں، فلہٰذا، ناقابلِ قبول ہیں۔ باقی رہے سلف وخلف کے علماءِ امت، تو وہ، چونکہ سب کے سب "عجمی اسلام" کا شکار تھے، فلہٰذا، ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ایسی روایاتِ احادیث کو رد کرنے کے لیے، پرویز صاحب کہتے ہیں:

"احادیث کے مجموعوں میں، وہ روایات بھی ہیں، جن میں جھوٹ بولنے اور اصول شکنی کی سخت مذمت کی گئی ہے، اور ایسی روایات بھی، جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے معاذ اللہ صحابہؓ کو جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، اور عملی سیاست کے وقت، ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا، جنہیں آپ اپنی دعوت کے آغاز میں، بایں شد و مد پیش فرمایا کرتے تھے، ہماری نگہِ بصیرت نے ان دونوں قسم کی روایات کو دیکھا اور بلا ادنیٰ توقف کہہ دیا کہ جن روایات میں، دروغ گوئی اور اصول شکنی کی تعلیم ملتی ہے، وہ ہمارے رسول اکرمؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے، یہ روایات وضعی ہیں اور مسترد کر دینے کے قابل۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کے خلاف ہو، یا اس سے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ پر طعن پڑتا ہو، وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔" ❶

چنانچہ مولانا مودودیؒ کے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے، "مفکر قرآن" صاحب، مسائل کی حدود سے گزر کر، ذاتیات پر اتر آتے ہیں، اور کہتے ہیں:

"جو شخص، ان وضعی روایات کا سہارا لے کر، اپنے کذب اور فریب اور مکر و دجل کو تقدس کا نقاب اوڑھانا چاہتا ہے، وہ اسلام کا سب سے بڑا مخالف، اور ان مقدس اور پاکباز ہستیوں کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ اپنی مکیاولی سیاست کو مذہب کے پردے میں چھپانے کی ناپاک کوشش کرتا، اور دنیا کو بدترین قسم کا دھوکہ دیتا ہے، اس

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۸

کی ذہنیت بڑی پست اور فطرت بڑی گھناؤنی ہے، کیونکہ وہ اپنے عیوب کو حسن، اور اپنی برائیوں کو نیکیاں ثابت کرنے کے لیے، عالمِ اسلام کی بلند ترین ہستیوں کو، اپنی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ اور اس سے قطعاً نہیں شرماتا کہ دنیا ان ہستیوں کی سیرت وکردار کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔ ❶

اقامتِ دین کے ان مدعیان کے پیشِ نظر بھی، حصولِ اقتدار کے سوا کوئی مقصد نہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لیے، یہ بھی وہی حربے استعمال کرتے ہیں جنہیں لادین سیاست کے علم برداروں کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے، فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ لادینی سیاست کے بدنام مہرہ باز، ان حربوں کو کھلے بندوں استعمال کرتے ہیں، اور دینی سیاست کے یہ مقدس مدعی، انہیں اقامتِ دین کے نقاب میں چھپا کر، اور خدا اور رسول کی کمین گاہ کے پیچھے بیٹھ کر آگے بڑھاتے ہیں۔" ❷

"مفکرِ قرآن" صاحب نے، اس "عیب" اور "گناہ" کو بار بار، بڑے تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے، کہ جماعتِ اسلامی اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مقصد، حصولِ اقتدار تھا، حالانکہ تقویٔ دین کے لیے حصولِ اقتدار، نہ صرف یہ کہ کوئی معیوب چیز نہیں ہے بلکہ ایک ناگزیر ضرورت اور تقاضاءِ دین ہے، "مفکرِ قرآن" نے اگر آنکھیں کھول کر، قرآن پڑھا ہوتا، تو انہیں معلوم ہوتا کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے، خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر، خود یہ کہہ کر، اقتدار کا طالب ہے کہ:

﴿ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ ﴾ [یوسف:۵۵]

"ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔"

اگر وضو کے لیے پانی کا حصول، اور قتال و جہاد فی سبیل اللہ کے لیے، اسلحہ کی فراہمی، کوئی معیوب چیز نہیں ہے، تو پھر اقامتِ دین کے لیے حصولِ اقتدار کیونکر جرم یا عیب ہو سکتا ہے؟ جس کا بار بار طعنہ دیا جائے۔

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۲ ❷ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۷

بہرحال، جوازِ کذب کی بعض ناگزیر صورتوں کے متعلق، مولانا مودودیؒ کے موقف پر، پرویز صاحب فرماتے ہیں اور دو انتہات پر برستے ہوئے فرماتے ہیں:

"جو "دینی سیاست" مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے، اس میں اور میکیاولی کی لادینی سیاست میں، جس کا مظاہرہ عام اربابِ سیاست کی طرف سے ہوتا ہے، کچھ بھی فرق نہیں۔ یہی چیز کچھ کم تاسف انگیز نہیں کہ دین کے نام سے اس طرح کھیل کھیلا جائے، لیکن اس کا سب سے الم انگیز اور جگر سوز پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ، اپنی سیاست کی تائید میں دین کی مقدس سے مقدس، اور عظیم سے عظیم شخصیت کو بھی بطورِ شہادت پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔" ❶

"یہ ہے وہ میکیاولی سیاست، جو ہر مصلحت کے ساتھ، اپنا فیصلہ بدل لیتی ہے، لیکن ہمیں سب سے زیادہ تعجب اس جماعت کے متعلقین پر آتا ہے جو مودودی صاحب کی اس قسم کی باتوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کس قدر "خوش نصیب" (بدنصیب) ہے وہ لیڈر، جسے اس قسم کے متبعین مل جائیں، جن کا مسلک یہ ہو کہ: ؏

ہمیں تو خو ہے کہ جو کچھ کہو، بجا کہیے ❷

مودودی صاحب خالصتاً سیاسی لیڈر ہیں، اور اسی میکیاولی سیاست کے علم بردار، جو دورِ حاضر میں عام ہو رہی ہے، لیکن وہ اپنی سیاست کو مذہبی نقاب اوڑھا کر پیش کرتے ہیں۔" ❸

مولانا مودودیؒ نے جوازِ کذب کی وضاحت میں، روایاتِ حدیث کی روشنی میں، مندرجہ ذیل مثالیں بھی پیش کی تھیں:

"صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لیے، اگر صرف صداقت سے کام نہ چل سکتا ہو، تو ضرورت کی حد تک، جھوٹ سے کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔ جنگ کی ضروریات کے لیے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں،

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۴ ❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۸ء، صفحہ ۷

❸ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۳

بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے، اور دشمن، اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ، اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر، اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔ اسی طرح، اگر کوئی ظالم، کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو، اور وہ غریب کہیں چھپا ہو، تو سچ بول کر، اس کے چھپنے کی جگہ بتا دینا، گناہ اور جھوٹ بول کر جان بچالینا واجب ہے۔"❶

جناب پرویز صاحب، پہلی دو مثالوں کے متعلق (جن میں صلح بین الناس اور مصالحت بین الزوجین میں جوازِ کذب مذکور ہے) تردید فرماتے ہیں:

"اسے کہتے ہیں ملمع ساز منطق (Fallacious Logic)۔ ذرا سوچئے، کہ لوگوں میں جو صلح، اور میاں بیوی میں جو مصالحت، جھوٹ بول کر کرائی جائے گی، وہ قائم کتنے دنوں تک رہے گی، چند ہی روز بعد، جب وہ جھوٹ نکھر کر سامنے آ جائے گا، تو اس سے لوگوں میں جو فساد برپا ہوگا، اور میاں بیوی میں جو کشیدگی پیدا ہوگی، وہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید اور مہیب ہوگی۔"❷

ایسا احتمال، صرف وہاں پایا جاتا ہے، جہاں فریقین میں بے جا ضد، ہٹ دھرمی، انانیت، خود رائی اور اپنے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی روش موجود ہو، لیکن جہاں یہ رویہ موجود نہ ہو، وہاں اس بات کا امکان ہی نہیں، بلکہ عملاً ایسی مثالیں بھی پائی گئی ہیں جہاں مصلحین کے جھوٹ نے فریقین میں وفاق واتحاد اور صلح واتفاق پیدا کر دیا، یہاں تک کہ جھوٹ کے بے نقاب ہو جانے کے بعد بھی، نہ صرف یہ کہ ان میں کشیدگی پیدا نہ ہوئی، بلکہ مصلحین کے کذب کو بنظرِ تحسین بھی دیکھا گیا۔

اس کے بعد پرویز صاحب رقم طراز ہیں:

"اب مودودی صاحب کی پیش کردہ باقی دو مثالوں کو لیجیے۔ ایک سچا مسلمان سپاہی،

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۶/ تفہیمات، جلد ۳، صفحہ ۲۷/ ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۵۲

❷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۶

جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے، تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیے جائیں، وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا، نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی مردِ مومن سے مظلوم کی بابت معلوم کرنا چاہے گا، تو وہ اپنی جان دے دے گا، لیکن نہ جھوٹ بولے گا، نہ مظلوم کا پتہ نشان بتائے گا۔"●

جنگ سے وابستہ مثال پر مبنی یہی سوال، ۱۹۶۱ء میں، سنت کی آئینی حیثیت پر قلمی بحث کے دوران، جب یکے از منکرینِ حدیث، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے سامنے رکھا گیا، تو وہ اس سوال کا سامنا نہ کر پائے، لیکن اب سات سال بعد، ۱۹۶۸ء میں، یہ جواب دیا گیا ہے کہ "ان دونوں صورتوں میں مومن اپنی جان دے دے گا، لیکن وہ جھوٹ بول کر، نہ ہی جنگی راز افشا کرے گا، اور نہ ہی کسی مظلوم کا پتہ نشان بتائے گا۔"

حکمتِ عملی کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے، سید مودودیؒ نے، اسوۂ رسول ﷺ سے ایک وہ مثال بھی پیش کی تھی جس میں امارت و خلافت کو قریش ہی کے لیے مخصوص کرتے ہوئے، آپؐ نے اصولِ مساوات کو جزوی طور پر معطل کر دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ اسے ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب نے "اصول شکنی" قرار دیتے ہوئے، مولانا مودودیؒ کے متعلق، بایں الفاظ کرم فرمائی کی ہے:

"بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ یہ صاحب جھوٹ بولنے اور اصول شکنی کو جائز اور واجب قرار دیتے ہیں، بات اس سے آگے بڑھتی ہے اور بہت دور تک بڑھتی ہے، آپ کسی جھوٹے اور اصول شکن سے (اس کا جھوٹ اور اصول شکنی ثابت ہو جانے کے بعد) کہیے کہ تم نے جھوٹ بولا اور اصول شکنی کی ہے، تو وہ ندامت سے اپنی گردن جھکا لے گا، لیکن ایک صاحب یہ ہیں کہ جب کہا جائے گا، کہ آپ جھوٹ بولتے اور اصول شکنی کرتے ہیں، تو یہ (بجائے اس کے کہ شرم سے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں) پوری ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ میں یہ کچھ اپنے طور پر نہیں کرتا، یہ تو اسلام کی

● طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴۳

تعلیم اور رسول اللہ کا عمل ہے، جس کا میں تجاہل کرتا ہوں، یہ کہتے ہیں اور دل میں قطعاً یہ خوف نہیں کھاتے، کہ یہ میں کس ذاتِ گرامی کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ ❶"

مولانا مودودیؒ کے موقف کی تردید میں، "مفکر قرآن" صاحب نے جو اب ولہجہ اختیار کیا ہے، اسے تو فی الحال نظر انداز کیجیے لیکن اس اقتباس سے، بہر حال، یہ بات ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے نزدیک جھوٹ، ایک ایسی گھٹیا اور گھناؤنی حرکت ہے، اور اس کے برعکس راست بازی اور صداقت شعاری، ایک ایسا بلند پایہ اخلاقی جوہر ہے، کہ کوئی شخص بھی، خواہ، وہ کتنے ہی اونچے مرتبہ کا ہو، کسی حال میں بھی ہو، نہ تو جھوٹ بول سکتا ہے، اور نہ ہی راست گوئی کو ترک کر سکتا ہے۔ گویا راست بازی اور صداقت شعاری کا التزام اور ترک کذب و زور، ایمان باللہ سے بھی قیمتی چیز ہے جس کا جھوٹ بول کر، انکار کرنے کی اجازت، ناگزیر حالت میں، خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے، بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو، اور یہ اخلاقی معیار بلاشبہ، اتنا اونچا معیار ہے کہ شاید پرویز صاحب کی اپنی ذات کے علاوہ، کوئی شخص بھی، جو غلبۂ حق کے لیے کشمکش خیر و شر میں مصروفِ جدوجہد ہو، اس معیار کو نہیں پہنچ سکتا، خواہ وہ رسول خدا ہی کیوں نہ ہو۔ اور جب روایاتِ حدیث یہ بتاتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے بعض مخصوص حالات میں بعض افراد کو جھوٹ بولنے کی اجازت دی اور بقول پرویز، کہیں "اصول شکنی" کی ہدایت فرمائی، تو انہیں اپنے اس بلند پایہ اخلاقی معیار کی آڑ میں نفسِ واقعہ کا انکار ہی قرینِ مصلحت نظر آیا۔ اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان واقعات کو مولانا مودودیؒ سمیت جملہ علماءِ کرام سلفاً خلفاً ہر دور میں بیان کرتے چلے آئے ہیں اور اس سے استدلال و استنباط بھی کرتے چلے آئے ہیں، لیکن پرویز صاحب، نشانہ صرف مولانا مودودیؒ ہی کو بناتے رہے ہیں کہ گویا یہی وہ واحد شخص ہے جس نے بعض مخصوص حالات میں دروغ گوئی کو سندِ جواز عطا کی ہے اور کسی ایسے اصول کو ترک کرنا جائز قرار دیا ہے، جس سے تمسک عظیم تر دینی مفاسد کا باعث بنتا ہے۔

خود "مفکر قرآن" صاحب، بطور تحدیث نعمت، فرماتے ہیں:

---

❶ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۹

"اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کرا لیا جائے کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان، قرآن کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لیے دینی سند نہیں مل سکتی۔" ❶

ظاہر ہے کہ "مفکر قرآن" جناب پرویز صاحب سے بڑھ کر، قرآن کو سند ماننے والا کون ہو سکتا ہے، اور ان سے بڑھ کر قرنِ اول کی تاریخ کو، جو خلافِ قرآن ہو، غلط قرار دینے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن پھر حیرت بالائے حیرت اور تعجب بر تعجب ہے، اس امر پر کہ، خود ان کو، اپنی فریب سازیوں، کذب بافیوں، بہتان تراشیوں، خیانت کاریوں اور مغالطہ آرائیوں کے لیے (جن کا تفصیلی ذکر ابوابِ گزشتہ میں کیا جا چکا ہے) دینی سند کہاں سے مل گئی؟ کیونکہ کذب و زور اور دجل و فریب کی شاید ہی کوئی صورت ایسی ہو، جسے انہوں نے اختیار نہ کیا ہو۔ لیکن وہ اپنی ایسی حرکات پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، الٹا پراپیگنڈہ یہ کیا کرتے تھے، کہ ان کے مخالفین، چونکہ ان کے "قرآنی دلائل" کا جواب نہیں دے سکتے، اس لیے وہ تیخ پا ہو کر، ان کے خلاف فتویٰ بازی کرتے ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ منکرِ سنت قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

(۱)..... ہمارا ملّا، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لیے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے، اور ملّا بیچارہ، قرآنی دعوت سے محروم ہوتا ہے)، اس لیے ملّا نے اس کے خلاف، گو رنگ کا حربہ استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے، اس نے یہ مشہور کر دیا، کہ طلوعِ اسلام، منکرِ حدیث ہے۔ ❷

(۲)..... ملّا کے پاس، نہ علم ہوتا ہے، نہ بصیرت۔ نہ دلائل ہوتے ہیں نہ براہین۔ لیکن اس کے پاس ایک خطرناک حربہ ہوتا ہے، جس کا جواب، فریقِ مقابل کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ حربہ ہوتا ہے، کفر کا فتویٰ یا لیبل۔ وہ دلیل کی بجائے، ایک لیبل تراشتا ہے، اور فریقِ مقابل پر چسپاں کر دیتا ہے، اور اس سے عوام کو مشتعل کر دیتا ہے، یہی حربہ اس نے طلوعِ اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ ❸

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۱

❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

❸ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۲ء، صفحہ ۲۷

(۳)...... یہ حضرات طلوعِ اسلام کے پیش کردہ قرآنی دلائل کا جواب تو دے نہیں سکتے، اس لیے انہوں نے اس کے خلاف وہی حربہ استعمال کیا، جسے یہ اپنے مخالفین کے لیے شروع سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، اور اس طرح عوام کے جذبات کو اس کے خلاف مشتعل کر دیا۔ ❶

(۴)...... ان کے پاس طلوعِ اسلام کے دلائل کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے انہوں نے اس سلسلہ میں وہی تکنیک اختیار کی جو ملائیت کا بنیادی خاصہ ہے، یعنی انہوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ❷

(۵) جو کچھ میں قرآن مجید سے پیش کرتا ہوں، اس کی تردید کے لیے، چونکہ ہمارے قدامت پسند طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں، اس لیے وہ خود بھی مشتعل ہوتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔ ❸

"منکرِ قرآن" کی خودنمائی بلکہ خود تشہیری کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ "علما، اس کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔" حالانکہ پراپیگنڈہ کو علما کی طرف منسوب کر کے، وہ خود اپنی تشہیر اور پبلسٹی کیا کرتے تھے، عین ممکن ہے کہ کسی عالم دین نے سرِ راہ، کسی منکرِ حدیث کو، واقعتاً منکرِ حدیث کہہ ڈالا ہو، اور اسے پرویز صاحب نے مبالغہ آرائی کے ساتھ پراپیگنڈہ قرار دیا ہو، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ کسی کے خلاف وہ تشہیری یلغار، جسے حقیقتاً پراپیگنڈہ کہا جاتا ہے، وہ خود طلوعِ اسلام اور "مفکرِ قرآن" ہی کا مقصدِ زندگی اور وظیفۂ حیات رہا ہے۔ تاہم علماءِ کرام نے اگر پرویز صاحب یا ان کے مقلدین کو منکرینِ حدیث کہا بھی ہو، تو یہ نہ کوئی لیبل سازی ہے اور نہ ہی پراپیگنڈہ، نہ گالی ہے، نہ الزام تراشی، یہ محض امرِ واقعہ کا اظہار ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک حدیثِ نبی اور سنتِ رسول ﷺ دینی حجت نہیں بلکہ محض تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے، اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے

---

❶ طلوعِ اسلام، ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء، ص: ۳

❷ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۸

❸ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۰

ہیں، لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ ❶

جو لوگ خود حجیتِ حدیث کے منکر ہیں، انہیں منکرینِ حدیث کہنا کوئی بے جا بات نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں منکرِ حدیث صرف اس لیے نہیں کہنا چاہیے کہ اس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے؟ اور تقاضائے اخلاق، یہ ہے کہ ایسی بات نہ کہی جائے۔

اس سے ایک اہم اخلاقی سوال پیدا ہوتا ہے، ہم ایک شخص کو اپنے ذاتی تجربہ اور دلائل و شواہد کی بنا پر جھوٹا اور بددیانت پاتے ہیں، ہمارا علی وجہ البصیرت یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہے، ہم اسے دل میں ایسا سمجھتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب ہم ایسے شخص کا ذکر کریں، تو اسے جھوٹا اور بددیانت کہیں یا سچا اور دیانت دار؟ ہمارے نزدیک یہ انتہائی بددیانتی اور منافقت ہے کہ جسے ہم جھوٹا اور خائن جانتے ہیں، اسے محض اس لیے سچا اور ایماندار کہیں کہ اسے جھوٹا کہنے سے اس کے مداحین برا مانیں گے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آج جھوٹ اور بددیانتی، جو اس قدر فروغ پا رہی ہے تو صرف اس لیے کہ لوگ جھوٹے کو جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کرتے، بلکہ ایسا کہنے کو خلافِ تہذیب قرار دیتے ہیں، اکبر الٰہ آبادی نے اسی نکتہ کی وضاحت کے لیے کہا تھا کہ:

مغوی کو برا مت کہو، ترغیب ہے یہ   میں کس سے کہوں، نفس کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن   ایک شور اٹھا، خلافِ تہذیب ہے یہ

یاد رکھیے! یہ کھلی ہوئی مداہنت ہے، اور جس تہذیب یا "ضابطۂ اخلاق" میں اسے مستحسن قرار دیا جاتا ہے، وہ ابلیسی تہذیب اور شیطان کا وضع کردہ "ضابطۂ اخلاق" ہے۔ تہذیبِ حاضر میں اسے اس لیے مستحسن قرار دیا جاتا ہے کہ "مفکرِ قرآن" جیسے لوگوں نے اپنی افتراء پردازیوں، بہتان تراشیوں، تہمت طرازیوں، بددیانتیوں اور کذب بافیوں کے ذریعہ جھوٹ کو عام کر دیا ہے، اور کوئی جھوٹا یہ نہیں چاہتا کہ اسے جھوٹا کہا جائے۔ علماءِ کرام، اگر کسی جھوٹے کو کاذب، بددیانت کو خائن یا منکرِ حدیث کو منکرِ حدیث کہتے ہیں تو اسے صحیح تہذیب اور تقاضائے اخلاق سمجھتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے تو اسے اپنے نفس کی اصلاح کرنی چاہیے، علماءِ کرام، بہرحال،

---

❶ مقامِ حدیث، صفحہ ۹۵

کسی کاذب، خائن اور بدعقیدہ شخص کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر، منافقت اور مداہنت اختیار نہیں کر سکتے، اور نہ ہی انہیں ایسا کرنا چاہیے۔

آمدم برسرِ مطلب:

بہرحال، بحث یہ ہو رہی تھی کہ حکمتِ عملی کا ہی نہیں بلکہ حکمتِ دین کا بھی کبھی یہ تقاضا سامنے آ جاتا ہے کہ ناگزیر حالت میں جہاں جھوٹ کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، شرعاً جھوٹ کی اجازت ہے، جبکہ "مفکرِ قرآن" صاحب کے نزدیک، نبی بھی اور کسی شخص کے لیے بھی دروغ گوئی اور ترکِ صدق جائز نہیں ہے۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ صدقِ مقال کا اصول، ایسا اصول نہیں ہے جسے ہر قسم کے حالات میں اپنائے رکھنا، اور کسی حال میں بھی، اسے ترک نہ کرنا، دائمی تقاضائے ایمان قرار پاتا ہو۔ ایک نظری آدمی، جو اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر، اچھے سے اچھا فلسفہ اور بہتر سے بہتر نظریہ پیش کرنے کا عادی ہو، مگر رزم گاہِ حق و باطل کے احوالِ واقعی سے ناواقفِ محض ہو، وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ گرفتار ہونے والا فوجی اپنی جان دے دے گا، لیکن جھوٹ نہیں بولے گا، کیونکہ جن تخیلات کی دنیا میں وہ رہتا ہے، وہاں حالات و واقعات موجود نہیں ہوتے، صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں، مگر کام کرنے والا خلا میں نہیں، بلکہ واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے، وہاں اس پر، نہ صرف کام کرنے کی، بلکہ کام کو کروانے ..... نہیں، بلکہ اسے چلائے رکھنے ..... کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے، اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک نظری آدمی، مکیف فضاؤں میں، اور ٹھنڈی چھاؤں میں یا ہرے بھرے پھولوں سے مہکتے ہوئے لان میں وعظ فرماتے ہوئے، بڑی آسانی سے جوڑ توڑ اور مشورہ دیتا ہے، یا جو تنقید بھی کرتا ہے، وہ اپنے ہی خیالات و تصورات کی دنیا میں گھوم پھر کر کرتا ہے، ایسی رائے، مشورہ یا تجویز بصورتِ تنقید کوئی شخص، حالات و واقعات سے آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کر سکتا، جو رزم گاہِ حق و باطل کی سخت اور جاں گسل کشمکش کے تپتے ہوئے صحرا میں، پوری حاضر دماغی اور بیدار مغزی کے ساتھ، جو کھی لڑائی لڑ کر ایک ایک قدم جماتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہو۔

''منکرِ قرآن'' کے اکاذیب واباطیل:

لیکن اسے نیرنگیٔ زمانہ کہیے یا کچھ اور، گردشِ دوراں بعض اوقات، کسی نظری آدمی کو بھی، ایسے موڑ پر لے آتی ہے، جہاں وہ، راست بازی کا دامن چھوڑ کر، جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور وہ بھی ایسے حالات میں، جو اپنی شدت اور سنگینی کے اعتبار سے، اُن حالات سے بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں، جن میں ''منکرِ قرآن'' صاحب نے دشمن کے ہاتھوں، گرفتار ہونے والے مسلمان فوجی کو، اذنِ دروغ گوئی کی بجائے، قتل ہو جانے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: ''منکرِ قرآن'' صاحب کے چند اکاذیب واباطیل۔

(۱) مجلّہ طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کا باہمی تعلق:

قبل اس کے کہ مجلّہ طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کے باہمی تعلق میں، ان کے کذبِ صریح کو واضح کیا جائے، آپ، ان اکاذیب کو اپنے قلوب واذہان میں مستحضر کر لیجیے جو گزشتہ ابواب میں تضادات کی صورت میں، قلب وزبان کی عدمِ موافقت کی شکل میں، مخالفین کے اقتباسات کو ان کے زمانی یا مکانی پس منظر سے اکھاڑ کر، اپنے خود ساختہ موقع ومحل میں پیش کرنے کی صورت میں، یا افترا پردازیوں اور بہتان تراشیوں کی شکل میں، یا دوہرے معیارات کے روپ میں وہ اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اس صریح کذب بیانی کو ملاحظہ فرمائیے جس کا صدور، ان سے مجلّہ طلوعِ اسلام سے ان کی وابستگی کے حوالے سے ہوا ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل، متحدہ ہندوستان میں، برطانوی حکومت کا دور ہے، اور ہمارے ''منکرِ قرآن'' صاحب سول سیکریٹریٹ میں بطور کلرک ملازم ہیں۔ سیکریٹریٹ میں، ان کے بالائی افسر ہندو ہیں، جبکہ پورے ہندوستان پر انگریزوں کا طاغوتی نظام مسلط ہے۔ وہ باطل نظام کی پوری انتظامی مشینری کا کل پرزہ بنے ہوئے ہیں اور باطل کی خدمت میں بڑے محنتی، دیانت دار اور مستعد کارکن بن کر ''رزقِ حلال'' کمانے کی ''عبادت'' کر رہے ہیں۔ اسی دوران تحریکِ آزادی کی ابتداء ہوتی ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ یہ تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے۔ خود ''منکر

قرآن" جنہیں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ، قلمی صلاحیت کے ساتھ نوازا ہے، اکا دکا مضامین نویسی کے ایک عرصہ بعد، میدانِ صحافت میں قدم رکھتے ہیں، اور طلوعِ اسلام کے نام سے اپنا ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ اس رسالے سے آپ کا حقیقی تعلق کیا ہے؟ کیا آپ، اس کے صرف مقالہ نگار ہیں، کہ مضمون و مقالہ لکھ ڈالنے کے بعد اس کے ساتھ کوئی اور تعلق نہ ہو؟ اور یہ رسالہ آپ کے مضامین اس طرح شائع کر ڈالتا ہے جیسے سید سلیمان ندوی کا معارف اور عبدالماجد دریابادی کا صدق، اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ترجمان القرآن، ان کے مضامین شائع کرتا رہا ہے؟ یا خود طلوعِ اسلام جس طرح، مولانا مودودیؒ کے مقالات، اسد ملتانی کا کلام اور نعیم صدیقی کے اشعار کو شائع کرتا رہا ہے، بغیر اس کے کہ ان مقالہ نویسوں اور شعرائے کرام کا کوئی عمل دخل، مجلہ کے انتظامی یا مالی یا بندوبستی امور میں ہو؟...... یا...... "مفکرِ قرآن" صاحب ہی اس کے کلی نگران اور بانی ہیں؟ اس سوال کا جواب، طلوعِ اسلام ہی سے وابستہ، ایک صاحب، بایں الفاظ فراہم کرتے ہیں:

"میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد، نصب العین، اور اس کے حصول کے طریقہ کار، مختصر طور پر، خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کروں۔" ❶

اس کے بعد، چونکہ پرویز صاحب ہی کے اقتباسات دیئے گئے ہیں، اس لیے یہ واضح ہے کہ مجلہ اور تحریکِ طلوعِ اسلام، دونوں کے بانی، خود پرویز صاحب ہی ہیں۔ نیز، ایک اور مقام پر، وہ خود فرماتے ہیں کہ سید نذیر نیازی کے طلوعِ اسلام کے بند ہو جانے کے بعد:

"یہ دوبارہ میری زیرِ نگرانی، دہلی سے شائع ہوا، اس کا پہلا پرچہ تھا تو مئی ۱۹۳۸ء کا۔ لیکن وہ شائع، حضرت علامہ کی وفات سے کچھ دن پہلے (اپریل میں) ہو گیا تھا۔" ❷

اس طرح مجلہ طلوعِ اسلام، اور خود پرویز صاحب، بانی و نگران ہونے کی حیثیت سے لازم و ملزوم رہے ہیں۔ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان سے پرویز صاحب کی دلچسپی اور وابستگی، اس اعتبار سے ان کے لیے باعثِ پریشانی تھی کہ وہ، ایک تنخواہ دار سرکاری ملازم تھے، اور نظامِ باطل

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۸ ❷ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۲

کی مشینری میں اسی کا کل پرزہ بن کر رہ گئے تھے اور برطانوی حکومت کا نمک کھا رہے تھے، اور یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ سرکاری ملازم، حکومت کے خلاف کسی تحریک کا کھلے بندوں عملاً ساتھ دینا تو درکنار، وہ قولاً بھی اظہارِ حق میں بزدل اور ڈرپوک ہوا کرتا ہے، نوکری سرکار سے معطل کیا جانا، اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور سرکاری عہدے سے چمٹے رہنا، اس کا سب سے بڑا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ اس لیے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، ان دنوں، طلوعِ اسلام کے نگران و بانی ہونے کے باوجود بھی، اپنی اس حیثیت کو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رکھا کرتے تھے، اور کبھی اس پر تیار نہ ہوئے کہ خود کو اس مجلہ کے بانی و نگران کے طور پر ظاہر کریں، وہ خود فرماتے ہیں:

''میں مرکزی حکومتِ ہند کی ملازمت سے منسلک تھا، اس لیے، ضابطہ کی رو سے، کسی حیثیت سے، اس مجلہ پر میرا نام نہ آ سکتا تھا۔'' ❶

چنانچہ، اس مجلہ میں، ان کے صرف وہ مضامین، ان کے اصل نام کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے، جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ حکومتِ ہند، ان میں کوئی کھٹک یا خلش نہیں پائے گی۔ مقالہ نگاری میں، اس حزم و احتیاط کے باوجود، وہ طلوعِ اسلام میں ایسی عبارات بھی شائع کروا دیا کرتے تھے، جن سے ایک عام قاری کو یہ تاثر ملتا تھا کہ پرویز صاحب کا مجلہ طلوعِ اسلام سے تعلق اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے مضامین و مقالات لکھ دیا کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

(۱)..... جناب پرویز صاحب کو طلوعِ اسلام سے جو قلبی تعلق ہے، وہ ظاہر ہے لیکن بایں ہمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان پر اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں، وہ اس کے لیے مضمون لکھتے ہیں تو ان کی عنایت ہے، لیکن ان پر تقاضا تو کسی قسم کا نہیں کیا جا سکتا۔ ❷

(۲)..... اس میں شک نہیں کہ جناب پرویز، طلوعِ اسلام کے مضمون نگارِ خصوصی ہونے کی حیثیت سے ہماری نگاہوں میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں، اور طلوعِ اسلام کا شعبہ ''مذہبیات'' ان ہی کی توجہات کا رہینِ منت ہے، لیکن ادارت سے ان کا کوئی

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۰ ❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۴۱ء، صفحہ ۷

تعلق نہیں ہے۔ ❶

یہ بات کسی نے بھی نہیں پوچھی تھی کہ پرویز صاحب کا مجلّہ کے ساتھ مدیر ہونے یا نگران و بانی ہونے کا تعلق ہے یا نہیں؟ لیکن چور کی ڈاڑھی میں تنکا کے مصداق، خود ہی اس قسم کی وضاحتیں، اس وقت شائع کی جا رہی تھیں، تا کہ سات سمندر پار سے مسلط ہونے والی حکومت کی نمک خواری برقرار رہے۔ ایک اور مقام پر، وہ، آپ اپنا شکریہ ادا کرتے ہوئے طلوعِ اسلام کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں:

(۳)... ہم اپنے محترم و کرم فرما جناب پرویز صاحب کے دلی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یومِ اقبال کے سلسلہ میں اپنی تقریر اور پیغام بغرض اشاعت ہمیں مرحمت فرما دیا۔ جو کسی آئندہ پرچہ میں شائع ہوں گے، جناب پرویز صاحب نے شروع ہی سے جس کشادہ ظرفی سے طلوعِ اسلام کو اپنے رشحاتِ قلم کی گہر باریوں کا دامن خصوصی قرار دے رکھا ہے، ہمیں اس کی سپاس گزاری کے لیے الفاظ نہیں ملتے، اور ہم اپنی اس تہی مائیگی کو ہمیشہ اس اطمینان سے چھپا لیتے ہیں کہ ان کی نگاہیں بھی ہمارے الفاظ پر نہیں، بلکہ اس دل پر ہوتی ہیں جو ان الفاظ کا سرچشمہ ہے۔ ❷

یہ تینوں اقتباسات، صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے اشاعت پذیر ہوئے کہ حکومتِ وقت کو، اور عام لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ پرویز صاحب کا طلوعِ اسلام سے تعلق، اس کے بانی و نگراں ہونے کا نہیں بلکہ محض ایک مقالہ نگار ہونے کا ہے، اور یہ کہ جو لوگ، اس مجلّہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ پرویز صاحب کے علاوہ کچھ اور حضرات ہیں، جو ان کے اس لیے شکر گزار ہیں کہ ان کے رشحاتِ قلم سے، اوراقِ طلوعِ اسلام مزین ہوتے ہیں۔

یہ صورتِ حال، جس میں اصل حقیقت کو مستور و مخفی رکھا گیا ہے، جملہ علمائے اسلام، خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، اور خود مولانا مودودیؒ کے نزدیک، حکمتِ عملی کی روشنی میں، نہ صرف یہ کہ کوئی معیوب حرکت نہیں، بلکہ وقت کا ایک صحیح مگر ناگزیر تقاضا تھا، لیکن خود پرویز کے نظریات کی

---

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۵ ❷ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۰

روشنی میں، اگر اس عینک کے ساتھ دیکھا جائے، جس کے ساتھ، انہوں نے مولانا مودودیؒ کی حکمتِ عملی کے مباحث کو دیکھا ہے، تو یقیناً یہ جھوٹ بھی ہے اور کتمانِ حقیقت اور اخفائے صداقت بھی ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اس شخص کا عمل ہے، جو کسی شخص کے لیے بھی، کسی حال میں بھی، کذب اور دروغ گوئی سے کام لینے کے خلاف ہے۔

(۲) کذبِ پرویز کی واضح مثال:

لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم "مفکر قرآن" صاحب کا ایک ایسا صریح جھوٹ، واضح کذب اور بین دروغ پیش کیے دیتے ہیں، جو اس حقیقت کو مبرہن کر ڈالتا ہے کہ ایک سرکاری ملازم، کس قدر بزدل، ڈرپوک، خام ہمت اور محرومِ جرأت ہوا کرتا ہے، اور محض اپنی نوکری کے خوف سے، (نہ کہ اپنی جان کے خوف سے) نہ صرف یہ کہ اخفائے صداقت سے کام لیتا ہے، بلکہ واضح دروغ گوئی، صریح کذب بافی، اور کھلے کھلے جھوٹ کو بھی اختیار کرتا ہے۔

اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ پرویز صاحب، حکومتِ ہند کے سرکاری ملازم ہونے کے باعث، صرف ان مضامین و مقالات کو طلوع اسلام میں اپنے اصل نام کے ساتھ شائع کروایا کرتے تھے، جن کے متعلق ان کو یقین ہوتا تھا، کہ برطانوی حکومت کو ان سے کوئی پرخاش نہیں ہوگی اور ان کی نوکری محفوظ رہے گی۔ لیکن جن مضامین کے بارے میں، انہیں خدشہ ہوتا کہ جبینِ سرکار پر شکن پڑ جائیں گے، اور نگاہیں خشمگیں ہوں گی، اور یہ بات، ان کی ملازمت کے حوالے سے، وجہِ پریشانی اور دردِ سر بن جائے گی، انہیں وہ اپنے اصل نام کے ساتھ شائع نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تدبیر یہ اختیار کی کہ اپنے لیے ایک جعلی نام وضع کیا اور اس جعلی نام "رازی" کے تحت، ان کے مقالات چھپتے رہے، مدتوں اس حقیقت پر پردہ پڑا رہا کہ "رازی" نام کی شخصیت کس کی ہے؟ اور وہ کون ہے جو اس اسمِ زور کے ساتھ اپنی نگارشات کو پیش کر رہا ہے، یہاں تک کہ انگریزی اقتدار کا دور ختم ہو جاتا ہے اور پاکستان نام کی ایک نئی مملکت، دنیا کے نقشہ پر نمودار ہو جاتی ہے اور پاکستان میں غیروں کی بجائے اپنوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اور پھر کئی سالوں کے بعد، بے ساختہ طلوع اسلام کی زبان سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

"مقالہ نگار "رازی صاحب" وہی تھے جنہیں پرویز صاحب کہا جاتا ہے۔" ❶

علاوہ ازیں "مفکر قرآن" جس طرح رازی کے نام سے اس دور میں لکھا کرتے تھے، اسی طرح وہ "مسلمان" کے نام سے بھی اپنے مضامین و مقالات کو طلوع اسلام میں شائع کیا کرتے تھے، اور کسی کو یہ علم نہ تھا کہ "مسلمان" کے نام سے، کون شخص لکھ رہا ہے، سالہا سال بعد، حتیٰ کہ وفاتِ پرویز کے بھی بعد، اچانک اور ارتجالاً، اس جھوٹے اور جعلی "مسلمان" کا راز طلوع اسلام ہی کے ذریعے بایں الفاظ فاش ہوتا ہے:

"بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ تقسیمِ ہند سے قبل ماہنامہ طلوع اسلام میں جو مضامین "رازی" اور ایک "مسلمان" کے نام سے شائع ہوتے تھے، وہ محترم پرویز صاحب ہی کے تحریر کردہ ہوتے تھے۔" ❷

یہ وہی پرویز صاحب ہیں:

اس انکشاف کے بعد یہ بھی جان لیجئے کہ یہ وہی "مفکر قرآن" چوہدری غلام احمد پرویز صاحب ہیں جو کسی حال میں بھی اور کسی شخص کے لیے بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں سمجھتے، اور حق و صداقت کے علم بردار بن کر یہ فتویٰ دیتے رہے ہیں:

"ایک سچا مسلمان سپاہی جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا، تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیئے جائیں، وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔" ❸

اے کاش! "مفکر قرآن" صاحب "طلوع اسلام" میں ان دونوں اپنے مضامین و مقالات کو جھوٹے ناموں سے شائع کرنے کی بجائے، ایک "سچا مسلمان" سپاہی بن کر ہمت اور جرأت، شجاعت و بسالت اور بہادری و دلیری کا مظاہرہ فرماتے۔ "خواہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیئے جاتے۔" لیکن انہوں نے واضح دروغ، نمایاں جھوٹ، صریح کذب اور اس حکومت کے

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۴ ❷ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳۵

❸ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴

خلاف، جس کا وہ نمک کھا رہے تھے، کھلے فریب اور دھوکہ دہی سے کام لیا حالانکہ اس وقت، انہیں اپنی جان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ پھر کیا مان لوں، وہ محض نام کے ایک "مسلمان" تھے؟ تب کیا وہ کام کے "سچے مسلمان" نہ تھے؟

مزید برآں، یہاں "مفکر قرآن" کا دوہرا معیار بھی نمایاں ہو رہا ہے۔ جب تک معاملہ پرائی جان کا تھا، فتویٰ یہ تھا کہ...... "ایک سچا مسلمان سپاہی، جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا، تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیئے جائیں وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا اور نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔"...... لیکن جب معاملہ اپنی ملازمت کا سامنے آیا (جو یقیناً جان کے معاملے میں بہت ہی ہلکا معاملہ ہے) تو جھوٹ بولنا جائز قرار پا گیا۔

یہ وہی "مفکر قرآن" ہیں:

جی ہاں! یہ وہی "مفکر قرآن" ہیں جو کشمکش حق و باطل میں رزمیہ حالات کے تپتے ہوئے صحراؤں میں آبلہ پائی کرنے کی بجائے، اپنی آراستہ و پیراستہ ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم کی فضاؤں میں یا اپنی کوٹھی کے ہرے بھرے اور پھولوں سے لدے ہوئے لان کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر یہ وعظ فرمایا کرتے تھے:

> "دنیا نے اُنہی جواں ہمت، صداقت شعار انسانوں کے مجسمے نصب کیے ہیں، جنہوں نے ہر قسم کی اذیت برداشت کی، لیکن نہ راز افشا کیا، نہ جھوٹ بولا۔ ہم اپنی تاریخ سے ان لوگوں کو بطور فخر، دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتے، جنہوں نے جھوٹ بول کر مملکتوں کو بچایا تھا۔ ہم انہی کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں جنہوں نے جان دے دی تھی، لیکن نہ مملکت کے ساتھ غداری کی تھی، اور نہ ہی جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی تھی۔" ●

کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہمارے "مفکر قرآن" بھی "دنیا کے جوان ہمت اور صداقت شعار انسانوں" کی روش اختیار کرتے، جنہوں نے ہر قسم کی اذیت برداشت کی، لیکن جھوٹ نہ بولا۔

● طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء صفحہ ۳

تا کہ وابستگانِ طلوعِ اسلام (نہ کہ عامۃ المسلمین) "کی آنے والی نسلیں، انہیں بطورِ فخر دنیا کے سامنے پیش کرتیں، اور "جنہیں کہ دیکھا، ہمارے "مفکرِ قرآن" نے اپنی ملازمت کی قربانی دے ڈالی لیکن نہ اپنے مشن کے ساتھ غداری کی اور نہ ہی جھوٹ بول کر اپنی "ملازمت" بچائی۔"

کس قدر خوش قسمت ہے وہ "مفکرِ قرآن" جسے نہ کبھی حق کی خاطر، اپنی جان کا خوف لاحق ہوا، نہ انہیں صداقت کی پاسداری میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے، نہ کبھی انہیں حق گوئی اور راست بازی کی دائمی پابندی برداشت کرنا پڑی، نہ ہی انہیں کذب و زور اور افتراء پردازی کی گھٹیا اور گھناؤنی روش سے اجتناب برتنا پڑا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود انہیں اندھے مقلدین کا ایک ایسا ٹولہ میسر آ گیا، جو ان کے بارے میں، اس قسم کا پراپیگنڈہ کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا کہ "مفکرِ قرآن" صاحب، تھے:

"معاملات کے کھرے، بات کے سچے، وعدے کے پکے۔" ❶

"ہم نے اپنے پچیس تیس سالہ تعلقات میں انہیں ہمیشہ معاملات کا کھرا، بات کا سچا اور وعدہ کا پکا پایا ہے۔" ❷

جی ہاں! یہ وہی بابا جی ہیں:

جی ہاں! یہ وہی بابا جی ہیں جن کی پچاس سالہ "قرآنی خدمات" کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، اور جو اللہ میاں کو اس کی شاعری کی داد دیتے ہوئے لوگوں کو اپنے وعظ کی اگلی خوراک، قرآنی کیپسول میں یہ کہہ کر دیتے ہیں:

"اس سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ یہ حضرات تاریخ کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلافِ قرآن اور غلط ہونا، بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سند قرآن رہے، اور اس اصول کو تسلیم کرا لیا جائے کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے، وہ غلط ہے تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لیے دینی

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۹ ❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۵

سند نہیں مل سکتی۔"①

"منکرِ قرآن" کے بے شمار اوصاف و خصائل میں سے ایک بہت ہی نمایاں خصلت ان کی تناقض گوئی اور تضاد گوئی بھی تھی۔ چنانچہ وہ یہاں تو یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کو سند ماننے والے شخص کو، قرآن مجید سے اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لیے دینی سند نہیں مل سکتی۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر وہ یہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں سے تو ہر کسی کو اپنی مطلب براری کے لیے سند مل جاتی ہے:

"جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اسے اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔"②

لیکن خیر!

لیکن خیر! فی الحال اس تضاد کو نظر انداز کیجئے اور "منکرِ قرآن" صاحب کے اس ارشاد ہی پر غور فرمائیے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "... اگر سند، قرآن رہے، اور اس اصول کو تسلیم کیا جائے کہ قرونِ اولیٰ کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لیے دینی سند نہیں مل سکتی۔" ... لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے "منکرِ قرآن" صاحب تو قرآن، اور فقط قرآن ہی کو سند ماننے کے دعوے دار ہیں، اور اس اصول کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری تاریخ کا جو واقعہ، خلافِ قرآن ہے وہ غلط ہے، تو پھر انہیں اپنے جھوٹے نام کے ساتھ "فریب کاریوں، کذب تراشیوں کی دینی سند" کہاں سے مل گئی؟ اب یا تو یوں کہیے:

(الف)... "منکرِ قرآن" صاحب فی الواقع دل سے قرآن کو سند مانتے ہی نہیں تھے یونہی منافقانہ طور پر، محض زبانی طور پر قرآن کا نام لینے پر مجبور تھے تاکہ اپنی خداداد قلمی صلاحیتوں کے بل بوتے پر، قرآن کا نام لیتے ہوئے، تصنیف و تالیف کی پیشہ وارانہ ضرورتوں کے تحت اپنی روزی کما سکیں۔ آخر پیٹ تو ان کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا اور

---

① طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۳ ② [illegible] ستمبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۰

روٹی تو کسی طور کما کھائے ہے مچھندر

...... یا پھر یوں کہیے کہ:......

(ب):...... وہ فی الواقعہ قرآن کریم کے مخلص پیروکار ہی تھے، ورنہ بھی مخلص، کھرے، سچے اور نیک نیت، متبعِ قرآن کے نزدیک بھی "عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔" اور "مفکر قرآن" صاحب نے متحدہ ہندوستان میں جوازِ کذب کے اسی فتویٰ پر عمل کیا تھا...... یا پھر یوں کہیے کہ:......

(ج):...... "مفکر قرآن" صاحب تو ہرگز تضاد گو نہیں ہیں۔ قرآن مجید ہی (معاذ اللہ) تضاد گو ہے، وہ کبھی تو یہ کہتا ہے کہ "راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے، اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے"۔ اور کبھی یہ کہتا ہے کہ "عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔" اور "مفکر قرآن" نے جب قولاً راست بازی اور صداقت شعاری کا دامن تھامنے کی تلقین و تبلیغ فرمائی تھی، تب بھی وہ قرآن ہی کی پیروی فرما رہے تھے، اور جب وہ عملاً جھوٹے، جعلی اور بے اصل ناموں کے ساتھ اپنی نگارشات کو طلوع اسلام میں شائع کر کے "فریب کاریوں اور کذب تراشیوں" کی راہ پر چل رہے تھے تب بھی وہ قرآن ہی کی فراہم کردہ دینی سند پر قائم تھے۔

کیا وابستگانِ طلوع اسلام میں سے کوئی صاحب یہ واضح فرمائیں گے کہ "مفکر قرآن" کی فریب کاریاں اور کذب تراشیاں، ان تینوں میں سے کس شق پر مبنی ہیں؟

اور جی ہاں! یہ وہی "مفکر قرآن" ہیں:

اور جی ہاں! یہ وہی "مفکر قرآن" ہیں جن کے ہاں صداقت شعاری اور راست بازی کو اتنی بلند پایہ اہمیت حاصل ہے کہ خدائے قدوس کے ہاں بھی اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے کیونکہ وہ خود قرآن کریم میں حسبِ ناگزیر حالات میں جھوٹ بول کر، کلمۂ کفر کہہ دینے کی اجازت دیتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' کو خدا کے دین کا، خود خدا سے بھی بڑھ کر احساس ہے اور راست بازی اور صداقت شعاری کی جتنی پرواہ ''مفکر قرآن'' کو ہے، اتنی پرواہ ''منزل قرآن'' کو بھی نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بعض ناگزیر حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو یہ واقعہ غلط قرار دیا گیا اور جن روایات میں اذنِ کذب مذکور ہے، وہ سب وضعی اور جھوٹی روایات قرار پا گئیں۔ خود خدائے قدوس نے جس آیت میں اسکی اجازت دی، وہ ''مفکر قرآن'' کی تاویل بلکہ تحریف کی بھینٹ چڑھ گئی، اب خود ''مفکر قرآن'' صاحب بھی راست بازی اور صداقت شعاری کے اتنے بلند مقام پر برقرار نہیں رہ سکے اور انہیں جھوٹ کا سہارا لینا ہی پڑا۔ اس مقام پر اگر واقعی وہ سلیم الفطرت ہوتے، ان کا ذہنی سانچہ درست ہوتا اور وہ عنادِ حدیث اور مخالفت سنت میں مبتلا نہ ہوتے، اور خود غرضی اور نفسانیت سے بالاتر ہوتے اور مودودی صاحب کی عداوت و مخالفت کی دھن ان پر سوار نہ ہوتی اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور و فکر فرماتے ہوئے، اسوۂ رسول ﷺ کو خیالات و تصورات کی دنیا میں جانچنے کی بجائے، کشمکش حق و باطل کی واقعاتی دنیا میں پرکھتے، تو خود ان کا دل و دماغ اس بات کی گواہی دیتا کہ جس قسم کے حالات میں ''مفکر قرآن'' کو راست بازی اور صداقت شعاری کے اصول کو ترک کر کے جھوٹ جیسی گھناؤنی اور بدترین برائی کا دامن تھامنا پڑا ہے، عین ممکن ہے (بلکہ ہمارے نزدیک تو عین یقینی بات ہے) کہ ویسے ہی حالات میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کسی کو جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہوگی (بلکہ بالیقین دی تھی)۔ اور جب آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دور میں یہ محسوس فرمایا تھا کہ مساوات کے عمومی اصول کو عرب کے اس وقت کے سیاسی حالات میں باصرار برقرار رکھنے کی صورت میں کہیں زیادہ مضرت پائی جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ قریش کو فقدا ر سونپا جائے اور اصول مساوات کو خلافت کی حد تک معطل کر کے، امامت و امارت کو قریش کے ساتھ مخصوص کر دینے ہی میں زیادہ خیر اور بھلائی پائی جاتی ہے، تو یقیناً حضور ﷺ نے حکمت عملی کی روشنی میں، اس کی ہدایت فرمائی ہوگی (اور واقعتاً ایسا ہی ہوا تھا)۔ لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب پر کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ حق و باطل کی جانگسل کشمکش سے کنارہ کش ہونے کی بنا پر، رزم گاہ خیر و شر

کی واقعاتی حالت کا ادراک نہیں رکھتے تھے، اور وہ صرف 25-B گلبرگ لاہور کے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں یا ہرے بھرے لان کے پھولوں کی مہک میں ہی درس و وعظ فرمانے کے عادی تھے، اور کچھ اس بنا پر بھی کہ حسد و کینہ اور بغض و عناد میں مبتلا ہو کر، مخالفت و عداوتِ مودودیؒ کا منہ زور جذبہ ان کے حواس و مشاعر پر مضبوط گرفت قائم کر چکا تھا، اور کچھ اس باعث بھی، کہ وہ سنتِ نبی ﷺ اور حدیثِ رسول ﷺ کی ہر حال میں مخالفت ہی کو اپنا مشن بنا چکے تھے۔ وہ (ناگزیر مجبوریوں میں راست بازی کی جگہ کذب گوئی کے) اس معقول (Rational) اصول پر خود عمل پیرا ہونے کے باوجود بھی، اس کی مخالفت پر اتر آئے۔ حالانکہ گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی، ان کی اپنی عبارتوں سے بھی، یہ بات واضح ہے کہ عملی زندگی میں خیر و شر کی شدید کشمکش کے دوران، انسانوں کو بہت سے ایسے مواقع سے بھی سابقہ پیش آتا ہے، جن میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے، ایک بڑی بھلائی کا نقصان لازم آتا ہے۔ یا ایک چھوٹی بُرائی کو ترک کرنے سے ایک بڑی بُرائی لازم آتی ہے، ایسے مواقع پر عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایک کم قیمتی چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے اور شریعتِ الٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بڑی بُرائی سے بچنے کے لیے چھوٹی بُرائی کو گوارا کیا جائے، اور چھوٹی بھلائی کی خاطر، بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔

باب ۱۰

''داعیٔ انقلاب'' کا ذاتی کردار

﴿ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ﴾

یہ پورا باب مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''آئینہ پرویزیت'' (حصہ ششم) سے ماخوذ ہے ۔ (محمد دین قاسمی)

کسی داعیٔ انقلاب کی دعوت کی کامیابی کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ جس بات کی طرف وہ دعوت دیتا ہے، اس پر وہ خود بھی، دل سے یقین رکھتا ہو۔ جو بات دل سے اٹھتی ہے انسان اس پر عمل پیرا ہو کر اس کا ثبوت دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک داعی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، سب سے پہلے وہ خود اس پر عمل کر کے لوگوں کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کرے۔ انبیاء کرام کا یہی طریق کار رہا ہے، اور انبیاء کے علاوہ، دوسرے داعیان کے لیے بھی یہ بات اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی انبیاء کے لیے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انبیاء کی زندگی، دعوت سے پہلے بھی بے لوث اور پاکیزہ ہوتی ہے، اور یہ اللہ کی خاص عنایت ہوتی ہے جبکہ دوسرے داعیان کی، دعوت سے پہلے کی زندگی، قابل مواخذہ نہیں سمجھی جاتی۔ پھر اگر داعی کی دعوت میں خلوص اور ایثار ہو، تو لوگ اس کی دعوت پر لبیک کہتے اور اس دعوت میں اس کے شریکِ کار بن جاتے ہیں۔ یہی لوگ، جو سب سے پہلے داعی کی دعوت کو قبول کرتے ہیں، سب سے زیادہ مصائب اور سختیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس دوران جب وہ دعوتِ انقلاب کے ساتھ ساتھ، داعی کا بلند کردار اور مشفقانہ سلوک دیکھتے ہیں، تو اس داعی پر ان کا ایمان و یقین پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ اس تحریک کا نہایت قیمتی اور ابتدائی سرمایہ ہوتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ایسے ہی ساتھیوں کو قرآن کریم نے ﴿ السّٰبِقون السابقون ﴾ اور ﴿ السابقون الاولون ﴾ کے معزز القاب سے پکارا

ہے، اور ان کا درجہ جماعت میں سب سے بلند ہوتا ہے۔

لیکن اگر اس کے برعکس، داعی خلوص سے عاری یا مفاد پرست ہو یعنی اس کے قول و فعل میں تضاد واقع ہو، تو اس کی دعوت کی حقیقت، محض ایک پراپیگنڈہ کی سی رہ جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی ساتھی، جوں جوں صحیح صورت حال سے واقفیت حاصل کرتے جاتے ہیں، چھٹتے جاتے ہیں، ان کی جگہ کچھ اور ناآشنا لوگ، اس جماعت میں شامل ہو کر، ان کی جگہ لے لیتے ہیں، اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے تا آنکہ اس دعوت کے کامیابی سے ہم کنار ہونے کے امکانات کم ہی رہ جاتے ہیں۔

اب ہم ان اصولوں پر، ادارہ طلوع اسلام کے قائد اور اس کی دعوت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہتے، بلکہ بزم طلوع اسلام ہی کے ایک معزز رکن، جناب محمد علی خان بلوچ، بی اے (آنرز)...... جو شاید تحریک کا قریبی مطالعہ کرنے کے بعد، کچھ دل برداشتہ نظر آتے ہیں...... کی زبانی، ان کے تالیف کردہ پمفلٹ، "حدیثِ دلگداز" سے کچھ اقتباسات پیش کریں گے۔

(۱) السابقون الاولون پر کیا بیتی؟:

......"لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر انتہائی الم ناک اور تاسف انگیز ہے کہ باوجودیکہ قرآن کی یہ تحریک، وقت کی اپنی پکار ہے، اور اس کا اپنا زور دروں بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہونا چاہئے، اور باوجودیکہ مخلص اور ایثار پیشہ، اور تجربہ کار کارکنوں اور فنڈز اور سرمایہ کی اعانت بھی اسے پوری طرح حاصل رہی ہے، مگر تحریک آگے بڑھنے کی بجائے ناکامیوں کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو کارکن جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے، اس کی ہمدردیاں تحریک سے ختم ہوتی چلی جاتی ہیں، ان کی جگہ کچھ نئے لوگ آجاتے ہیں، لیکن جب وہ پرانے ہونے لگتے ہیں، تو وہ بھی تحریک کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال جتنی الم ناک اور تاسف انگیز ہے، اس سے کہیں زیادہ مخلص کارکنوں کے لیے، لائق غور و فکر بھی ہے۔"......

طلوعِ اسلام کی بڑی بڑی شخصیتیں:

..... ''میرے سامنے اس وقت وہ طویل فہرست ہے جس میں ان بڑی بڑی شخصیتوں کے نام گنائے گئے ہیں، جو ایک زمانہ میں تحریک کے روحِ رواں رہ چکے ہیں۔ اس میں اس شخصیت کا اسمِ گرامی بھی ہے جو طلوعِ اسلام کی ملک گیر بزموں کا بانی اور آرگنائزر تھا۔ اس میں وہ بزرگوار بھی شامل ہیں جنہیں محترم پرویز صاحب کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا، اور جنہوں نے ان کے علمی کارنامے میں عرصہ دراز تک، ان کا پورا پورا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان میں وہ مخلص اور بے لوث جاں نثار بھی شامل ہیں جنہیں طلوعِ اسلام کی برادری کا بزرگِ خاندان سمجھا اور کہا جاتا تھا، اور جن کی تعریفیں کرتے کرتے، پرویز صاحب کا منہ نہ سوکھتا تھا، ان میں وہ پرخلوص جاں نثار بھی شامل جنہیں ہفتوں، محترم پرویز صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل رہا کرتا تھا۔ ان میں وہ بزرگوار بھی شامل ہیں، جو ایک دو روز نہیں، بلکہ کئی سال تک، ایک ہزار روپیہ سالانہ پرویز صاحب کو پابندی کے ساتھ نذر کرتے رہے ہیں، کیونکہ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ طلوعِ اسلام کو سالانہ چھ ہزار روپیہ کا خسارہ رہتا ہے۔ ان میں بانیانِ طلوعِ اسلام کنونشن اور ممبرانِ بزمِ اقبال بھی شامل ہیں۔ ان میں ممبرانِ مجلسِ عاملہ، ممبرانِ پبلسٹی کمیٹی، صدر کالج کمیٹی، اور قرآنی سفیر برائے ممالکِ یورپ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ اگر یہ تمام بڑی بڑی شخصیتیں تحریک سے کنارہ کش ہو جاتی ہیں یا انہیں بانیٔ تحریک سے کچھ شکایات پیدا ہو جاتی ہیں تو ہر شخص ٹھٹک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان جیسے واقفانِ راز، تحریک سے کیوں بددل ہو کر حریمِ ناز سے رخصت ہوتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو اتنے آدمیوں کا ایک دم سر پھر گیا تھا، اور نہ ہی حکومتِ پاکستان کے محکمہ صحت کی طرف سے اس عرصہ میں کوئی ایسی رپورٹ آئی ہے کہ پاکستان میں ان دنوں مرضِ نفاق و غداری کی کوئی رَو، وبائی صورت اختیار کر گئی تھی..... بہر حال اسی سلسلہ دراز کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ آج کل محترم پرویز صاحب کے عتاب کا رخ میزان کے ممبران اور کراچی کے احباب کی طرف ہے۔ وہ برابر ہدفِ طعن و ملامت بنے ہوئے ہیں، چونکہ ان میں اکثریت کراچی والوں کی تھی، اس لیے کراچی کی بزم بھی دم توڑ گئی۔ طلوعِ اسلام کے قریبی حلقوں سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ۳۰،

اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ایک مجلس مشاورت بلائی گئی جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور نام لے لے کر کراچی والوں کو منافق اور منافق اعظم بتایا گیا۔ پھر ۱۲ اکتوبر کو بزم لاہور کے اراکین کو محترم پرویز صاحب نے چائے پر مدعو کیا اور اس میں میزان اور کراچی والوں کے خلاف زہر سے بجھی ہوئی تقریر فرما کر حاضرین کے جذبات کو مشتعل کیا گیا۔ اس تقریب نامسعود کو یوم الفرقان کے نام سے یاد کیا گیا کیونکہ اس دن ان کے خیال کے مطابق مومنین صادقین اور منافقین کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔ اس مجلس کی تقریر بقول ایک حاضر جلسہ کے اس قدر اشتعال انگیز تھی کہ کراچی والوں میں سے کوئی وہاں موجود ہوتا تو حاضرین اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔" (ایضاً، صفحہ ۵، ۶، ۷)

(۴) "مفکر قرآن" کا ایثار اور دیانت:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ:.....

"..... ۱۹۶۰ء کے اواخر میں محترم پرویز صاحب اور چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کراچی تشریف لائے۔ اور پرویز صاحب نے احباب کراچی کے سامنے، یہ تجویز پیش فرمائی کہ طلوع اسلام کے لٹریچر کی اشاعت کے لیے، ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی تشکیل ہونی چاہیے جو موصوف کی کتابوں کو شائع اور فروخت کرے، اور اس طرح اشاعت و فروخت کی دردسری سے موصوف کو نجات حاصل ہو جائے اور وہ ہمہ تن اپنے تصنیفی کاموں پر توجہ دے سکیں۔ حسب سابق کراچی کے احباب نے اس اپیل پر لبیک کہا اور چون ہزار (۵۴۰۰۰) روپیہ فراہم کر دیا۔ جن احباب نے یہ خطیر رقم فراہم کی تھی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان لوگوں کا مقصد، اس ذریعے سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان کی کمپنی کو جو کچھ منافع حاصل ہو، وہ قرآنی لٹریچر کی اشاعت پر خرچ کیا جا سکے، لیکن جب کچھ ہی عرصہ بعد، کراچی کے احباب کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ تمام سرمایہ خرد برد ہو چکا ہے، اور کمپنی الٹا مقروض ہو چکی ہے تو فطری طور پر ان تمام لوگوں کے احساسات کو دھچکا لگا، جنہوں نے سرمایہ فراہم کیا تھا، ایسا کیوں اور کس طرح ہوا؟ یہ داستان بڑی طویل اور دردناک ہے، جس کی مختصر سی تفصیل میزان لمیٹڈ کے سرکلر نمبر ۲، مورخہ ۲۰ ۱۹۶۴ء میں حافظ برکت اللہ صاحب آنریری مینجنگ ڈائریکٹر نے پیش کر دی تھی۔ جس کی

کوئی تردید، محترم پرویز صاحب یا ادارہ کی طرف سے نہیں کی گئی، اور نہ ہی کوئی معقول جواب دیا گیا"......

......" احباب کراچی جنہیں پرویز صاحب سے انتہائی عقیدت تھی، یہی سمجھتے رہے کہ یہ سب کچھ ارادتاً نہیں، بلکہ ناواقفیت یا بے توجہی کی بنا پر ہوا ہے اور اگر پرویز صاحب کو پوری حقیقت سمجھا دی گئی تو اس کی تلافی فرما دیں گے۔ چنانچہ طویل عرصہ اندر اندر مذاکرات ہوتے رہے، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد، میزان لمیٹڈ کے ممبران نے عبدالرب صاحب سے رجوع کیا، جن کا پرویز صاحب پر کافی اثر تھا، اور وہ خود بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ سب کچھ پرویز صاحب سے غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر ہوا ہے، اور وہ اس معاملہ میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے پرویز صاحب کو بڑی منت وسماجت سے یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی کہ......

(۱) میزان، آپ کا اپنے خونِ جگر سے پیدا کردہ بچہ ہے، اسے پروان چڑھائیں، اور اسے خسارے سے بچانے اور کاروباری انداز سے چلانے کے لیے، جو طریقہ کار بھی تجویز ہو، اسے جبراً وقہراً ہی سہی، اختیار کریں، توقع ہے آج کا نقصان، کل کے فائدے میں بدل جائے گا۔

(۲) معاملہ کو ذاتی مفاد ❶ اور قانونی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بجائے قرآنی تحریک، مخلص رفیقوں کے احساسات اور عزائم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں۔

(۳) رائلٹی پر اصرار، سابقہ اعلانات کے خلاف ہے، جن میں کہا گیا تھا کہ آپ کتابوں کی آمدنی سے ایک پیسہ تک نہیں لیتے اور رائلٹی بھی ایک پائی نہیں لیتے۔ رائلٹی کو میزان کی حیات وممات کا مسئلہ نہ بنائیں۔

(۴) چھوٹے چھوٹے باہمی اختلافات، مفید اداروں کو تباہ کر دیتے ہیں، قدرے دور اندیشی اور وسعتِ نظر سے کام لیا جائے، تو وہ دور ہو سکتے ہیں۔

---

❶ واضح رہے کہ پرویز صاحب نے اپنے نظامِ ربوبیت کی بنیاد ہی ذاتی مفاد کی بجائے ایثار یا لینے کی بجائے دینے پر رکھی ہے۔ نظریات دو ہیں اور عمل یہ۔

(۵) مہنگائی میں آپ کے اخراجات کا دباؤ بڑھ گیا ہے، لیکن قرآنی تعلیمات کی اشاعت کا مطالبہ بھی کم وزنی نہیں، دونوں میں موافقت پیدا کریں۔

(۶) کراچی والوں کو، پہلے صرف تحریک کو آگے بڑھانے کا سودا تھا، اب وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ میزان کو مالی نقصان سے بچایا جائے۔

(۷) کراچی والے آپ کی سہولیات کو بہرحال مقدم سمجھتے ہیں۔ میزان کو خسارے سے بچانے کی بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ آپ کے اخراجات کو ضرور پورا کیا جائے۔ خواہ چیئرمین الاؤنس کی شکل میں ہو یا مقررہ رائلٹی کی صورت میں۔

(۸) میزان کو ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رہنا چاہیے۔ اس کے ٹوٹنے سے آپ کی قیادت پر بہت مضر اثر پڑے گا۔ قرآنی تحریک بدنام اور اس کے حامی ذلیل ہوں گے، اور مخالفین بغلیں بجائیں گے۔ آپ کی کتابیں نیلام ہوں گی، اور خریداروں کی کمی کے باعث ممکن ہے ٹل کر بکیں۔ .....ادارہ اور تحریک کی ہوا اکھڑ جائے گی اور جگ ہنسائی ہوگی۔ کراچی والوں کی بے پناہ عقیدت کو دھچکا لگے گا اور ان کی باتیں زبان پر آنے لگیں گی مثلاً:.....

(الف) پریس اور مکتبہ میں لگے ہوئے روپیہ کی بازیابی کے لیے، پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی سکیم سوچی گئی اور اس کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ حصص کا وصول شدہ روپیہ جلد از جلد اپنایا جا سکے ۵۴، ۵۵ ہزار وصول شدہ رقم کا دو تہائی، پرویز صاحب نے لیا۔

(ب) رائلٹی نرالے ڈھنگ سے مقرر کی اور سولہ سترہ ہزار روپیہ پرویز صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر وصول کر لیے۔ (میزان جائے جہنم میں، میری رائلٹی مجھے دو۔)

(ج) میزان کے حصص فروخت کرنے کی کوشش، پرویز صاحب نے بالکل نہیں کی۔

(د) میزان سے میاں صاحب کو نکالنا، پرویز صاحب نے ضروری سمجھا، تاکہ میزان کے مفاد کو کچل ڈالنے میں وہ رکاوٹ نہ بن سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۸، ۹، ۱۰)

اس بزرگ خاندان کی یہ تمام مساعی اور چند نصائح بے کار گئیں۔ اور ان سب باتوں کے جواب میں، پرویز صاحب نے انہیں تحریر فرمایا کہ..... "میزان اور وہ ایک نہیں، دو ہیں۔

دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ ہے، اس لیے میزان کو ختم کر دینا چاہیے تاکہ انہیں سہولت اور مالی فائدہ ہو۔“......(ایضاً صفحہ ۱۴)

میزان والوں کی طرف سے بار بار یہ الزام دہرایا جا رہا تھا کہ جس قدر غیر کاروباری، غلط، قابلِ اعتراض اور ناروا فیصلے کیے گئے، مثلاً:

(۱) پرویز صاحب اپنے ساٹھ ہزار روپے کے حصص کی قیمت، نقد صورت میں ادا کرنے کی بجائے، کتابوں کی صورت میں ادا کریں۔

(۲) پرویز صاحب کا نصب کردہ پریس اصل لاگت پر ۲۲۳۳۱٫۱۲ روپے میں میزان کے لیے خرید لیا جائے۔

(۳) پرویز صاحب کے قائم کردہ مکتبہ کا فرنیچر ۳۵۲۲٫۸۸ روپے میں خریدا گیا۔

(۴) پرویز صاحب کے قائم کردہ مکتبہ کی کتب ۹۵۳۹٫۳۹ روپے میں خریدی گئیں۔

(۵) کتابِ ضحٰی الاسلام کے ترجمہ اور کتابت کی اجرت پر جو رقم، پرویز صاحب ادا کر چکے ہیں، یعنی ۲۳۰۷ روپے، وہ انہیں ادا کیے جائیں۔

ان تمام معاملات میں، چونکہ خود پرویز صاحب ایک پارٹی تھے، اور چوہدری عبدالرحمٰن صاحب، خود ان کے ساختہ پرداختہ تھے، جن کا ایک پیسہ بھی کمپنی میں نہیں لگا تھا، لہٰذا یہ تمام نقصان دہ اور ضرر رساں فیصلے، شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً انہیں از خود نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ اور اگر غلط طریقہ پر یہ فیصلے، ان دونوں حضرات نے ملی بھگت سے کر بھی لیے تھے تو جس وقت، ان بزرگوں نے ان فیصلوں پر اعتراض کیا تھا، جن کی رقوم، کمپنی میں لگی ہوئی تھیں، تو ان فیصلوں کو کالعدم کر دینا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ محترم پرویز صاحب کی طرف سے اصل اعتراضات کا تو کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ الٹا میزان والوں کو منافقت، غداری، مفاد پرستی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا طعن دیا جاتا ہے، اور انہیں طرح طرح سے بدنام کیا جا رہا ہے۔ ان کا سوشل بائیکاٹ کرنے کی ہدایات جاری کی جا رہی ہیں۔ کیا قرآن کریم کے تیس سالہ تدبر و تفکر نے انہیں یہی کچھ سکھایا ہے، اور کیا یہی قرآن کی تعلیم ہے؟“......(ایضاً صفحہ ۱۴، ۱۵)

(۳) فرقہ پرستی اور پارٹی بازی:

پرویز صاحب اپنے لٹریچر میں اکثر اس اعلان کا اعادہ فرماتے رہتے ہیں کہ پارٹی بازی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے، اور یہ کہ طلوع اسلام، کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک "بزم" ہے، جیسے بزم اقبال وغیرہ۔ اب محرم راز درون کی زبانی یہ حقیقت بھی ملاحظہ فرمایئے

....."پرویز صاحب نے اس پیراگراف میں اپنے قرآنی معاشرہ کے اندر کم از کم دو پارٹیوں یا دو فرقوں کا وجود خود ہی تسلیم کرلیا ہے۔ ایک پارٹی تو ان ناقدین کی ہے، جو پرویز صاحب پر مالی اور تنظیمی معاملات میں تنقید کررہی ہے، اور جسے وہ منافق قرار دے کر اپنے معاشرہ سے خارج کررہے ہیں، اور دوسری پارٹی متبعین و مخلصین کی ہے جو ان سے اندھی عقیدت رکھتی ہے، جس کے اجتماع سے وہ اپنے یہ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، تو خود اس قرآنی معاشرہ کو کیا کہا جائے گا جس میں یہ دونوں پارٹیاں یا فرقے پنپ رہے ہیں حالانکہ آپ پوری قوت سے سال ہا سال سے چیختے چلے آرہے ہیں کہ ہم کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں ہیں۔ اور ہمارے نزدیک فرقہ بندی یا پارٹی بازی شرک کے مترادف ہے۔"

علاوہ ازیں، پرویز صاحب، اس خطبہ میں بار بار ان منافقین کو اپنے گروہ یا جماعت سے نکال دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں، چنانچہ کبھی فرماتے ہیں کہ..... "صحیح تدبیر یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے، اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کرلی جائے کہ وہ کس ذہنیت کا انسان ہے، یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اس شخص کو، جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کردے ممبر بنالیں اور بعد میں اسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔" (ایضاً صفحہ ۸) ۔ اور کبھی فرماتے ہیں کہ..... "زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں، اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت کے تجربہ کے بعد، آپ کے تعلقات باقی نہیں رہتے، انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں، آپ، اپنے آپ کو کبھی مورد الزام نہیں ٹھہراتے، لیکن اگر کوئی تحریک

انہی حالات میں، کسی کو اپنے حلقے سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اس شخص کو نہیں بلکہ تحریک کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔" (ایضاً)۔

اخراج کہاں سے؟!:

کیا محترم پرویز صاحب بتائیں گے کہ وہ ان تمام افراد کو کہاں سے، کس چیز سے خارج کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ انہیں اپنی کوٹھی سے نکالنا چاہتے ہیں؟ یا لاہور بدر کرنا چاہتے ہیں؟ یا پاکستان بدر کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ اگر یہ سب کچھ نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وہ انہیں اپنی جماعت ہی سے خارج کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ انہیں واقعی پرویزی جماعت ہی سے خارج کرنا چاہتے ہیں تو خدا کے واسطے یہ تو بتائیں کہ پھر فرقہ اور پارٹی اور کسے کہتے ہیں؟ اگر آپ کی جماعت کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں ہے کیونکہ فرقہ پرستی اور پارٹی بازی، قرآن کی نص صریح سے شرک ہے تو آپ کو ان لوگوں کے نکالنے پر کیوں اصرار ہے؟ جس طرح آپ کا جی چاہے، قرآن کی دعوت آپ دیجئے، اور جس طرح ان لوگوں کا جی چاہے قرآن کی دعوت یہ لوگ دیتے جائیں۔ قرآن کریم کی دعوت دینا، کوئی آپ ہی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ (حدیث دلگداز ہے، صفحہ ۳۶، ۳۷)

(۴) دعوت علی وجہ البصیرت اور آرزو، اندھی عقیدت کی:

اسی طرح، پرویز صاحب، اپنے اکثر لٹریچر میں سورہ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۸ درج فرما کر اسلامی تعلیمات کو علی وجہ البصیرت جانچنے پرکھنے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔ بلوچ صاحب، اسی کی چند آیات بمع ترجمہ درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:.....

....." لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اس انداز کے دانا، بینا اور شنوا لوگوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میری قرآنی تحریک کو تو ایسے کارکن درکار ہیں جو ؎

چشم بند، لب بند و گوش بند

کا مصداق ہوں۔ جو بالکل الٹ کر نہ دیکھیں کہ جو فنڈ ہم نے دیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ جو خدمات ہم نے سرانجام دی تھیں، ان کا کیا نتیجہ نکلا۔ غرض وہ نہ آنکھوں سے

دیکھیں اور نہ عقل و شعور کو کام میں لائیں۔ البتہ کبھی کبھی اپنے دل کے دریچوں میں سے جھانک جھانک کر یہ دیکھ لیا کریں کہ ان میں کتنی تبدیلی آئی ہے، یا پھر استاد دیکھ لیا کریں کہ تحریک کتنی پھیلی ہے اور بس۔ دل کے ان دریچوں کی بات ہی کیا ہے، ایک خرقہ پوش صوفی کی ہدایت پر جب آپ اس خیال سے ان میں جھانکتے رہیں گے کہ ان میں کتنا نورِ ولایت پیدا ہو گیا ہے، تو کچھ دن کی مشق کے بعد، ان دریچوں میں نورِ ولایت بھی نظر آنے لگتا ہے، وہ (پرویز صاحب) فرماتے ہیں کہ:......

"قرآنی تحریک کی پوری عمارت للّٰہیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، للّٰہیت کے یہ معنٰی ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو، یعنی اس دعوت اور تحریک کا فروغ اور کامیابی اور اس کے ذریعہ اپنی اصلاح نفس...... اگر اسکے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں پیدا ہو گیا، تو للّٰہیت نہ رہی، سودابازی آ گئی۔"......

(ایضاً صفحہ ۷۹)

اور:...... "اخلاص کا معیار ایک ہی ہے، یعنی للّٰہیت جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو، اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد، میرے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہو گئی، اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کس حد تک مدد ملے گی۔"......(ایضاً صفحہ ۸۳)

اور:......"آپ کی تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے، اس لیے آپ کے ہاں، عزت اور فضیلت کو ماپنے کا معیار، "تبدیلی" ہونا چاہیے...... میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع رکھا ہے کہ "مومن کسے کہتے ہیں؟" آپ اسے بغور پڑھیں، اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہیے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔"......(ایضاً صفحہ ۸۶)

تو حضرات! یہ ہے اس قرآنی تحریک کا انجام، جو علم و بصیرت کے نام پر شروع کی گئی تھی، اور خاتمے کوری تقلید پر ختم ہو رہی ہے۔ تا دیدہ آغاز م ، انجام جگر

آپ سوچیے اور بار بار سوچیے کہ کیا آپ کو اس انداز پر اپنی بیش قیمت توانائیاں اور بیش قیمت سرمایہ ضائع کرنے کے لیے تیار ہونا چاہئے؟ کیونکہ اگر کچھ کھو دینے کے بعد، کل کو کراچی والوں کی طرح آپ کو بھی مایوسی ہوئی، تو یہ مایوسی مزید دل شکنی کا باعث ہوگی۔ (حدیث دلگداز ے، صفحہ ۴۶،۴۷)

(۵) کافرگری اور منافق گری:

جناب پرویز صاحب کے خلاف، جب پورے پاکستان کے علماءِ کرام نے متفقہ طور پر، کفر کا فتویٰ صادر فرمایا تھا، تو موصوف نے لکھا تھا کہ:...... "اس سے بھی بڑھ کر ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات (یا کسی اور کو) یہ اتھارٹی کہاں سے مل جاتی ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کریں؟ علماء کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جسے چاہے کافر قرار دے دے؟"... (کافرگری، صفحہ ۳۰)

تو کیا جناب پرویز صاحب یہ بتانے کی تکلیف فرمائیں گے کہ خود پرویز صاحب کو کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھے بغیر ہی یہ اتھارٹی کہاں سے حاصل ہوئی کہ وہ جسے، ان کا جی چاہے، منافق بنا دیں اور لوگوں کے خلاف نفاق کے فتوے صادر فرمائیں۔"

جناب پرویز صاحب نے فرمایا تھا کہ:...... "باقی رہے مفتی، سو اسلامی سلطنت میں یہ ایک منصب تھا کہ جس پر کوئی شخص، حکومت کی طرف سے تعینات ہوتا تھا، اس کے علاوہ مفتی نہیں ہوتا تھا۔ جس طرح آج کل ایڈووکیٹ جنرل یا اٹارنی جنرل حکومت کی طرف سے تعینات ہوتے ہیں، اور ہر وکیل نہ اپنے آپ کو ایڈووکیٹ جنرل قرار دے سکتا ہے، اور نہ ہی اس منصب کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ مفتی کی حیثیت، مشیرِ قانون کی ہوتی ہے، یا اس کی طرف سے مقرر کردہ قاضی کی۔ اب نہ وہ حکومتیں باقی ہیں، نہ ان کی طرف سے مقرر کردہ مفتی۔ لیکن یہ حضرات

ابھی تک اپنے آپ کو انہی معنوں میں مفتی سمجھتے ہیں اور صرف مفتی کے فرائض سرانجام نہیں دیتے، بلکہ قاضی کی حیثیت سے فیصلے بھی صادر کرتے ہیں۔"......

کیا محترم پرویز صاحب ہمیں بتائیں گے کہ ان کی طرف سے نفاق کے یہ فتوے کس اتھارٹی کی بنا پر صادر کیے جا رہے ہیں؟ کیا وہ خود حکومت ہیں؟ یا حکومت پاکستان کی کوئی صاحبِ اقتدار ہستی یا حکومت پاکستان نے آپ کو اس مقصد کے لیے تعینات فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں جھانک کر ان کے متعلق، ایمان کے فیصلے صادر فرمایا کریں؟ اگر ان میں سے ایک صورت بھی نہیں ہے تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ لوگوں پر نفاق کا گھناؤنا الزام لگائیں، واضح رہے کہ اسلام کی رو سے نفاق کا درجہ، کفر واضح سے کہیں بدتر ہوتا ہے۔ (حدیثِ دلگداز ے، صفحہ ۲۳،۲۲)

دوسری بات، خود نفاق کے سلسلہ میں عرض کرنی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اجماعی طور پر علماءِ کرام کا فیصلہ یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کے بعد، نفاق کا انسٹی ٹیوشن ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے، یعنی آپؐ کی وفات کے بعد، آدمی کو مسلمان کہا جا سکتا ہے یا کافر۔ منافق نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ نفاق کا تعلق خالصتہً دل سے ہوتا ہے جس کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کو تو وحی کے ذریعہ منافقین کا علم ہو جاتا تھا، لیکن آپؐ کے بعد کوئی دوسرا شخص، کسی کے نفاق کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ...... چنانچہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں علماءِ اسلام نے لوگوں کے کفر اور فسق کے فتوے تو بے شمار دیے، لیکن جناب پرویز صاحب سے پہلے کسی بڑے سے بڑے عالم اور مجتہد کو بھی یہ جسارت نہیں ہو سکی کہ وہ کسی آدمی کے خلاف نفاق کا فتویٰ صادر کر سکے۔ یہ نرالا اعزاز، آج چودھویں صدی میں محض جناب پرویز صاحب ہی کو حاصل ہوا ہے کہ وہ لوگوں کے متعلق نفاق کے فتوے صادر کر کے علیم بذات الصدور ہونے کے مدعی بن رہے ہیں۔ (ایضاً، صفحہ ۲۲،۲۱)

"نفاق کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے، نفاق دراصل ایک قسم کا جھوٹ ہی ہوتا ہے اور آدمی جھوٹ یا تو دفعِ مضرت کے لیے بولتا ہے یا جلبِ منفعت کے لیے۔

آدمی نفاق جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب اس لیے کرتا ہے کہ مومنین کی جماعت سے اسے کوئی اندیشہ ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ حکومت وسلطنت میں مجھے کوئی اچھا منصب حاصل ہو جائے، یا دولت وثروت یا عزت وشوکت حاصل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کا گروہ اسی وقت وجود میں آیا جب مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ مکی دور میں منافقین کا گروہ ناپید تھا۔ اب غور فرمایئے کہ محترم پرویز صاحب کی جماعت مومنین، آج کس دور سے گزر رہی ہے؟ کیا وہ مکی دور کی آئینہ دار ہے یا مدنی دور کی مظہر ہے؟ آپ کی جماعت مومنین میں شامل نہ ہونے سے منکرین کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے، اور جو لوگ اس جماعت میں شامل ہیں انہیں کون سے فائدے حاصل ہو رہے ہیں؟ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ جو لوگ آپ کی جماعت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ انہیں منکرِ حدیث، منکرِ شانِ رسالت جیسے دل آزار القاب سے یاد کیا جاتا ہے، گھروں میں تفرقے پڑ جاتے ہیں، گھر والے بھی ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ لوگ انہیں مسلمان بھی نہیں سمجھتے، وہ پورے معاشرے سے کٹ کر رہ جاتے ہیں تو ان غریبوں کو وہ کون سا مادی یا غیر مادی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، جس کی خاطر وہ منافقانہ طور پر آپ کی جماعت میں شامل ہوں گے۔" (ایضاً صفحہ ۲۶، ۲۷)

"محترم پرویز صاحب نے صورتِ حالات کی اصلاح و درستی کے بجائے، کراچی کے احباب کے خلاف اقدامات شروع کر دیے تا آنکہ انہیں منافق قرار دیکر جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ چونکہ شکایات مالی معاملات سے متعلق تھیں، اس لیے پرویز صاحب نے اس خطاب میں، جس کا نام انہوں نے "حرفِ دلنواز" رکھا ہے شاطرانہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ (حاکم بدہن) حضور اکرمؐ پر بھی منافقین کی طرف سے اس قسم کے گھناؤنے الزامات لگائے جایا کرتے تھے، یعنی جب منافقین نے حضور اکرمؐ تک کو نہ چھوڑا تو میری ہستی ہی کیا ہے؟ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:..... اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ داعیِ انقلاب کے خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیے جائیں۔ غور فرمایئے کہ ذاتِ اقدس و اعظم، جسے زمانہ قبل از نبوت، لوگ، امین کہہ کر پکارتے تھے، جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان

جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بددیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی، اس ذات گرامی کے متعلق یہ بدنہاد یہ مشہور کرتے کہ آپ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملہ میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِنۡهُم مَّن يَلۡمِزُكَ فِي ٱلصَّدَقَٰتِ ﴾ (۹/۵۸) ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں۔ غور کیجیے کہ ان باتوں سے حضور ﷺ کا کلیجہ کس طرح چھلنی ہوتا ہوگا۔''...... (ایضا ص ۴۷)

صحافتی بازی گری:

صحافتی بازی گری کی ایک ٹیکنیک یہ بھی ہے کہ جب آپ کے کسی کام پر اعتراض کیا جائے تو آپ کسی ایسی مشہور ہستی کا نام لے دیجیے، جس کا تقدس و احترام مخاطب کے لیے مسلّم ہو، اور اس ہستی کی کسی ایسی ہی مفروضہ غلطی کی نشان دہی کر دیجیے جیسی آپ سے سرزد ہوئی ہے اور کہہ دیجیے کہ یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے کسی مشہور ہستی کو اپنی سطح پر اتار کر لانا، تو دنیا کے بہت سے شاطروں کا شیوہ رہا ہے، لیکن اس مقصد کے لیے حضور اکرم کی ہستی کو وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جس کے دل میں خوف خدا بجز ایمان کا شائبہ تک بھی نہ رہا ہو۔ حسب عادت، اس مقام پر بھی پرویز صاحب نے کذب بیونت اور تحریف سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرمؐ پر اس انداز کا الزام کبھی بھی نہیں لگایا گیا کہ آپ معاذ اللہ پیسے کے معاملے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ آپؐ کے متعلق منافقین نے محض یہ الزام لگایا تھا کہ آپ صدقات میں سے ہم لوگوں کو کم دیتے ہیں اور دوسرے ضرورت مندوں کو زیادہ۔ یہ بات نہیں کہ انہیں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ آپ معاذ اللہ خود رکھ لیتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے صدقات کے اموال کو اپنے اور اپنے اہل و عیال پر حرام کر رکھا تھا۔'' (حدیث دلگداز ہے، صفحہ ۴۷، ۴۸)

کراچی کے منافقین:

''یہ گفتگو ان لوگوں کے متعلق ہے جنہیں پہچاننے میں جناب پرویز صاحب کو اتنا طویل عرصہ لگ گیا، جیسا کہ بقول ان کے، آنحضرت ﷺ کو بھی منافقین کو پہچاننے میں نو سال کا

عرصہ لگ گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرمؐ اور اکابر صحابہؓ منافقین کو اچھی طرح پہچانتے تھے، اور پہلے ہی دن سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرمؐ نے کبھی کسی منافق کو کوئی ذمہ داری کا کام نہیں سونپا، کبھی کسی منافق کے خلوص، دیانت اور تقویٰ کا اعتراف فرما کر اس کی تعریفیں نہیں فرمائیں، جس پر آگے چل کر آپ کو پچھتانا پڑا ہو کہ میں نے فلاں کام فلاں آدمی کو سونپ دیا تھا مگر وہ تو منافق نکل آیا۔ کیا جناب پرویز صاحب، حضور اکرمؐ کے صحابہ کرامؓ سے کسی عبدالرب اور میاں عبدالخالق کی مثال پیش فرما سکتے ہیں جنہیں آپؐ نے ناظم یا مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدہ پر سرفراز کیا ہو، لیکن بعد میں وہ منافق نکل آیا ہو۔ اس کے برخلاف جناب پرویز صاحب، ان لوگوں کو منافق قرار دے رہے ہیں جنہیں اہم ذمہ داری کے کام سونپے گئے، اور عرصہ دراز تک آپ ان کے خلوص، دیانت اور خدمات جلیلہ کے گن گاتے رہے۔" (حدیثِ دلگداز ے، صفحہ ۴۸،۴۷)

(۶) عفو و درگزر:

"حضور اکرمؐ اپنے دور کے منافقین کو پہلے ہی دن سے پہچانتے تھے، لیکن ۹ سال تک انہیں برداشت فرماتے رہے، اور ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ بعض دفعہ صحابہ کرامؓ اس بات کا اصرار بھی کرتے، لیکن آپؐ یہی جواب دیا کرتے تھے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ لوگ باتیں بنائیں۔ کسی تحریک کے ایک سچے قائد کا یہی ظرف ہوتا ہے جس کی جناب پرویز کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ان میں تو! منافقت تو بڑی بات ہے، ذرا سی مخلصانہ تنقید یا دیانت دارانہ مخالفت کو برداشت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۵)

معاشرتی تعلقات کا انقطاع:

"اس قدر گرج برس لینے اور دل کے پھپھولے پھوڑ لینے کے بعد بھی جناب پرویز صاحب کے غیظ و غضب کو تسکین نہیں ہوئی، بلکہ وہ اس کے بعد حاضرین اجلاس کو ان منافقین کے معاشرتی بائیکاٹ پر اکساتے ہوئے فرماتے ہیں کہ...... اس رسولؐ سے صرف یہی نہیں کہا گیا کہ ان سے

جنگ کرے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کرے۔ معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم کیا گیا کہ: ﴿ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾ (۹/۸۴) یوں اس گروہ سے جماعتِ مومنین پاک اور صاف ہوئی۔" (ایضاً صفحہ ۸۷)

پرویز صاحب نے دعویٰ تو فرمایا ہے، معاشرتی تعلقات کے انقطاع کا، اور دلیل دی ہے، اس کی قبر پر نہ کھڑا ہونے اور نماز نہ پڑھنے کی، وہ پھر صرف حضورؐ سے خاص ہے۔ تو کیا یہ معاشرتی بائیکاٹ اس مردہ سے ہوگا جو مر چکا؟ یا اس کے اقارب سے، جو اس جرم میں ملوث نہیں ہیں؟... لہٰذا آیتِ کریمہ سے معاشرتی تعلقات کے انقطاع پر دلیل لانا جاہلانہ استدلال ہے۔ اس آیت میں تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپؐ ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کریں، یہاں معاشرتی بائیکاٹ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟........ پرویز صاحب فرماتے ہیں: ... "غزوۂ تبوک حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی آخری مہم تھی جو ۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوۂ تبوک تک میں شامل ہوئے، اس کے بعد ان کے استیصال کا انتظام کیا گیا۔"...

ایک ہی سفر میں دو متضاد دعوے کر جانا، جناب پرویز صاحب ہی کا کمال ہے، ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ: "غزوۂ تبوک، حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی آخری مہم تھی جو نو ہجری میں واقع ہوئی تھی۔......" "آخری مہم" کے الفاظ کو ذہن میں رکھیے یعنی بعد میں کوئی مہم پیش نہیں آئی۔ اور دوسری طرف یہ ادعا بھی ہے کہ: ... "اس کے بعد ان کے استیصالِ کلی کا انتظام کیا گیا۔"... کیا انتظام کیا گیا اور کہاں انتظام کیا گیا؟ اسی زمین پر؟ یا ساتویں آسمان پر؟ پرویز صاحب نے یہ بتانے کی مطلق زحمت نہیں فرمائی۔... پرویز صاحب کو یہ تسلیم فرما لینا چاہیے کہ ایک طرف، قرآن کریم کی اس دھمکی اور دوسری طرف حضورِ اکرمؐ کے کریمانہ اخلاق، عفو و درگزر اور حسنِ معاملت نے ان منافقین پر یہ گہرا اثر چھوڑا کہ وہ خود ہی اپنے نفاق سے تائب ہو گئے اور انہوں نے اپنی اصلاح خود ہی کر لی کہ ان احکام پر عمل کرنے کی نہ تو نوبت آئی اور نہ اس کی ضرورت لاحق ہوئی۔...... ایک داعی کا کردار یہ ہوتا ہے، نہ کہ وہ، جس کا مظاہرہ محترم پرویز صاحب نے

فرمایا ہے جبھی تو لوگ ان کے گروہ سے چھٹتے جا رہے ہیں۔ پرویز صاحب کو "داعیٔ انقلاب" کہلوانے کا تو بہت شوق ہے۔ اے کاش! وہ داعیٔ انقلاب کا کردار بھی اپنے اندر پیدا کر سکتے۔

(ایضاً، صفحہ ۳۳۳ تا صفحہ ۳۴)

منافقینِ کراچی پر پندارِ نفس کا الزام:

دوسری بات ہمیں ان لوگوں کے متعلق کہنی ہے جن پر (Egoism) یا پندارِ نفس کا الزام لگایا گیا ہے۔ اگر یہ لوگ محض اس مقصد سے آپ کی تحریک میں داخل ہوئے تھے کہ لوگ ان کی تعریف کریں اور وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائیں۔ اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے، اس کے پندار کو تسکین ہوتی ہے۔...... الخ ...... تو کیا ساری دنیا میں تعریف کرانے اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا آدمی بننے، اپنے نفس کو پھولانے اور اپنے اس پندار کی تسکین کرنے کے لیے محض پرویزی معاشرہ ہی رہ گیا تھا، جس کی کل کائنات چند سو افراد سے زیادہ نہیں ہے؟ کیا پرویز صاحب یہ جتانا چاہتے ہیں کہ اجتماعات صرف انہی کے ہاں ہوتے ہیں اور کہیں اجتماعات نہیں ہوتے؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دریاں اور کرسیاں محض ان کے ہاں، بچھائی اور اٹھائی جاتی ہیں، اور کسی جماعت کو نہ دریاں میسر ہیں اور نہ کرسیاں؟ کیا جھاڑو صرف ان کے ہاں ہی دی جاتی ہے؟ اور جوٹھے برتن صرف ان کے ہاں ہی صاف کیئے جاتے ہیں؟ کہ اس غریب کارکن کو یہ تمام کام اور کہیں میسر نہیں آ سکتے تھے، اس لیے وہ اپنے پندارِ نفس کو تسکین دینے کے لیے آپ کے معاشرہ میں داخل ہونے کو مجبور ہو گیا تھا۔ محترما!

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

(حدیث دلگداز ہے، صفحہ ۳۰)

یہ ایک ایسے شخص کے تاثرات ہیں جو طلوع اسلام کا معزز رکن رہا ہے۔ تاہم وہ "منافق" نہیں تھا، کیونکہ وہ لاہور کا رہنے والا تھا، اس کی رقم بھی میزان میں نہیں لگی تھی جس کے خورد برد

ہونے کی اسے ذاتی طور پر کوفت ہوئی ہو۔ وہ طلوع اسلام کا کارکن بھی برقرار رہا کیونکہ بزم صرف کراچی کی توڑی گئی تھی ۔ پھر وہ پرویز صاحب کا نام بھی احترام سے لیتا ہے، لہٰذا اسے ''غیر جانبدار'' ہی سمجھنا چاہئے۔ تاہم اس نے پرویز صاحب کے کردار کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے کہ کس طرح پرویز صاحب نے میزان کا سرمایہ ہضم کرنے کے بعد، سرمایہ فراہم کنندگان پر ناز یبا الزامات اور اتہامات بھی لگائے ہیں تاکہ ان کا اپنا عیب نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس ضمن میں محمد علی صاحب نے چند ایک حیلہ سازیوں کا بھی ذکر فرما دیا ہے، جو پرویز صاحب کی تحریروں میں عموماً ملتا ہے۔ اور اس کتاب ''حدیث دلگداز'' کے ٹائٹل پر یہ عبارت لکھی ہے۔ ...... ''جناب پرویز صاحب کی کاروباری دیانت اور منافق گری کا شہکار۔'' ...... ''ایک غیر جانبدارانہ، بے لاگ تبصرہ۔''

از محمد علی بلوچ بی اے (آنرز)

۱۱۔ ارجن روڈ، کرشن نگر، لاہور

باب ۱۱

"اخلاقی نامردی"

بدنی اور جسمانی اعتبار سے نحیف و نزار ہونا، کوئی عیب نہیں، لیکن ضعفِ کردار اور اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونا یقیناً معیوب چیز ہے، اس کی مختلف صورتوں اور متنوع شکلوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان، کسی سے اختلاف پر اتر آئے، تو دورانِ بحث، اپنے موقف کو تو یک طرفہ طور پر پیش کرے لیکن مخالف کے موقف کو، لوگوں کے سامنے نہ آنے دے۔ عامۃ الناس کے سامنے وہ تصویر کا وہی ایک رخ لائے، جو اُسے پسند ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ، جسے وہ ناپسند کرتا ہے، پیش کرنے کو وہ اپنے مفاد کے خلاف سمجھے۔ اُس کی انتہائی کوشش یہی ہو کہ لوگ، اس کے یک رُخے مطالعے پر ہی، اپنی رائے قائم کر کے بیٹھ جائیں، اور کسی دوسرے شخص کا موقف، ان کے سامنے آنے ہی نہ پائے۔ وہ اگر اپنے مخالف کے نقطۂ نظر کا تذکرہ کرتا بھی ہے تو اُس (مخالف) کے الفاظ میں نہیں، بلکہ خود اپنے الفاظ میں کرتا ہے، اور ایسا کرتے ہوئے، پہلے تو اپنے حریف کی ایک کمزور سی پوزیشن بنا ڈالتا ہے، اور پھر اس پر بہادروں کی شان سے حملہ آور ہو جاتا ہے۔ یہ حرکت، اس امر کی غماز ہے، کہ اس کا مرتکب اپنے اختلاف میں، نہ تو کسی مضبوط اور صحت مند موقف پر قائم ہے اور نہ ہی وہ نیک نیت ہے، مزید برآں، اس کے اختلاف کا لب و لہجہ بھی، اس امرِ واقعی کو مبرہن کر ڈالتا ہے کہ نیک نیتی سے، محض افہام و تفہیم کی خاطر، وہ، اظہارِ خیال نہیں کر رہا، بلکہ دل کا بخار نکالنے کے لیے، کچھ مسائل کو، بحث کے لیے ایک بہانہ بنا رہا ہے، دورانِ بحث، اس کا ایک ایک لفظ، نہ صرف یہ کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ کا زندہ ثبوت ہے، بلکہ ﴿ مَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ﴾ کے الفاظ کا بھی مجسم مصداق بن رہا ہے۔

یہ صورتِ حال، اگر ایک طرف، اس کے کردار کی پستی، اور اخلاق کی گراوٹ کی آئینہ دار ہے، تو دوسری طرف، اس کے عدل و انصاف اور دیانت و امانت کے افلاس ہی نہیں، بلکہ اس کے حرمان و فقدان پر بھی دال ہے، نیز ایسا شخص، اس بات کا مطلق احساس نہیں رکھتا کہ اسے اپنے

ایک ایک لفظ اور حرکت ہی کے بارے میں نہیں، بلکہ اپنی نیت اور ارادے تک کے متعلق، اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، اس کے نزدیک اول و آخر محض دنیا ہی دنیا ہے جسے اگر وہ دھوکہ وفریب کے ساتھ، اپنا ہم نوا بنالے، تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ فلاح یاب وکامران ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد، "مفکرِ قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، نے، ستمبر ۱۹۴۸ء سے، (علماءِ کرام کے خلاف بالعموم، اور) سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خلاف بالخصوص، جس گھٹیا اور گھناؤنے پراپیگنڈے کا آغاز کیا، اور جواباً مولانا مودودیؒ نے، جس سکون و سکوت کے ساتھ، صبرِ جمیل کا مظاہرہ کیا، وہ سنجیدہ اور باوقار طبقے کے سامنے، دونوں کی اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دیتا ہے، اور جس کے پاس، دل کی بصیرت اور دیدوں کی بصارت کا شمہ بھر بھی موجود ہے، وہ جان لیتا ہے کہ کس کا تعلق اولیاءِ شیطان سے ہے، اور کون عبادالرحمٰن میں سے ہے، کون پرویزی حیلوں اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے، اور کون وقار و متانت اور شائستگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کون حسد و کینہ اور بغض و عناد میں اندھا ہو رہا ہے اور کون اِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ کون، قرآن کو نیزوں پر لٹکا کر، اتہام تراشی، بہتان طرازی، کذب بیانی، (اور عبارات کو سیاق و سباق سے اکھاڑ کر) خیانت کاری اور مغالطہ آرائی کے ذریعہ زہریلا پراپیگنڈہ کر رہا ہے، اور کون کوہِ استقامت بن کر، ایں و آں سے بے پرواہ ہو کر، ان شیطانی چالوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، اپنے مثبت انداز میں خدمتِ قرآن اور اشاعتِ اسلام کر رہا ہے۔

اگرچہ گزشتہ ابواب میں، "مفکرِ قرآن" صاحب کے اکاذیب و اباطیل، تضادات و تناقضات، الزامات و اتہامات، خیانات و بہتانات اور دھوکہ بازیوں اور فریب کاریوں کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن اس باب میں چند ایک ایسی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں، جو اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ دل دادگانِ ظلمت، حقائق کی روشنی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ تاریکیوں میں پلنے والے یہی چاہتے ہیں کہ ظلمت کے دبیز پردے، اُن پر بدستور قائم رہیں، اور ان کے ظلمت کدوں میں روشنی کی کرن کا گزر نہ ہونے پائے، لیکن شب کی تاریکیوں میں پرورش پانے والی چمگادڑیں، خواہ کتنا ہی زور لگائیں، طلوعِ آفتاب کے بعد، روشنی کو روک نہیں سکتیں۔ "مفکر

قرآن" (اور طلوع اسلام کی بھی) کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے کہ ان کا تاریک موقف، ہمیشہ یک طرفہ ہی، ان کے قارئین تک پہنچتا رہے، اور ان کے فکری مخالفین کے روشن موقف کی کوئی کرن بھی ان تک پہنچنے نہ پائے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی مثال کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے، اس میں اگر ایک طرف، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ چشمۂ ظلمت کس طرح تاریکیوں کے دبیز پردے چھپائے رکھنے پر مصر رہتی ہے، اور اپنے ہم جنسوں تک روشنی کو نہیں پہنچنے دینا چاہتی، تو دوسری طرف، منکرین حدیث کے مسموم پراپیگنڈے کی مختلف چالیں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں کہ وہ کس طرح "کرو خود، مگر الزام دوسروں پر" کے مکاید اختیار کرتے ہیں، اور اپنے مخالفین کی عبارات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کس قدر فنکار واقع ہوئے ہیں، اور کس طرح "الٹا چور، کوتوال کو ڈانٹے" کا مصداق بنتے ہوئے دیدہ دلیری اور تہور کا مظاہرہ کرتے ہیں: اور کس طرح، ایک مصنف کو، خود اس کی اپنی عبارتوں میں کتر بیونت کے ذریعہ دھوکہ دینے میں مہارتِ فن کا ثبوت دیتے ہیں۔

پہلی مثال...... انکارِ حدیث اور مخالفتِ سنت کی طوفانی یلغار:

طلوع اسلام ہفت وار ہو، یا ماہانہ۔ پرویز صاحب کے دروسِ قرآن ہوں یا کنونشن کے خطابات۔ ان سب میں، جن امور کو سب سے بڑھ کر اہمیت دی جاتی ہے، اور جن پر لسان و قلم اور دل و دماغ کی ساری قوتیں اور توانائیاں صرف کی جاتی ہیں، وہ مندرجہ ذیل چار امور ہیں:

(۱) علماء امت کے خلاف نفرت کی مہم کو بھرپور انداز میں جاری رکھنا۔

(۲) مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف، خاص طور پر، یلغاری مہم کو برقرار رکھنا۔

(۳) انکارِ سنت کے لیے ارتیابی مہم اور تشکیکی تحریک کو پوری قوت سے چلائے رکھنا۔

(۴) اربابِ اقتدار سے استمالی تعلقات قائم رکھنا، اور پھر انہیں چھپائے رکھنا۔

طلوع اسلام کی پالیسی کے یہ چار مستقل اجزا ہیں، اس کی تحریک کی ساری سرگرمیاں، انہی چار پہلوؤں پر محیط ہیں۔ لیکن اس وقت، موضوع کی مناسبت سے، صرف اس پہلو کو زیر بحث رکھا گیا ہے، جو انکارِ حدیث اور مخالفتِ سنت کی طوفانی یلغار سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ ہم طلوع

اسلام کے دور پاکستان کی فائل میں، یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث کی مخالفت اور سنت کی عداوت میں، وہ سارے حربے آزمائے گئے، جو سیکولر حکومتوں کی مفاد پرست صحافت میں اختیار کیے جاتے ہیں، مثلاً:

(۱) سنسنی خیز سرخیاں جما کر، حدیث و سنت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والے سوالات کو بڑے تحدی آمیز اعلانات کے ساتھ شائع کیا گیا، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟ ❶

(۲) سنت کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں علماء کے باہمی اختلافات کو، بڑے تکرار واعادہ کے ساتھ پیش کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تاکہ یہ تاثر اچھالا جائے کہ سنت، علماء کے درمیان لفظاً متفق علیہ ہو تو ہو، ورنہ معناً اور مفہوماً قطعاً متفق علیہ نہیں ہے اور جب متفق علیہ نہیں ہے تو آئین پاکستان کی بنیاد کیسے بن سکتی ہے؟ اور یہ روش اپناتے ہوئے، پرویز صاحب (اور طلوع اسلام) خود یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خود قرآن مجید کا بھی یہی حال ہے، اہل قرآن کے مختلف دھڑوں میں، متنِ قرآن پر اتفاق واجماع کے باوجود، اس کے معنی ومفہوم میں شدید اختلافات، آج تک موجود ہیں، ایسی صورت میں تو پھر قرآن بھی دستور پاکستان کی اساس قرار نہیں پا سکتا لیکن پراپیگنڈہ صرف حدیثِ نبوی اور سنت رسولؐ ہی کے خلاف دائماً جاری رکھا گیا۔

(۳) سنت کے بارے میں، منکرین حدیث نے اپنے نقطۂ نظر سے، اسکا مقام اور حیثیت متعین کرتے ہوئے، ایک مضمون ''سنت رسول اللہ'' کے زیرِ عنوان، ادارتی صفحہ پر ثبت کیا اور پھر اسکے بعد، بڑے مسکین الطبع بنتے ہوئے، طالب علمانہ انداز میں یہ کہا گیا:

''یہ ہے ہمارے نزدیک، اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں، ہم ملک کے اربابِ فکر ونظر سے باادب درخواست

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۱ء، صفحہ ۴۰ + اگست تمبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۳۲

کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دل کے سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں، اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط، ہم محسوس کرتے ہیں کہ ارباب فکر ونظر سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت وسکون سے غور فرمائیں، عام حالات میں خود فکر ونظر کی توہین ہے، لیکن اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر سکوت وسکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے، اور اتباع سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل پیش کیے بغیر، ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں بیٹھے گا۔“ ❶

اب بڑی سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ سنت کے بارے میں، اس کا اختیار کردہ موقف درست ہے یا نہیں (اور لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات ڈالنا، نہ تو اس کا مقصود ہے اور نہ ہی عادت ہے) تو وہ کسی محدث یا عالم حدیث سے مل کر، یا اس سے نجی خط وکتابت کے ذریعہ، اپنے موقف کے صحیح یا غلط ہونے کا علم پا سکتا ہے، لیکن آخر یہ کیا طریقہ ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک، سنت کے بارے میں، علماء کے کامل اتفاق پر مبنی نظریہ کے خلاف، ایک نیا اختراعی اور وضعی عقیدہ بنا لیا جائے اور پھر سے عامۃ الناس میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے، بتکرار و اصرار کے ساتھ، مسلسل اور متواتر شائع کیا جائے، اور ساتھ ہی بڑے معصومانہ انداز میں ”باادب گزارش“ کی جائے کہ ”ہماری غلطی یا صحت کو واضح کیا جائے تاکہ ہم شکر گزار رہوں۔“

اس کے ساتھ ہی، طلوع اسلام نے یہ بھی لکھا ہے:

”جو حضرات یا جماعتیں، طلوع اسلام کو منکر حدیث پکار کر، ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آ رہی ہیں، ان سے بھی ہماری باادب گزارش ہے کہ وہ ازراہ کرم صرف اتنا بتا دیں کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس میں کوئی غلطی ہے؟ اگر غلطی

❶ طلوع اسلام، ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

مروڑ کر لکھے گئے ہیں، سچ اور جھوٹ خود سامنے آ جائے گا۔"❶

مولانا مودودیؒ کے اقتباسات کو صحت و صداقت اور دیانت و عدالت کے ساتھ پیش کرنے میں، اس اعتماد اور وثوق کو ملاحظہ فرمائیے، جس کا اعلان یہ کہہ کر کیا گیا کہ۔ "آپ خود مودودی صاحب کی کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان کر لیجیے کہ یہ اقتباسات، سیاق و سباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں" ۔ حالانکہ انہی اقتباسات میں سے اور کچھ دیگر اقتباسات میں سے، جب سنت کی آئینی حیثیت پر قلمی مناظرہ کے دوران، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے چند عبارتیں پیش کیں تو مولانا مودودیؒ نے ان حضرات کی صداقت و دیانت اور عدل و انصاف کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا تھا (اس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے) لیکن اس مقام پر، صرف یہ امر پیش نظر رکھیے کہ منکرین حدیث کی مخرفانہ ذہنیت کے پیش نظر، اور مسائل کی بحث و تمحیص میں بازاریت پر اتر آنے کی بنا پر، نیز اس وجہ سے بھی کہ یہ لوگ، افہام و تفہیم کی بجائے محض عقلی کشتی اور ذہنی دنگل لڑنے کی خاطر، ان مسائل کو کھڑا کرتے ہیں تاکہ عامۃ الناس کے قلوب و اذہان کے اطمینان اور سکون خاطر کو شولیدہ فکری اور پریشاں خیالی میں تبدیل کیا جا سکے، اور لوگ اگر حجیتِ سنت کا انکار نہ بھی کریں تو کم از کم ان کے دلوں اور دماغوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے ضرور ڈالے جا سکیں، اس لیے مولانا مودودیؒ نے یہ مناسب نہ جانا کہ خود کو پرویز صاحب کا (اور ترجمان القرآن کو طلوع اسلام کا) حریف بنا ڈالا جائے، ویسے بھی مولانا مودودیؒ کا مزاج یہ تھا کہ جہاں کسی نے تہذیب و شائستگی کے ساتھ، سمجھنے سمجھانے کے لیے، استفسارات کیے تو انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے، وقار و متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مدلل اور مسکت جوابات دیے، لیکن جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ سوالات میں نیک نیتی کی بجائے جھگڑالو پن کا محرک کارفرما ہے، وہاں وہ جواب دینے کی بجائے سکوت اختیار فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ایک مقام پر وہ خود فرماتے ہیں۔

میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میری اور جماعت اسلامی کی اس قدر

❶ طلوع اسلام ۲/ اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۲

شدت کے ساتھ مخالفت یکایک اب کیوں شروع ہوگئی ہے اور یہ فتوے کن وجوہ سے دیئے جارہے ہیں، لیکن اگر میں اس کو جان بھی لیتا تو یہ غیر ضروری بحث ہے کہ کسی نے اعتراض کیا تو کیوں کیا؟ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اسکا اعتراض معقول ہے یا نا معقول۔ معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے مان لیتے ہیں یا اسکا معقول جواب دیتے ہیں اور نا معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"●

طلوع اسلام کی ارتیابی یلغار اور تشکیکی مہم میں تیزی:

بہر حال، مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں سے مسخ و تحریف اور کتر بیونت کے ذریعہ، سیاق و سباق سے اکھاڑی ہوئی عبارتوں پر مشتمل مضمون بعنوان "قرآن و حدیث کی صحیح پوزیشن" کی اشاعت (در طلوع اسلام ۲/ اپریل ۱۹۵۵ء) کے بعد، مولانا مودودیؒ نے اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ ان اقتباسات میں کہاں کہاں اور کس کس انداز میں کرشمہ سازی کی گئی ہے، لیکن طلوع اسلام، جس کا مقصد ہی ملازم کے لیبل میں، علماء کرام کی مخالفت کرنا ہے، اپنی تشکیکی مہم اور ارتیابی تحریک کو آگے بڑھاتا رہا، اس اعلان کے ساتھ کہ...... "بتاؤ! ہم نے کہاں مودودی صاحب کے اقتباسات میں مسخ و تحریف کی ہے، اگر نہیں تو ہماری غلطی واضح کرو، ورنہ خود اپنا مسلک تم تفصیل سے بیان کرو۔"...... اس مضمون کی اشاعت کے بعد طلوع اسلام نے، حدیث و سنت کے متعلق، اپنی تشکیکی مہم اور ارتیابی تحریک کو اور تیز کر دیا، اور پوری تحدی کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے یہ پیشین گوئی بھی کر ڈالی:

> "یہ حضرات، کبھی متعین طور پر یہ نہیں بتائیں گے (نہ مودودی صاحب اور نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث و سنت کی پوزیشن کیا ہے، ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بات واضح اور متعین طور پر نہ کہی جائے، ہر بات مبہم رکھیے اور ہر جگہ متضاد بات کہیے تا کہ مداری کی پٹاری سے جس وقت، جی چاہے، حسب منشا بات

● رسائل و مسائل، جلد دوم، صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۳

اسلام، اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرلے گا، اور ان سے اور مودودی صاحب سے اپنے قصور کی معافی مانگ لے گا۔

اور وہ اگر ایسا نہ کرسکیں (اور وہ ہرگز ایسا نہیں کرسکیں گے) تو ہم ان سے دریافت کرنا چاہیں گے کہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو آخر کب تک دھوکہ دیتے چلے جائیں گے۔"❶

اسے کہتے ہیں، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اپنے قارئین کو تاریکی میں رکھنے کے لیے طلوع اسلام، اپنے عالمِ خیال کے گمانوں کو "حقائق" کا لباسِ زور پہنا کر پیش کرتا ہے، لیکن اس کاروائی کا الزام، اپنے مخالفین پر عائد کرتے ہوئے، الٹا اُن سے یہ استفسار کرتا ہے کہ "وہ سادہ لوح مسلمانوں کو آخر کب تک دھوکہ دیتے چلے جائیں گے۔"

اسی اشاعت میں ایک اور مقام پر، یہ بھی لکھا گیا ہے:

"ان کے پاس طلوعِ اسلام کے پیش کردہ حقائق کا کوئی جواب نہ تھا، اس لیے انہوں نے سوچا کہ ملک میں بھگدڑ مچا دو، اس کے لیے انہوں نے شور مچایا کہ اسلام خطرے میں ہے، سنت رسول اللہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) مٹائی جا رہی ہے، ذاتِ رسالت مآب کی (خاکم بدہن) توہین ہو رہی ہے، اور یہ سب کچھ کس طرف سے ہو رہا ہے؟ طلوعِ اسلام کی طرف سے۔"❷

اس کے بعد حدیث و سنت کے بارے میں یہ تین سوالات، اس زعم کے ساتھ پیش کیے گئے کہ ان کا جواب کہیں سے ممکن ہی نہیں ہے۔

(الف):......قرآن و حدیث دونوں اگر دینی حیثیت کے حامل ہیں تو کیا وجہ ہے کہ قرآن کو لکھوایا گیا اور حدیث کو لکھوایا نہیں گیا؟

(ب):......اگر ارشاداتِ نبویہ، وحی خداوندی تھے، تو خلفاءِ راشدین (بالخصوص حضرت عمرؓ) نے انہیں کیوں بدل دیا تھا؟

---

❶ طلوعِ اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

❷ طلوعِ اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰

(ج):...... وہ صحیح حدیث، جو واجب الاتباع ہے، اس کا ماخذ کیا ہے؟ اسے کہاں سے لیا جائے گا؟

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد، یہ لکھا گیا ہے:

"اس سوال کو طلوع اسلام نے اپنی ۲ ر اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں (لمعات میں) پیش کیا تھا اور اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا تھا، اسکے بعد، ہم نے امت کے تمام ارباب فکر ونظر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سوال پر غور کر کے ہمیں بتائیں کہ جو خیال ہم نے پیش کیا ہے، اس میں کوئی غلطی ہے؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

اس کا جواب بھی اس وقت تک کہیں سے موصول نہیں ہوا (حالانکہ جماعت اسلامی کے ارباب حل وعقد کو، اس بارے میں، ذاتی خطوط بھی لکھے گئے تھے۔)" ●

اور ذرا آگے چل کر، یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

"ہمیں امید ہے کہ وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس قسم کے سوالات اٹھانا اور دینی اور علمی طریق سے ان کا حل طلب کرنا، یا حل سوچنا، کوئی ایسا جرم نہیں جس کی پاداش میں کسی کو ہدف سب وشتم بنایا جائے، جماعت اسلامی والے یہ سب کچھ اپنی مصلحتوں کے تحت کر رہے ہیں۔" ●

یہ بھی اُسی ٹیکنیک کا ایک دوسرا پینترا ہے کہ از خود کچھ سوالات، اس غرض کے لیے تصنیف کیے جائیں کہ لوگوں کے قلوب واذہان میں شکوک وشبہات کے کانٹے ڈالے جائیں اور پھر یہ کہا جائے کہ ان سوالات کا حل یا جواب سوچنا، کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی پاداش میں کسی کو ہدف سب وشتم بنایا جائے، اور پھر یہ الزام تراشا جائے، کہ جماعت اسلامی والے، طلوع اسلام کو واقعی گالیاں دے رہے ہیں اور ان کا ایسا کرنا، ان کی مصلحتوں کا تقاضا ہے، حالانکہ ترجمان القرآن کی فائل گواہ ہے کہ نہ تو اس میں اس وقت تک ان سوالات سے تعرض کیا گیا ہے اور نہ اسے جرم قرار

●،● طلوع اسلام، ۳۰ ر اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰ اور صفحہ ۱۵

اسی کے تسلسل میں، اگلی عبارت یہ ہے:

"لیکن مخالفت کا یہ انداز تو کسی شریف معاشرہ میں بھی درخورِ تحسین نہیں سمجھا جائے گا کہ اپنے مخالف کے خلاف، غلط الزامات لگائے جائیں، بہتان تراشے جائیں اور بے بنیاد اتہامات سے اسے بدنام کیا جائے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی جماعت نے طلوعِ اسلام کی مخالفت میں بڑی شدت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے۔" ❶

چور کی اس دیدہ دلیری کے کیا کہنے کہ وہ الٹا کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے، طلوعِ اسلام نے جو روش خود اپنا رکھی ہے اسکا الزام، وہ پلٹ کر دوسروں پر عائد کرتا ہے، کیوں؟ صرف اس لیے کہ دوسروں پر بہتان تراشی کا الزام عائد کر دینے سے یہ تاثر خود بخود ابھرتا ہے کہ جو دوسروں پر اس گھناؤنی حرکت کا الزام لگاتا ہے، کم از کم خود اس کا دامن تو ایسی حرکت سے پاک ہی ہوگا، اسی طرح دوسروں کے خلاف جارحانہ تنقیص کا یہ عمل، خود اسکے اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کا کام دیتا ہے۔

بہر حال، "طالبینِ اصلاحِ خویش" کا یہ مطالبہ کہ اُن کی غلطی واضح کی جائے، پھر ایک مرتبہ ان الفاظ میں دہرایا جاتا ہے:

"طلوعِ اسلام نے حقیقت کو واشگاف کرنے کے لیے (۱) ایک مقالہ لکھا جس میں سنتِ رسول اللہ کے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت کی اور (۲) آپ (مودودی صاحب) کی تحریروں پر مشتمل ایک مضمون مرتب کیا جس میں بتایا گیا کہ حدیث اور سنت کے متعلق آپ بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو طلوعِ اسلام کہتا ہے اور انہیں طلوعِ اسلام کی ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع کر کے جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے بالخصوص درخواست کی گئی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ ہماری غلطی کہاں ہے تا کہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں، اس کے متعلق ہم نے محترم امین احسن اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں نجی خطوط بھی لکھے اور پھر طلوعِ اسلام میں کئی مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی، لیکن ان حضرات (یا جماعت اسلامی میں سے کسی دوسرے

---

❶ طلوعِ اسلام، ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵

صاحب) کی طرف سے اس کے متعلق ہمیں کوئی جواب موصول نہیں ہوا، مگر ہمارے خلاف سب وشتم کا سلسلہ ہے کہ بدستور جاری ہے بلکہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔''❶

لیکن حرام ہے جو کبھی طلوع اسلام نے ترجمان القرآن سے مولانا مودودیؒ یا جماعت اسلامی کے کسی ذمہ دار یا غیر ذمہ دار شخص کا کوئی ایسا اقتباس پیش کیا ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ ''طلوع اسلام کے خلاف سب وشتم کا سلسلہ ہے کہ بدستور جاری ہے بلکہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے''، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ طلوع اسلام کے خلاف، شدید مخالفت اور بہتان تراشی کا یہ فرضی پراپیگنڈہ، خود اس کی اپنی ہی چالوں میں سے ایک چال ہے، جسکے پس پردہ اس کی اپنی ہی مصلحتیں کارفرما ہیں۔

اور پھر آخر میں، مولانا مودودیؒ سے، ایک مطالبہ یہ کہہ کر پیش کیا گیا:

''سنتِ رسول کے متعلق، ہم نے اپنا جو مسلک بیان کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس میں کیا غلطی ہے؟ اسکے ساتھ ہی ہم یہ بھی گزارش کریں گے کہ آپ اپنے کسی ایسے مضمون کی نشاندہی کر دیں جس میں ایک ہی جگہ، حدیث اور سنت کے متعلق، آپ کا مسلک واضح اور مکمل طور پر بیان ہوا ہو، اگر کوئی ایسا مضمون نہ ہو تو ہم درخواست کریں گے کہ آپ اس قسم کا کوئی جامع مضمون اب تحریر فرما دیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں آپ کی پوزیشن کیا ہے، اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اس موضوع پر آپکی تحریروں میں اس قدر متضاد باتیں ملتی ہیں کہ آپ کی جماعت ہر موقع پر، ایک نئی بات، آپ کی طرف سے پیش کر دیتی ہے۔''❷

یہ ہے پراپیگنڈے کی تکنیک، جو طلوع اسلام نے پاکستان بننے کے بعد، سنت کو مشکوک و مشتبہ بلکہ بے وزن و بے وقعت ٹھہرانے کے لیے، ایک مہم کی صورت میں اپنائے رکھی اور تقریباً تیرہ چودہ سال تک بغیر دم لیے اسے جاری رکھا اور ساتھ ہی ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق، اپنے مخالفین پر، پرویز صاحب، یہ الزام بھی لگاتے رہے کہ وہ طلوع اسلام کے خلاف،

❶ طلوع اسلام ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵ ❷ طلوع اسلام ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵

جھوٹا پراپیگنڈہ کر کے، اسے بدنام کرتے ہیں...... لیکن...... پھر بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جب مولانا مودودیؒ کو، منکرینِ حدیث کے غبارۂ استدلال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری ہوا نکال دینا پڑی۔

منکرینِ حدیث کی ایک مکروہ سازش:

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، منکرینِ حدیث کے معاملہ میں بھی یہی ہوا، اُن کی شامتِ اعمال نے انہیں دھکا دیا تو انہوں نے بظاہر علمی تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر، سنت کے بارے میں چند سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ تیار کیا، اور اسے مولانا مودودیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی سیاح الدینؒ صاحب اور بعض دیگر علماء کو اس امید پر ارسال کیا کہ ان علماء کی طرف سے جب جوابات (خواہ کتنے ہی خفیف اختلافات کے ساتھ ہوں) آئیں گے تو انہیں بنیاد بنا کر یہ پراپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ جس سنت پر یہ علما لفظاً متفق ہیں، اُسکی حقیقت کے تعین میں مختلف الرائے ہیں، لیکن جملہ علماء نے حسبِ معمول شرارت خانی پر مبنی ان سوالات کو کوئی اہمیت نہ دی، لیکن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، جنکا پیمانۂ صبر شاید لبریز ہو چکا تھا، ان سوالات کا سامنا کیا اور اعتراضات اور جوابات پر طول پکڑتی ہوئی یہ مراسلت، ایک قلمی مناظرے کا روپ دھار گئی، اس کاروائی کے دو پہلو بڑے دلچسپ ہیں۔

اولاً:...... یہ کہ جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، جو مسلکِ انکارِ حدیث کے علم بردار اور مبلغ تھے اور اپنے رسالہ طلوعِ اسلام میں، سنت کو مشتبہ اور مشکوک قرار دینے کے لیے، سالہا سال سے مہم چلا رہے تھے، خود سامنے نہیں آئے، بلکہ اپنی فکر سے وابستہ ایک اور شخص مسمی ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو، اس مراسلت میں، مولانا مودودیؒ کے مقابل، بطور فریق پیش کیا۔

ثانیاً:...... یہ کہ، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے سنت کے بارے میں چار بنیادی سوالات پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ لکھا کہ:

> ”چونکہ آئین کے سلسلہ میں، عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے، اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا

جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ❶

اس کے جواب میں، مولانا مودودیؒ نے نہایت اختصار سے یہ فرمایا تھا:

”آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے، اس سے پہلے بھی سوالات، دوسرے گوشوں سے آ چکے ہیں اور ان کا جواب بھی واضح طور پر میں دے چکا ہوں، ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار دہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظر انداز کرنا کوئی صحیح بات نہیں ہے، اگر بالفرض آپ کے علم میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیے دیتا ہوں۔ (ملاحظہ ہو: ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۲۰ اور دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶۰ تا صفحہ ۱۷۰) آپ انہیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب، ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے، اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو براہِ کرم میرے مذکورہ بالا دونوں مضامین بھی بجنسہٖ شائع فرما دیں کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔“ ❷

ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے دوسرے خط کے جواب میں، آخر میں مولانا مودودیؒ نے یہ فرمایا تھا:

”آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے پہلے عنایت نامے کو، آپ نے اس فقرے پر ختم فرمایا تھا: ...... ”چونکہ آئین کے سلسلہ میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے، اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۶ ❷ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۷

موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔ .... میں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعتراض ہونا تو درکنار، میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اس مراسلت کو جوں کا توں شائع فرما دیں، میں خود اسے "ترجمان القرآن" میں شائع کر رہا ہوں، آپ بھی اسکو "طلوع اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں تاکہ دونوں طرف کے عوام، اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔" ❶

منکرینِ حدیث کی وعدہ خلافی اور "اخلاقی نامردی":

اس مراسلت سے قبل، منکرینِ حدیث طلوع اسلام کے ذریعہ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو، حدیث وسنت کے متعلق، مضامین وخطوط لکھ کر، یہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ کے موقف کو بھی شائع کریں گے، اور خود ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے بھی، آغازِ مراسلت ہی میں، مولانا مودودیؒ کے جواب کو شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کی مولانا نے بخوشی اجازت دی تھی، لیکن منکرینِ حدیث کی اخلاقی جرأت کا فقدان آڑے آیا اور وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے، یک طرفہ طور پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط تو طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے مگر مولانا مودودیؒ کا کوئی جواب اور کوئی خط بھی شائع نہ ہونے دیا گیا۔ جب تک مولانا مودودیؒ نے ان لوگوں کو جواب نہ دیا تھا، یہ لوگ سر پہ چڑھے جا رہے تھے، اور طلوع اسلام کے ۲ راپریل ۱۹۵۵ء کے مقالوں کے بعد تو یہ کہتے ہوئے شکایات کا طومار باندھ ڈالا گیا مثلاً:

> سنت رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہمیں، ہماری غلطیوں سے متنبہ فرمائیں۔
>
> ان میں سے کسی بات کا جواب، اس وقت تک نہ ہمیں براہ راست ملا ہے اور نہ ہی جماعت اسلامی کے کسی جریدہ میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔
>
> اس کے بعد ہم محترم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم بتا دیں کہ کھل کر سامنے آنے اور دلائل وبراہین سے بات کرنے کا اور کون سا طریقہ ہوتا ہے؟

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۷

اور ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس باب میں (مودودی صاحب کے الفاظ میں) ''اخلاقی نامرد'' کون ہے؟●

ظاہر ہے کہ ''اخلاقی نامرد'' وہی لوگ ہیں جو دونوں طرف کی مراسلت شائع کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد، یہ گھٹیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں کہ یک طرفہ طور پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط کو تو طلوعِ اسلام میں شائع کر ڈالتے ہیں لیکن مولانا مودودیؒ کے جوابات کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے، جبکہ دوسری طرف، مولانا مودودیؒ کی اخلاقی مردانگی کا یہ عالم ہے کہ وہ دونوں طرف کی مراسلت کو بن وعن، ترجمان القرآن میں شائع کر دیتے ہیں تاکہ تصویر کے دونوں رُخ قارئین کے سامنے آ جائیں۔ اس سے طلوعِ اسلام کی اخلاقی نامردی کے ساتھ ساتھ، اُسکی صحافتی دیانت و امانت کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔

''بصیرتِ پرویز'' اور فراستِ مودودیؒ:

یہاں، اس بحث کے حوالے سے ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے، طلوعِ اسلام، حدیث و سنت کے بارے میں شکوک و شبہات کا گرد و غبار اڑانے کے جہاد پر مسلسل کمربستہ رہا، تاکہ بحث کی آگ بجھنے نہ پائے، اور اپنے ہفتہ وار طلوعِ اسلام میں بھی اور ماہوار شماروں میں بھی متواتر اس آگ میں برسوں ایندھن ڈالتا رہا، تاکہ اس الاؤ کو نہ صرف یہ کہ بجھنے نہ دیا جائے بلکہ اسے دائماً بھڑکائے رکھا جائے، اور ساتھ ہی اپنی ''قرآنی بصیرت'' کا مظاہرہ، اس پیشین گوئی کے ذریعہ کیا:

''آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کبھی متعین طور پر یہ نہیں بتائیں گے (نہ مودودیؒ صاحب اور نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث و سنت کی پوزیشن کیا ہے۔''●

لیکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی مراسلت کے جواب میں، مولانا مودودیؒ نے غیر مبہم، ٹھوس اور مسکت دلائل کے ساتھ، طویل قلمی مناظرہ کے ذریعے، ''مفکرِ قرآن'' کی اس پیشین گوئی کو جھوٹا ثابت کر ڈالا جسے وہ اپنی ''قرآنی بصیرت'' کا آئینہ دار کہنے کے خوگر تھے، لیکن

● طلوعِ اسلام، ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۲ ● طلوعِ اسلام، ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۸

دوسری طرف، منکرینِ حدیث کے بارے میں، خود مولانا مودودیؒ نے اپنی خداداد فراست کی بنا پر جو پیشگی خبر دی تھی، وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، یہ پیشگی خبر، درج ذیل اقتباس میں موجود ہے جسے خود طلوعِ اسلام نے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے:

"برکت علی محمڈن ہال میں، حدیث کی اہمیت، سنت اور حدیث کے فرق، ان کے باہم تعلق اور فتنۂ انکارِ حدیث پر، اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، مولانا مودودیؒ نے فرمایا کہ ہماری مخالفت کرنے والے لوگ ایسے اخلاقی نامرد ہیں کہ سامنے آ کر دلائل سے بات کرنے کی بجائے، بھونڈے طریقوں سے مخالفانہ جدوجہد شروع کیے ہوئے ہیں، اگر ان کے پاس دلائل سے قائل کرنے کی ہمت ہوتی تو یہ لوگ کھل کر سامنے آتے، ہماری بات سنتے اور اپنی سناتے، اپنی بات پیش کرتے اور ہمارے لٹریچر کو پیش کرنے کا موقع دیتے، لیکن انہیں خطرہ ہے کہ لوگ اگر یہ لٹریچر پڑھ گئے تو ہمارے فتنے نہ چل سکیں گے۔" ●

چنانچہ مولانا مودودیؒ کی یہ بات حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی کہ منکرینِ حدیث، ان کی کوئی بات بھی قارئینِ طلوعِ اسلام تک نہیں پہنچنے دینا چاہتے تاکہ ان کے فتنے برپا کرنے کی راہ مسدود نہ ہونے پائے۔

اور فی الواقعہ یہ ہے بھی حقیقت، کہ اگر طلوعِ اسلام کا کوئی سلیم الفطرت قاری، مولانا مودودیؒ کا لٹریچر پڑھ لے تو طلوعِ اسلام کے موقف کی کمزوری، اس پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

ایک سلیم الفطرت جویائے حق کو طلوعِ اسلام کی ڈانٹ:

ایسے ہی کچھ سلیم الفطرت قاری حضرات تھے جو طلوعِ اسلام، ترجمان القرآن اور بعض دیگر رسائل کا تقابلی مطالعہ کیا کرتے تھے، وہ یک طرفہ مطالعہ پر رائے قائم کرنے کو نامناسب بلکہ خلافِ عدل و انصاف جانتے تھے، انہوں نے مولانا مودودیؒ اور ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے خلاف، طلوعِ اسلام کی مہمل موشگافیوں، مجادلانہ بحثوں اور بے جا خوردہ گیریوں

● بحوالہ طلوعِ اسلام، ۱۲ مئی ۱۹۵۵ء صفحہ ۵

کے دائی تکرار واعادہ کو دیکھتے ہوئے طلوع اسلام کو ایک مشورہ دینا چاہا، لیکن پرویز صاحب نے انہیں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا کہ تمہاری ذہنی سطح پست ہے، تم جو چاہو، پڑھو، لیکن طلوع اسلام کا مطالعہ چھوڑ دو۔ چنانچہ پرویز صاحب خود، اس موعظت کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

"آپ جو جی میں آئے پڑھیے، لیکن طلوع اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں، آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوع اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں، میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں، اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے...... نیک نیتی سے ایسا کہتے ہیں تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔" ●

طلوع اسلام کے نزدیک، صرف وہ شخص ہی ذہنی طور پر بلند سطح کا آدمی ہے جو طلوع اسلام کا یک رخا مطالعہ کر کے، طلوع اسلام کا حامی اور اسکے مخالفوں کا دشمن بن جائے، کیونکہ صرف اُسی کی دعوت ہی "قرآنی دعوت" ہے، رہے وہ لوگ، جو کتاب اللہ کے ساتھ بھیجے جانے والے، رسول اللہ کی سنت کی طرف بھی دعوت دیتے ہیں تو ایسے لوگوں کی دعوت "غیر قرآنی دعوت" ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پرویز صاحب کو ایسے متبعین درکار ہیں جو طلوع اسلام کا یا خود اُن کے لٹریچر کا یک طرفہ مطالعہ کر کے، ہر اُس جماعت کے خلاف اپنے دلوں میں کینہ اور کدورت پیدا کر لیں جسکے خلاف ایسا کرنا، طلوع اسلام نے اپنا فریضۂ زندگی بنا رکھا ہے، آزاد اور کھلا مطالعہ کرنے والے لوگ، ان کے نزدیک، پست سطح کے لوگ ہیں اور طلوع اسلام کے خول میں بند ہو کر، یک رخا مطالعہ کرنے والے لوگ ہی پسندیدہ افراد اور ذہناً بلند سطح کے لوگ ہیں، اس لیے وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے قارئین کے سامنے، تصویر کا وہ رُخ بھی آئے جسے دکھانا، اُسے مطلوب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے حدیث وسنت کے متعلق اس علمی مباحثے میں، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط کو تو یک طرفہ طور پر شائع کر دیا لیکن مولانا مودودیؒ کا کوئی

● طلوع اسلام نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۵

جواب، صرف اس لیے شائع نہ کیا کہ کہیں طلوع اسلام کے قارئین اس سے مثبت اثر نہ لے پائیں اور جن قارئین طلوع اسلام نے "ترجمان القرآن" کے ذریعہ مولانا مودودیؒ کے جوابات کو دیکھا، وہ فی الواقعہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور انکار حدیث کے جس مسلک پر، طلوع اسلام کے یک طرفہ مطالعہ نے، انہیں قائم کر رکھا تھا، اُس سے انہوں نے خود کو ذہناً سرکتے ہوئے پایا، کیونکہ مولانا مودودیؒ کے مدلل جوابات نے، ان کے قلوب واذہان میں، بقول طلوع اسلام، "بہت سی غلط فہمیاں" پیدا کر ڈالی تھیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

"مودودی صاحب کا جواب، دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، اور اسکے بعد ترجمان القرآن میں اس موضوع کے متعلق کچھ سامنے نہ آیا، اس پر لوگوں کی جانب سے پھر اصرار ہوا کہ مودودی صاحب کے جواب نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں اور ڈاکٹر صاحب خاموش ہیں، اس لیے طلوع اسلام کے لیے ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرے۔" ❶

چنانچہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے، پوری مراسلت کو، مولانا مودودیؒ کے جوابات کے ساتھ شائع کرنے کی بجائے، طلوع اسلام نے یک طرفہ طور پر صرف اُس خط ہی کو شائع کیا جو ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے مولانا مودودیؒ کو مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو لکھا تھا، جبکہ مولانا مودودیؒ نے دونوں طرف کی پوری مراسلت کو ترجمان القرآن میں شائع کیا، اور پھر اس رسالہ کے خاص نمبر (منصب رسالت نمبر، ستمبر ۱۹۶۱ء) میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری خط بھی مولانا مودودیؒ کے جواب کے ساتھ شائع کر دیا گیا جس میں منکرین حدیث نے اپنے تمام "علمی دلائل" کے ساتھ، اپنے "اخلاقی فضائل" کو بھی جمع کر دیا تھا، اس کی اشاعت پر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا:

"ذیل میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری عنایت نامہ درج کیا جا رہا ہے جو ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو انہوں نے ارسال کیا تھا، اس خط کو پڑھ کر ہر صاحب ذوق سلیم یہ

---

❶ طلوع اسلام اپریل ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰

سوال کرے گا کہ اس تحریر کو شائع ہی کیوں کیا گیا، لیکن جس مقصد کی خاطر اس گندگی میں ہاتھ ڈالا گیا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ منکرین حدیث کے سارے دلائل و مسائل، ان کی اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے آ جائیں اور پھر اس کا واضح جواب دے کر اس گمراہی کا سدباب کر دیا جائے جو یہ لوگ عوام اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں پھیلا رہے ہیں، اسی لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ خط یہاں جوں کا توں درج کیا جا رہا ہے تا کہ منکرین حدیث، اپنے دلائل اور اپنے اخلاقی فضائل، دونوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے آ جائیں۔ یہ خط جس انداز میں لکھا گیا ہے اس کی بنا پر جواب میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنا تو پسند نہیں کیا گیا البتہ اس میں جو جو باتیں قابل لحاظ اور زیر بحث مسائل سے متعلق ہیں، ان سب کا جواب ناظرین کی تشفی کے لیے حواشی میں دے دیا گیا ہے تا کہ ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا جائے۔

اس خط کے معاملہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت کا ایک عجیب مظاہرہ یہ بھی فرمایا ہے کہ پچھلی تمام مراسلت کو چھوڑ کر تنہا یہی ایک خط، پہلے ''چٹان'' میں اور پھر اپریل ۱۹۶۱ء کے ''طلوع اسلام'' میں شائع کرا دیا، حالانکہ ابتداءً، انہوں نے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس سلسلے کی پوری مراسلت شائع فرمائیں گے، اس طرح کی باتیں دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کتنی ہی معیوب ہوں مگر منکرین حدیث کے تو شایان شان ہی ہیں۔''●

طلوع اسلام...... آئینہ دیانت کے مقابل:

ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مولانا مودودیؒ کے درمیان، سنت کی آئینی حیثیت پر طویل مراسلت نے، خود طلوع اسلام ہی کی ایک عبارت کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا ہے، ملاحظہ فرمائیے یہ آئینہ:

ہم المنیر اور اس کی وساطت سے عبدالغفار حسن صاحب سے ایک مرتبہ پھر تقاضا

● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳۳

کریں گے کہ اگر ان میں دیانت داری کا کوئی شائبہ بھی ہے تو وہ ہمارے مقالہ کو من وعن اپنے ہاں شائع کریں اور پھر اس پر جس قدر بھی جی چاہے تنقید کریں، اگر اس سے ہم پر اپنی کوئی غلطی واضح ہوگئی تو ہم ان کے شکریہ کے ساتھ اپنی اصلاح کر لیں گے۔" ❶

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ جس مقالے پر تنقید کرنا مقصود ہو، اسے من وعن پیش کرنا اور پھر اس پر نقد کرنا، دیانت داری کا تقاضا ہے۔ لیکن کیا سنت کی آئینی حیثیت کی اس بحث میں طلوع اسلام نے اس تقاضائے دیانت داری کو ملحوظ رکھا؟...... ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے، جبکہ مولانا مودودیؒ نے منکرینِ حدیث کے تمام خطوط کو اور اس مسئلہ کی پوری بحث کو من وعن شائع کیا اور پھر ٹھوس دلائل کے ساتھ نہایت جان دار تنقید کر کے ان کی اغلاط کو واضح کیا، لیکن منکرینِ حدیث نے نہ تو مولانا مودودیؒ کا شکریہ ہی ادا کیا اور نہ خود اپنی اصلاح ہی کی، بلکہ مولانا کی اس تنقید نے ان پر وہی اثر کیا جو نزولِ قرآن نے مشرکینِ عرب کی ذہنیتوں پر کیا تھا: ﴿ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ﴾

نیز اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وعدہ وفائی کے "قرآنی اخلاق" سے یہ لوگ، کس قدر آراستہ ہیں۔

عبارتوں میں خیانت کاری کی مثالیں:

مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں سے، سیاق وسباق سے اکھاڑی ہوئی متفرق عبارتوں کو کتر بیونت کے بعد، ۲؍ اپریل ۱۹۵۵ء کے طلوع اسلام میں "قرآن وحدیث کی صحیح پوزیشن" کے زیر عنوان جب شائع کیا گیا تو ساتھ ہی "چور کی داڑھی میں تنکا" کے مصداق، یہ اعلان بھی بڑے وثوق کے ساتھ کیا گیا:

"جماعت اسلامی والے کہیں گے کہ یہ اقتباسات، مودودی صاحب کی تحریروں سے توڑ مروڑ کر لکھ دیے گئے ہیں، اس کے جواب میں ہم آپ سے صرف اتنا عرض

---

❶ طلوع اسلام، ۲۴؍ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰، ۱۱، صفحہ ۱۲

کریں گے کہ ان کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان خود کر لیجیے کہ یہ اقتباسات، سیاق وسباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں، سچ اور جھوٹ خود سامنے آ جائے گا۔"❶

اور فی الواقعہ، سچ اور جھوٹ، اُس وقت سامنے آ گیا، جب انہی اقتباسات میں سے بھی اور دیگر تحریروں میں سے بھی کچھ عبارتیں، مولانا مودودیؒ کے سامنے، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے پیش کیں اور مولانا نے متعدد مقامات پر یہ واضح کیا کہ کس طرح ان عبارات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر، قطع و برید کا نشانہ بنا کر، خود ان عبارتوں کے مصنف ہی کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی، مولانا مودودیؒ کے مندرجہ ذیل اقتباسات منکرینِ حدیث کی ایسی ہی تحریفی چالبازیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

پہلی مثال:

ڈاکٹر عبدالودود صاحب، مولانا مودودیؒ کا ایک تحریف شدہ اقتباس یوں پیش کرتے ہیں کہ درمیان میں سے ایک پورے جملے کو حذف کر ڈالتے ہیں، مولانا مودودیؒ نے اس خیانت کا پردہ یوں چاک کیا ہے:

> "اس کے بعد، ایک پورا فقرہ، ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور آگے کی عبارت اس طرح نقل کی ہے جس سے شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی عبارت چھوڑی گئی ہے۔"❷

دوسری مثال:

ایک اور اقتباس کے ضمن میں، جسے ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے پیش کیا تھا، مولانا مودودیؒ پھر اسی قسم کی حرکت پر شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "بیچ میں پورے ڈیڑھ صفحہ کی عبارت چھوڑ کر، یہ فقرہ آگے کے ایک مقام سے نقل کیا گیا ہے مگر کوئی علامت یہاں بھی ایسی نہیں دی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس جگہ

❶ طلوع اسلام، ۲۳ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۳ ❷ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳۳

کوئی چیز چھوڑ دی گئی ہے، طوالت سے بچنے کے لیے میں ان چھوٹے ہوئے فقروں کو نقل نہیں کرتا، میری کتاب ''تفہیمات'' ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس موجود ہے اور اس کا مضمون ''اتباع و اطاعت رسول'' خود نکال کر دیکھ سکتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ایک شخص کے سامنے خود اس کی تحریروں کو قطع و برید کے ساتھ پیش کرنے سے نہیں چوکتے وہ دوسروں کو دھوکہ دینے میں کتنے بے باک ہوں گے۔''❶

تیسری مثال:

ایک اور مقام پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب پھر اسی قسم کی ایک اور حرکت کرتے ہیں، اس پر مولانا مودودی تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمایئے کہ اس کے بعد کے فقرے دانستہ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ جن اصحاب کے پاس رسائل و مسائل حصہ اول موجود ہو، وہ نکال کر دیکھ لیں، اس فقرے کے بعد متصلاً یہ عبارت موجود ہے، ''جو سنتیں تواتر کے ساتھ، نبی ﷺ سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات، محدثین کی مسلمہ شرائط تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ یقیناً ناقابل انکار حجت ہیں، لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے، اس وجہ سے علماءِ اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات، احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات (یعنی جن سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے) کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔''

یہ اخلاقی جرأت واقعی قابل داد ہے کہ مجھے خود میری ہی عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے، اس پر مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس مسئلے کو یہاں بھیس بدل کر پیش کیا جا رہا ہے اس پر میں خود اسی مراسلت کے سلسلہ میں تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحات ۲۸ تا ۳۲، ۳۹، ۴۰) لیکن یہ عجیب طرز

❶ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ [illegible]

بحث ہے کہ جس بات کا پہلے جواب دیا جا چکا ہو، اسے پھر نئے لباس میں پیش کر دیا جائے، اور پچھلے جواب کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔"●

چوتھی مثال:

اثناءِ مراسلت، ایک اور مقام پر، ڈاکٹر عبدالودود صاحب، اپنے قطع و برید کے فن کا مظاہرہ فرماتے ہیں، اس پر مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"اس کے بعد کا فقرہ، ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر، خود دیکھ سکتا ہے کہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا ہے، وہ فقرہ یہ ہے۔

اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہو گا مگر فروعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہو گا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔"●

پانچویں مثال:

ایک اور مقام پر ڈاکٹر صاحب، مولانا ئے محترم کا ادھورا اقتباس پیش کر کے، اس کا آخری حصہ چھوڑ دیتے ہیں، اس پر مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد کی پوری بحث چونکہ ڈاکٹر صاحب کے شبہات کا جواب تھی اور ان سے الجھن رفع ہو سکتی تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں تو الجھن ہی کی تلاش ہے، ایک مضمون میں جتنے فقرے الجھنے اور الجھانے کے لیے مل سکتے ہیں، انہیں لے لیتے ہیں اور جہاں سے بات سلجھنے کا خطرہ ہوتا ہے صاف کترا کر نکل جاتے ہیں اور لطف یہ کہ یہ دھوکہ، ایک مصنف کی کتاب سے خود مصنف کو دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ اگر تفہیمات حصہ اول، انہیں بہم پہنچ جائے تو اس میں سے "حدیث کے متعلق چند سوالات" کے

● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷ ● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۰

زیرعنوان وہ پورا مضمون نکال کر ملاحظہ فرمالیں، جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے فوراً بعد، جو فقرے میں نے لکھے تھے وہ یہاں بھی نقل کر دیے جائیں تاکہ جنہیں اصل کتاب نہ مل سکے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کرتب کی داد دے سکیں۔ وہ فقرے یہ ہیں .... ❶

چھٹی مثال:

ایک اور جگہ، ڈاکٹر صاحب، مولانا محترم کی ایک عبارت کو، سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں، تو مولانا مودودیؒ یہ فرماتے ہیں:

''ایک معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ بحث کے موڈ میں نہ ہو کہ جہاں تعبیرِ قانون اور قانون سازی کا معاملہ زیرِ بحث ہو، وہاں اکثریت سے مراد اہلِ علم کی اکثریت ہوتی ہے نہ کہ عوام کی اکثریت۔ میری کتاب ''سیاسی کشمکش'' کی جن عبارتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے، ان میں قانون سازی کا مسئلہ زیرِ بحث نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے عام قومی امراض پر گفتگو تھی، ان عبارات کو لاکر ڈاکٹر صاحب، اس بحث میں استعمال فرما رہے ہیں جو خالص قانونی مسائل کے متعلق ہو رہی ہے، یہ خلطِ مبحث نہیں تو اور کیا ہے؟'' ❷

ساتویں مثال:

ایک اور مقام پر، ڈاکٹر صاحب، مولانا مودودیؒ پر تہمت طرازی اور بہتان تراشی کے فن کا مظاہرہ فرماتے ہیں مولانا نے محترم نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں یہ استفسار کرتے ہوئے، یوں تردید فرماتے ہیں:

''کیا کوئی شخص، میری کسی تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں، مَیں نے یہ کہا ہو کہ قانونی مسائل میں رائے دینے والے اہلِ علم صرف وہی صالح (Competent)

❶ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۱ ❷ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۶۹

مانے جائیں گے جو میری ہاں میں ہاں ملائیں؟'' ❶

آٹھویں مثال:

ایک اور جگہ، ڈاکٹر صاحب، دیانت اور صداقت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، مولانا مودودیؒ کی عبارت کو کتر بیونت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اس پر مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

''یہ تمام عبارات، میری کتاب سے خوب قطع و برید کے بعد پیش کی گئی ہیں، جن حضرات کو ''تجدید و احیاء دین'' کے مطالعہ کا موقع مل جائے، وہ براہ کرم اس کا وہ حصہ نکال کر دیکھ لیں جو اس کے پہلے باب میں ذیلی عنوان ''جاہلیت کا حملہ'' کے تحت درج ہے، اس تقابل سے ان کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ حضرات دوسروں کی عبارتیں نقل کرنے میں کس درجہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ کتاب کے صفحات کا حوالہ، خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے لیا ہے، قدیم ایڈیشن میں یہ بحث صفحہ ۲۳ تا ۲۵ پر ہے اور جدید ایڈیشن میں صفحہ ۳۶ تا ۴۱ پر۔'' ❷

نویں مثال:

سیاق و سباق سے عبارات کو کاٹ کر، جب پھر ڈاکٹر صاحب اپنے کرتب کا مظاہرہ فرماتے ہیں تو مولانا مودودیؒ کو پھر یہ کہنا پڑا:

''میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے سہارا لیا ہے، ان کو نقل کرنے میں، پھر وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے، ایک فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکال کر اپنا مطلب برآمد کر لیا گیا۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی تھی وہ یہ ہے کہ:.......... ❸

دسویں مثال:

ایک اور مقام پر ڈاکٹر صاحب، پھر سید مودودیؒ کا ادھورا اقتباس پیش کرتے ہیں، اور

---

❶ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۲۲ ❸ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۹۷

❷ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۸۰

مولانا نے محترم ان کی بار بار کی ایسی حرکتوں پر نہایت صبر و سکون سے صرف یہ فرماتے ہیں۔

اس کے بعد کا فقرہ جسے ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے، یہ ہے:

"پس قرآن کی رو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون، پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے: ولی الامر کا اجتہاد۔

﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾ ...... ❶

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ:

یہ دس مثالیں ہیں جو اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ منکرین حدیث، دوسروں کے اقتباسات کو پیش کرنے میں کس قدر دیانت، صداقت، امانت اور عدالت سے کام لینے کے عادی ہیں، ایک مقام پر تو مولانا مودودیؒ، ان لوگوں کی ایسی جسارتوں پر بے بس ہو کر، یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے:

"مجھے شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں مگر اب کس کی کیا شکایت کی جائے، جو لوگ، اللہ تعالیٰ کی بات کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اس قدر بے باک ہوں ان کے سامنے ما و شما کی کیا ہستی ہے۔" ❷

یہ تھی وہ مہم، جو قیام پاکستان کے بعد، طلوع اسلام نے، حدیث و سنت کے خلاف بڑے زور شور سے برپا کیے رکھی، اور یہ تھی وہ مراسلت جو بزم طلوع اسلام کے ایک نمایاں فرد (ڈاکٹر عبدالودود صاحب) نے، بظاہر علمی تحقیق کی آڑ میں، لیکن حدیث رسول اور سنت نبی کو ساقط الاعتبار ٹھہرانے کے لیے محض اس امید پر جاری کی کہ اس خط و کتابت میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب، کسی عالم دین سے بن ہی نہیں پڑے گا، جیسا کہ فتنۂ انکار حدیث کے علم بردار، لوگوں کے قلوب و اذہان پر، علماء کرام کی علمی بے بضاعتی کے مقابلہ میں، خود اپنی علمی دھاک کا سکہ بٹھانے کے لیے، اس قسم کے اعلانات کیا ہی کرتے تھے:

---

❶ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۹۳ ❷ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۱۵

"ہمارا ملا، طلوع اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لیے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے، اور ملا بیچارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے) اس لیے ملا نے اس کے خلاف گوئرنگ کا حربہ استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے، اس نے یہ مشہور کر دیا کہ طلوع اسلام منکرِ حدیث ہے۔"●

ضمناً:

یہاں طلوع اسلام کا مبلغ علم ملاحظہ فرمایئے کہ جس حربے کو ملا کی طرف منسوب کر رہا ہے، وہ گوئرنگ کا نہیں، بلکہ گوئبلز کا مقولہ ہے لیکن طلوع اسلام، اسے گوئرنگ کے حوالہ سے پیش کر رہا ہے۔ خیر! یہ ایک ضمنی بات ہے جو سرِ راہ نوکِ قلم پر آ گئی۔

طلوع اسلام کو یہ امید نہ تھی کہ علماء کرام میں سے، کسی کی طرف سے، ان کے چھیڑے ہوئے سوالات کا جواب دیا جائے گا، لیکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، ان سوالات کا مردانہ وار سامنا کیا اور ایسے عالمانہ جوابات دیئے جو پیاسے کی سیرابی اور بیمار کی شفایابی کا ذریعہ بنے، مگر منکرینِ حدیث پر، اس کا وہی اثر ہوا جو شور یلی اور کلراٹھی زمین پر بارانِ رحمت کا ہوا کرتا ہے یعنی ﴿ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ اس طرح، فتنۂ انکارِ حدیث کے علم برداروں کی پوری سکیم، خود ان پر الٹ پڑی، جیسا کہ مودودیؒ صاحب نے، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو، خود لکھا تھا:

> "پھر آپ اپنی اس بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ میرے جوابات سے آپ کی الجھنیں اور بڑھ گئی ہیں، مجھے بھی اس کا افسوس ہے مگر ان الجھنوں کا منبع کہیں باہر نہیں، آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے یہ مراسلت واقعی "بات سمجھنے" کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات، سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آ جاتی، لیکن آپ کی تو اسکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات، میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ، کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی، اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے اور ان کا ایک مجموعہ شائع کر کے یہ پراپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ علما

● طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۴ء، صفحہ ۶۷

سنت سنت تو کرتے ہیں مگر وہ عالم بھی سنت کے بارے میں متفق رائے نہیں رکھتے۔

وہی تکنیک جس کا ایک شاہکار ہمیں منیر رپورٹ میں ملتا ہے۔ اب میرے جوابات سے، آپ کی یہ اسکیم آپ ہی کے اوپر الٹ پڑی ہے، اس لیے سمجھانے کی جتنی کوشش بھی میں کرتا جاتا ہوں، آپ کی الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے، اس نوعیت کی الجھن کا آخر میں کیا علاج کر سکتا ہوں، اس کا علاج تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے، حق بات کو سمجھنے اور ماننے کی مخلصانہ خواہش اپنے اندر پیدا کیجئے اور ایک مسلک خاص کے حق میں پراپیگنڈہ کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی فکر چھوڑ دیجئے، اس کے بعد، ان شاء اللہ، ہر معقول بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔"●

الغرض، اس طرح اور اس مراسلت کے ذریعہ، مولانا مودودیؒ نے منکرین حدیث کے غبارۂ استدلال کی ساری ہوا نکال دی، اور منکرین حدیث کے اپنے قلم سے بیان کردہ دلائل کا بسکت، وافی کافی اور شافی جواب دے کر ان کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا یہ سدباب، ستمبر ۱۹۶۱ء کے مجلہ ترجمان القرآن میں کیا گیا۔

دوسری مثال...... طلوعِ اسلام کا خط اور جواب:

تاریکی میں پلنے والی خفاش کو، نہ تو خود اپنے لیے روشنی پسند ہے، اور نہ ہی اپنے "ہم قبیلہ" افراد کے لیے۔ اس لیے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہم جنسوں تک روشنی نہ پہنچے۔ طلوعِ اسلام نے خود، اس امر کا ثبوت، اُس واقعہ کے ذریعہ بہم پہنچا دیا جس کی تفصیل، یہاں پیش کی جارہی ہے۔

ماہنامہ محدث نے میرا ایک مقالہ "اشتراکیت کی درآمد...... قرآن کے جعلی پرمٹ پر" دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں، مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔

"پاکستان کی مذہبی فضا میں، غلام احمد پرویز، ایک ایسی شخصیت واقع ہوئے ہیں،

● ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۱۰ تا صفحہ ۱۱۱

جس نے اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش میں، مغربی افکار و اقدار کو اصل قرار دے کر، قرآن کے نام پر، اجتہادی قینچی سے، اسلام کی کتر بیونت میں وہ کچھ کیا ہے، جو پاکستان میں کوئی اور شخص نہیں کر سکا، یہاں تک کہ، اشتراکیت کو من وعن قبول کر کے، اسے عین اسلام ثابت کرنے کے لیے، قرآن کریم کو جس طرح عمر بھر تختۂ مشق بنائے رکھا، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ پرویز صاحب نے مارکسزم (Marxism) کو، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرنے کے لیے، قرآنی تعلیمات میں، مسخ و تحریف کی راہ میں، جو کوشش کی ہے، پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب نے، اس کا خوب جائزہ لیا ہے، انہوں نے اس طویل جائزے میں اس امر کو بے نقاب کر دیا ہے کہ پرویز صاحب نے کس طرح تصریف آیات کے نام پر صرفِ آیات سے کام لیا ہے، اور محاوراتِ عرب کی پابندی کے التزام کا دعویٰ کر کے، کس طرح اس سے گریز کیا ہے، اور قرآنی الفاظ کے قطعی ہونے کی دہائی دے کر کس طرح ان الفاظ میں، اپنے خودساختہ معانی داخل کیے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے یہ جائزہ، منکرین حدیث کی مخصوص ذہنی ساخت کے پیش نظر صرف قرآن کریم کی روشنی میں لیا ہے۔ اس ماہ سے ہم ماہنامہ محدث میں، اس جائزے کو بالاقساط پیش کر رہے ہیں...... ادارہ۔ ❶

میرا یہ مقالہ، سات اقساط پر مشتمل تھا، جس میں پہلی قسط کا ذیلی عنوان "ملکیتِ اراضی...... اور...... قرآن مجید" تھا۔ اس میں، میں نے پرویز صاحب کے دلائل کا جائزہ، صرف اور صرف قرآن کی اساس پر لیا تھا اور ان کے موقف کی لغویت کو واضح کر دیا تھا، پہلی ہی قسط کو دیکھ کر، طلوع اسلام کو اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، اضطراب و سراسیمگی کی کیفیت میں، قلم اٹھایا اور مجلہ محدث کے مدیرِ اعلیٰ کو مندرجہ ذیل خط لکھ ڈالا۔

---

❶ ماہنامہ محدث، دسمبر ۱۹۹۸ء، صفحہ ۴۹

محترم حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب

مدیر ماہنامہ "محدث" لاہور،

۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور،

السلام علیکم، مزاج بخیر!

کتاب وسنت کی روشنی میں آزادانہ بحث وتحقیق کا حامی، علمی، اصلاحی، عناد اور تعصب سے پاک، ملتِ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ "محدث" بابت دسمبر ۱۹۸۸ء نظر سے گزرا، قطع نظر اس کے کہ رسالہ میں شامل مضامین کس حد تک ماہنامہ کے اس مخصوص طرزِ فکر کے غماز ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اتنے اوصاف کا مالک یہ ماہنامہ امانت، دیانت اور شائستگی کا یہ سبق کیوں بھول گیا۔

ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ تا ۵۸ پر، پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کا ملکیتِ زمین پر بظاہر تحقیقی مقالہ شامل اشاعت کیا گیا ہے جس میں محترم قاسمی صاحب نے غلام احمد پرویز مرحوم کے استدلال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ اختلاف، دنیا جانتی ہے کہ نیا نہیں، اور نہ ہی غلام احمد پرویز وہ واحد شخصیت ہیں، جو زمین کو متاعِ بندہ اور ملکِ خدا سمجھتے ہیں، لیکن تحقیق وتنقید کی آڑ میں کردار کشی کے لیے مقالہ نگار نے پرویز ہی کو لاوارث جانا۔ فرماتے ہیں پرویز کہتا ہے:

"جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ اسلام کے معاشی نظام سے متماثل ہے"

لیکن اس کتاب میں جابجا درج پرویز مرحوم کے یہ الفاظ انہیں نظر نہیں آئے کہ: ....." اس میں شبہ نہیں کہ کمیونزم میں بھی ذاتی ملکیت کی نفی ہوئی ہے، لیکن صرف اتنی سی بات سے کمیونزم جیسا خلافِ اسلام تصورِ حیات، اسلام تو نہیں بن سکتا۔ کمیونزم اور اسلام تو دو متضاد عناصر ہیں، جو کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کمیونزم، نہ خدا کی قائل ہے، نہ کائنات اور انسانی زندگی کے کسی مقصد کی، نہ وہ وحی کو مانتی ہے نہ مستقل اقدار کو۔ نہ وہ انسانی ذات کی قائل ہے، نہ مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کی۔ نہ وہ قانونِ مکافات کو تسلیم کرتی ہے، نہ اسکے غیر متبدل اصولوں کو۔"

اپنی کتاب "نظام ربوبیت" میں، جس کا ایک ایک لفظ فاضل مقالہ نگار نے پڑھا ہے، یہ کچھ لکھنے کے بعد، پرویز قوم کو دعوت دیتے ہے کہ ... "آپ سوچئے! کہ ایک ایسے نظامِ زندگی کو جو ان تمام اقدار کے انکار پر مبنی ہو، اسلام سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ نے ۳۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب میں سے، ایک جملہ اچک کر فتویٰ صادر فرما دیا کہ پرویز اشتراکیت کو عین اسلام قرار دیتا ہے۔ یہی کچھ فاضل مقالہ نگار نے اللہ کی کتاب کے ساتھ کیا ہے اور پھر وہی بدنام زمانہ گھسے پٹے جملے، پرویز منکر حدیث ہے، بے شرم ہے، بے حیا ہے۔" ..... دعوت آپ کی اس کے باوجود یہ ہے کہ اگر آپ منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو "محدث" کا مطالعہ کیجئے۔ معلوم نہیں "محدث" کے قارئین، آپ کے اس طرزِ عمل کو، کتمانِ حقیقت کہیں گے یا تجاہلِ عارفانہ! لیکن ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ طریقۂ واردات، اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ علم و آگہی کی دنیا میں، پرویز اب اتنا اجنبی بھی نہیں کہ جو چاہا توڑ مروڑ کر، اس کے نام "منسوب ❶" کر دیا۔ کسی بحث میں الجھے بغیر، ہماری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ تنقید بغرض پردہ پوشی نہ تبلیغ دین ہے، نہ نشر و اشاعتِ اسلام۔ پرویز نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے پیش کیا ہے وہ سہو و خطا سے منزہ اور حرفِ آخر ہے۔ اس کی یہ گزارش آپ کو اس کتاب میں بھی ملے گی کہ "اگر اربابِ فکر و نظر کو اس تجزیہ حالات میں کوئی سقم نظر آئے، تو اس کی نشان دہی کے لیے، میں ان کا شکر گزار ہوں گا" ۔ لہٰذا خدارا، ایسی زبان استعمال نہ کیجئے جس کو اپنانا ہم وابستگانِ دامنِ قرآنی کے بس میں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ، ہم سب کو صحیح سوچنے، صحیح سمجھنے اور صحیح لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ویسے جرأتِ کردار اور صحافتی دیانت کا تقاضا ہے کہ آپ ہماری ان معروضات کو بھی "محدث" میں جگہ دیں۔ گو تجربہ شاہد ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔

مورخہ ۲/۸۸/ ۲۷ والسلام

نیاز مند

محمد لطیف چوہدری، ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور

---

❶ جلی الفاظ ہے "منسوب" موصوف کی علمی استعداد ملاحظہ فرمائیے۔

مدیر اعلیٰ، حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب نے، اس خط کی ایک نقل مجھے ارسال فرمادی، چونکہ میں خود مقالہ نگار تھا، اس لیے مناسب یہی تھا کہ، اس خط کا جواب، میں ہی قلم بند کرتا، چنانچہ میں نے مندرجہ ذیل مکتوب، جواباً ارسال کیا۔

مکرمی ومحترمی جناب محمد لطیف چوہدری صاحب

ناظم ادارہ طلوع اسلام، لاہور۔

سلامِ مسنون۔ مزاج بخیر!

آپ کی طرف سے ۲۷ دسمبر ۱۹۸۸ء کو مدیر ماہنامہ "محدث" کے نام لکھا جانے والا خط مجھے بھیج دیا گیا۔ کیونکہ جس مقالہ "اشتراکیت کی درآمد قرآن کے جعلی پرمٹ پر" کو آپ نے ہدفِ اعتراض بنایا ہے وہ میں نے ہی لکھا تھا، اس لیے آپ کے مکتوب کی جواب دہی کے لیے میں خود حاضرِ خدمت ہوں۔

(۱) یہ درست ہے کہ پرویز صاحب نے اشتراکیت کے معاشی نظام اور قرآن کے معاشی نظام کو باہم متماثل قرار دینے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:...... "کمیونزم اور اسلام دو متضاد عناصر ہیں، جو کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کمیونزم نہ خدا کی قائل ہے، نہ کائنات اور انسانی زندگی کے کسی مقصد کی۔ نہ وہ وحی کو مانتی ہے، نہ مستقل اقدار کو۔ نہ وہ انسانی ذات کی قائل ہے، نہ مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کی۔ نہ وہ قانونِ مکافات کو تسلیم کرتی ہے، نہ اس کے غیر متبدل اصولوں کو"......

اب اسلام اور اشتراکیت کو باہم متماثل قرار دینے کے بعد، یہ راگ الاپنا کہ اشتراکیت، خدا، وحی اور آخرت وغیرہ کی منکر ہے اور اسلام ان امور کو اساسی طور پر مانتا ہے، پانی میں مدھانی چلانے کے مترادف ہے۔ جو چیز اصلاً قرآن کے خلاف ہے اسے داخلِ اسلام کر کے اس کے ساتھ عقائدِ اسلام کو نتھی کر دینا، خود فریبی بھی ہے اور فریب دہی بھی۔ جس طرح اشتراکیت کا معاشی نظام اپنی عین اصل کے مطابق تعلیماتِ قرآن کے خلاف ہے بالکل اسی طرح کیپٹلزم کا سودی نظام بھی خلافِ اسلام اور خلافِ قرآن ہے۔ پس جس طرح سودی نظام کو اختیار کرنے

کے بعد، خدا، وحی اور آخرت (یابقول آپ کے وحی، مستقل اقدار اور قانونِ مکافات وغیرہ) کے عقائد کا قبول کر لینا سودی نظام کو سندِ جواز عطا نہیں کرتا، بالکل اسی طرح اشتراکیت کے معاشی نظام کو اپنا کر اسلامی عقائد کا اعتراف بھی اسے جائز اور درست نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا اشتراکیت کی بنی بنائی عمارت کی اسفل ترین تہوں میں سے انکارِ خدا اور کفرِ آخرت کی اینٹوں کو نکال کر، اس کی بنیاد میں خدا اور رسول اور وحی و آخرت کے عقائد کو اساسی اینٹوں کے طور پر رکھ دینا، اسے اسلامی تہذیب و تمدن کی عمارت میں تبدیل نہیں کر سکتا، کیونکہ عمارت کا نقشہ، مقصد، رُخ، ڈیزائن اور اس کی سمت وغیرہ سب پہلے ہی سے اشتراکی نقطۂ نظر سے طے شدہ ہے۔ البتہ اس کاروائی سے اشتراکیت جیسے دہریانہ اور ملحدانہ نظام کو ایک ایسی جونک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو عقائدِ اسلام کا خون چوس چوس کر پلتی رہے۔ لیکن آپ لوگ ہیں کہ اشتراکیت کے ساتھ عقائدِ اسلام کا ضمیمہ منسلک کر کے اسے مشرف باسلام کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ ہم بہرحال اس بات سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں کہ اشتراکیت + خدا = اسلام، جیسی مساوات کی آڑ میں کفر و اسلام کا ملغوبہ تیار کریں۔ بہرحال، اشتراکیت اور اس کا شخصی ملکیت کی نفی کا تصور، بنیادی طور پر خلافِ قرآن اور خلافِ اسلام ہے۔ پرویز صاحب نے بڑے تکلف و تصنع سے اسے قرآن سے کشید کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے لغت اور تفسیرِ قرآن میں جو کوہ کنی کی ہے، اپنے مقالے میں میں نے اس کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے اس کی پہلی ہی قسط ملاحظہ فرما کر خط لکھنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس مقالہ کی جملہ اقساط کو ملاحظہ فرما کر مکتوب لکھتے۔

(۲) شخصی ملکیت کے بارے میں پرویز صاحب کے موقف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ: "دنیا جانتی ہے کہ یہ اختلاف نیا نہیں ہے"۔ آپ کی یہ بات مبنی بر صحت نہیں ہے۔ نبی ﷺ سے لے کر اب تک اسلامی دنیا کا ایک بھی سکالر ایسا نہیں گزرا جو افراد کی شخصی ملکیت کا منکر ہو۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) کے فکر کی ترویج کے نتیجہ میں برصغیر میں اسے پرویز صاحب نے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ منسوب الی القرآن کیا ہے۔ اس سے قبل کا چودہ صدیوں پر مشتمل اسلامی ادب، انفرادی ملکیت کی نفی کے تصور سے قطعی نا

آشنا ہے۔

(۳) آپ نے مجھ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ میں نے پرویز صاحب کی کردار کشی کی ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آیا آپ "کردار کشی کرنے" اور کسی سے "دلیل و حجت کے ساتھ اختلاف کرنے" میں جو باہمی فرق ہے، اُس سے واقف بھی ہیں یا کہ نہیں۔

بندۂ خدا! میں نے پہلے بھی بذریعہ محدث (اکتوبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۲) آپ سے عرض کیا ہے کہ کسی کے نقطۂ نظر سے برہان و حجت کے ساتھ اختلاف کرنا، اس پر کیچڑ اچھالنے یا اس کی کردار کشی کرنے کا ہم معنی نہیں ہوتا۔ آپ کی یہ بات صرف اسی صورت میں مبنی برصداقت قرار پاسکتی ہے جبکہ میں نے پرویز صاحب کے ذاتی عیوب ونقائص اور شخصی خامیوں اور برائیوں پر بحث کی ہوتی، اور یہ ظاہر ہے کہ میرا قلم بفضلہٖ تعالیٰ اس آلودگی سے آلودہ نہیں ہوا۔ آپ اپنے دل کو ٹٹولیے کہیں ایسا تو نہیں کہ پرویز صاحب سے آپ کو جو محبت ہے، وہ حدِ اعتدال سے اس قدر تجاوز کر گئی ہو کہ اب ان سے مدلل اختلاف کرنے والا بھی آپ کو ان کی کردار کشی کرنے والا ہی نظر آتا ہے۔

(۴) (الف):۔۔۔ آپ فرماتے ہیں کہ: "حیرت اس بات پر ہوئی کہ اتنے اوصاف کا، کہ یہ ماہنامہ محدث امانت دیانت اور شائستگی کا سبق کیوں بھول گیا۔"

آپ کا یہ الزام ثبوت سے عاری اور دلیل سے معرا ہے، بلا دلیل و حجت آپ کا الزام آخر کس طرح قابلِ تسلیم ہوگا۔

(ب):۔۔۔۔۔ آپ نے فرمایا ہے کہ: "۳۳ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں سے ایک جملہ اُچک کر فتویٰ صادر فرما دیا کہ "پرویز اشتراکیت کو عین اسلام قرار دیتا ہے۔"

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آپ نے جلد بازی کی اور پہلی ہی قسط دیکھ کر بے تابی سے خط لکھ ڈالا۔ اگر آپ میرے مقالہ کی جملہ اقساط پڑھ لیتے، تو آپ کو علم ہو جاتا کہ یہ پورا سلسلۂ مضمون، پرویز صاحب کے صرف ایک جملے پر مبنی نہیں ہے۔ میں آپ سے عرض گزار ہوں کہ اس مقالہ کی تمام اقساط کا مطالعہ فرمائیں:

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

(ج): ...... اس کے ساتھ ہی آپ نے لکھا کہ ''یہی کچھ فاضل مقالہ نگار نے اللہ کی کتاب کے ساتھ کیا ہے'' ۔ یہ پھر آپ کی طرف سے بے بنیاد الزام تراشی ہے جس کا کوئی ثبوت نہ آپ پیش کر سکے ہیں اور نہ ہی آئندہ کر سکیں گے۔ آخر کسی دلیل، ثبوت، نظیر یا مثال کے بغیر مجھے یہ کیسے علم ہوتا کہ میں نے واقعی کتاب اللہ کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جس کا الزام آپ مجھ پر عائد کر رہے ہیں۔ خدارا! آخرت میں اپنی جواب دہی کا احساس فرمائیں اور ایسی بے بنیاد الزام تراشیوں سے اجتناب فرمائیں۔

(د): ...... مندرجہ بالا عبارت سے متصل ہی آپ لکھتے ہیں کہ: ''پھر وہی بدنام زمانہ گھسے پٹے جملے ، پرویز منکرِ حدیث ہے، بے شرم ہے، بے حیا ہے۔''

میرا مقالہ (جس پر آپ اعتراض فرما رہے ہیں) ماہنامہ محدث کے دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں صفحہ ۵۰ سے صفحہ ۵۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا آپ اس میں کہیں یہ جملہ دکھا سکتے ہیں کہ ''پرویز منکرِ حدیث ہے، بے شرم ہے، بے حیا ہے''۔ اس بے سروپا الزام تراشی اور بہتان طرازی کے جواب میں مَیں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ: ؏

ظالم جفائیں کر مگر اتنا رہے خیال ہم بیکسوں کا بھی کوئی پروردگار ہے

میں پرویز صاحب کے فکر کی تردید میں ڈیڑھ دو سال سے ''محدث'' میں مسلسل لکھ رہا ہوں۔ مَیں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مضبوط دلائل اور قوی براہین کے ساتھ پرویز صاحب کی تردید کر ڈالنے کے بعد، ان کے متعلق ''بے شرم ہے، بے حیا ہے'' جیسے سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کروں۔ ☆ میرے سیرت و کردار اور مذاق و مزاج سے شناسا لوگوں کو جب آپ کا یہ خط پڑھایا گیا، تو انہوں نے بے ساختہ یہ کہہ دیا کہ ''آپ کے قلم سے یہ الفاظ نہیں نکل سکتے۔ تاظم

☆ ...... یہ بات میں نے اس دور میں کہی تھی، جب میں پرویز صاحب کو نیک نیت، مخلص اور دیانت دار طالب علم قرآن سمجھتا تھا، مگر بعد میں، جب میں نے قرآن اور رسول قرآن پر انہیں، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، واضح طور پر بہتان تراشی کرتے ہوئے پایا، تو میری رائے بدل گئی۔

طلوعِ اسلام نے آپ کی طرف یہ الفاظ منسوب کرنے میں اگر سہواً ایسا نہیں کیا ہے تو یقیناً انہوں نے کذب وزور سے کام لیا ہے۔"

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ ہر مسلمان اس امر سے شرم اور حیا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی چیز یا فکر کو اسلامی قرار دے، مگر پرویز صاحب تھے کہ بغیر کسی ادنیٰ حجاب و ہچکچاہٹ کے یہ کہتے رہے ہیں کہ "جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ نظام کے متماثل ہے۔" (نظامِ ربوبیت، صفحہ ۳۵۸)

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان جب یہ دیکھتا ہے کہ کعبہ کو سومنات اور گنگا و جمنا کو کوثر و تسنیم قرار دیا جاتا ہے، تو اس کی دینی غیرت و حمیت اور اسلامی شرم و حیا سر پیٹ کررہ جاتے ہیں۔

(۵) اپنے خط میں آپ نے فرمایا ہے کہ "خدارا! ایسی زبان استعمال نہ کیجیے جس کو اپنانا ہم وابستگانِ دامنِ قرآنی کے بس میں نہ ہو۔" الحمد للہ کہ میں نے ایسی زبان استعمال نہیں کی۔ اس کے برعکس آپ نے جس طرح بے سروپا الزامات کی بوچھاڑ کی ہے، وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ آپ خود ہی اپنی تحریر کے آئینے میں اپنا سراپا ملاحظہ فرمالیں۔ علاوہ ازیں آپ طلوعِ اسلام کے مضامین پر بالعموم اور حقائق و عبر کے مواد پر بالخصوص نظر ڈالیں، جن میں آپ نے اگر علماءِ امت کے خلاف لکھا ہے تو طعن و تشنیع، پھکڑ بازی، فقرہ بازی اور استخفاف و استہزاء کی زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔ آپ کے ایسے ہی اندازِ نگارش پر مولانا مودودیؒ نے لکھا تھا:

> "یہ منکرینِ حدیث جہلِ مرکب میں مبتلا ہیں۔ جس چیز کو نہیں جانتے، اسے جاننے والوں سے پوچھنے کی بجائے، عالم بن کر فیصلے صادر کرتے ہیں اور پھر انہیں شائع کر کے عوام کو گمراہ کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ان کی گمراہ کن تحریریں ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں ہے جس کو دلائل کے ساتھ رد نہ کیا جاسکتا ہو، لیکن جس وجہ سے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے، وہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے

مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو لیے کھڑا ہوا ور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، اور نہ ہی اس قماش کے لوگ، اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔" (رسائل و مسائل، جلد ۲، صفحہ ۵)

میرے یا محدث کے طرز نگارش کے متعلق، آج تک کسی نے ایسی شکایت نہیں کی۔

(۶) اپنے خط کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے کہ "جرأت کردار اور صحافتی دیانت کا تقاضا ہے کہ آپ ہماری ان معروضات کو بھی محدث میں جگہ دیں، گو تجربہ شاہد ہے کہ آپ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ جس تجربے کو آپ شاہد بنا رہے ہیں، وہ آپ کو کب اور کہاں حاصل ہوا؟ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ خود طلوع اسلام ایسی جرأت کردار اور صحافتی دیانت سے کوسوں دور واقع ہوا ہے۔ میرا ایک مضمون "خدا اور رسول یا مرکز ملت (قرآن کریم کی روشنی میں)" محدث (جون ۱۹۸۸ء) میں چھپا تھا۔ آپ نے حسب روایت بڑے اوچھے انداز میں ایک تردیدی مضمون، طلوع اسلام (اگست ۱۹۸۸ء) میں شائع کیا۔ میں نے آپ کے اوچھے انداز بیان کے مقابلہ میں اچھا انداز نگارش اختیار کرتے ہوئے، محدث (اکتوبر ۱۹۸۸ء) میں آپ کا جواب دیا اور ساتھ ہی آپ سے یہ عرض کی کہ:

"میرا یہ مضمون طلوع اسلام میں شائع فرما دیں۔ یہ ملک اہل علم سے خالی نہیں ہے۔ آپ کے قارئین، خود میرا، آپ کا اور پرویز صاحب کے قلم سے لکھا ہوا پورا مضمون پڑھ کر خود اندازہ لگا لیں گے کہ کس کا موقف قوی ہے اور کس کا کمزور؟ اور یہ بھی کہ عبارتوں کو پیش کرنے میں کون بددیانت واقع ہوا ہے اور کون دیانت دار؟ نیز یہ بھی کہ کس کا انداز بیان اوچھا ہے اور کس کا اچھا؟" (محدث، اکتوبر ۱۹۸۸ء)

لیکن آپ نے میرا مضمون طلوع اسلام میں شائع نہیں کیا۔ اس کے برعکس محدث (جسے آپ

"کو تجربہ شاہد ہے کہ آپ 'یا ہرگز نہیں کریں گے' کے الفاظ سے پیشگی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں) کا رویہ یہ ہے کہ آپ کے قلم سے وابستہ ایک شخص مسمی سید محمد رضا شاہ (۴۴ رازی روڈ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور) مدیر محدث کو "نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح" کے زیر عنوان ایک تفصیلی مضمون بصورت خط اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اسے محدث میں شائع کر کے اس کا جواب بھی دیا جائے۔ چنانچہ مدیر محدث نے فراخ دلی سے اسے ماہنامہ محدث (جلد ۱۷، عدد ۹) میں شائع کیا اور شخص مذکور کی حسب خواہش مولانا عبدالرحمن کیلانی حفظہ اللہ کے قلم سے اس کا جواب بھی شائع کیا۔

آپ کی جرأت کردار اور صداقت دیانت کے پیش نظر، کیا میں آپ سے یہ توقع رکھوں کہ آپ اپنے خط کے ساتھ میرے اس جواب کو بھی طلوع اسلام میں جگہ دیں گے۔ میں اس خط و کتابت کو محدث میں بھی مارچ ۱۹۸۹ء کے پرچے میں شائع کروا رہا ہوں، آپ بھی مارچ کے طلوع اسلام میں اس خط و کتابت کو چھاپ دیں تاکہ دونوں طرف کے قارئین استفادہ کر سکیں۔ از حد شکریہ۔

والسلام

پروفیسر محمد دین قاسمی

گورنمنٹ ڈگری کالج، سمن آباد، فیصل آباد

☆......☆......☆

"جرأت کردار اور صدق دیانت" کے تقاضے کو نباہتے ہوئے محدث نے مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ دونوں خطوط شائع کر دیے۔

قارئین کرام! ماہنامہ "محدث" کے گزشتہ تین شماروں میں، جناب پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کا مضمون، بعنوان "اشتراکیت کی درآمد، قرآن کے جعلی پرمٹ پر" شائع کیا گیا، جس کے ردعمل میں، ناظم ادارہ طلوع اسلام، لاہور کی طرف سے مدیر اعلیٰ محدث کو خط موصول ہوا، جس میں جناب قاسمی صاحب کے مضمون کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا، اس پر ادارہ نے یہ خط براہ راست صاحب مضمون کو ارسال کر

دیا، جس کے جواب میں، جناب موصوف نے ایک مفصل خط بنام ادارہ طلوع اسلام لکھا، اور اس کی ایک نقل ہمیں بھی ارسال فرمائی۔

ہم اپنی سابقہ منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور آزادانہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے، بڑی فراخ دلی کے ساتھ، ادارہ طلوع اسلام کا خط، ان کی خواہش کے مطابق، اور جناب قاسمی صاحب کا جواب شائع کر رہے ہیں، اور اپنے معاصر، طلوع اسلام سے بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ ہماری طرح، وہ بھی، ان دونوں خطوط کو شائع کرے گا، کیونکہ انصاف کا یہی تقاضا ہے۔

اس نوٹ کے بعد، پہلے طلوع اسلام کا خط، اور پھر میرا جوابی مکتوب شائع کیا گیا، لیکن طلوع اسلام، "جرأتِ کردار اور صداقتِ دیانت" کا یہ تقاضا نہ نباہ سکا۔ کیوں؟ دونوں خطوط پر نگاہ ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس کا موقف قوی ہے اور کس کا کمزور۔ کس کا اندازِ نگارش شائستہ اور متین و باوقار ہے اور کس کا اسلوبِ تحریر دروغ گوئیوں، کذب بافیوں، الزام طرازیوں اور بہتان تراشیوں پر مشتمل ہے۔ کس نے عدل و انصاف اور دیانت و امانت کا دامن تھامتے ہوئے اپنے قارئین کے سامنے، تصویر کے دونوں رُخ پیش کیے ہیں، اور کس نے انصاف و دیانت کو پسِ پشت ڈال کر، اپنے قارئین کو تاریکی میں رکھا ہے۔ کس نے دونوں خطوط شائع کر کے، اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، اور کس نے ایسا نہ کرتے ہوئے، اخلاقی نامردی کا ثبوت دیا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی "اخلاقی نامردی" کو چھپانے کے لیے، اخذته العزة بالاثم کا مصداق بنتے ہوئے، الٹا مدیر محدث کو پھر یہ خط لکھ ڈالا۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۹ء محترمی و مکرمی حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب

مدیر ماہنامہ "محدث" لاہور،

السلام علیکم، مزاج بخیر! ۲۷ دسمبر ۸۸ء کے ہمارے خط کے جواب میں پروفیسر محمد دین قاسمی کا ۱۴ جنوری ۸۹ء کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ محترم قاسمی صاحب کا اپنا اندازِ فکر ہے، اور:

"فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست"

خط آپ کے نام، آپ کے ادارتی منصب کے پیش نظر لکھا گیا تھا۔ موصوف نہ ہمارے مخاطب تھے، نہ ہم ان کے جواب کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس پر تبصرہ کیا جائے۔ البتہ ان کی منطق کا جواب کسی مناسب وقت پر ضرور دیں گے۔

کہا ہم نے، مدنی صاحب، یہ تھا کہ پرویز وہ واحد شخص نہیں، جس نے زمین کو متاع بندہ اور ملکِ خدا سمجھا ہو، آپ کو یا کسی کو بربنائے دلیل، ان سے اختلاف کا پورا حق حاصل ہے، اور گزارش یہ کی تھی کہ، بالفاظ دیگر کہ ایسا کرتے وقت ان کی شرم و حیا، ❶ "ان کی تحریروں کو کانٹ چھانٹ کر نقل کرنا اور ان پر سنسنی خیز سرخیاں جمانا ایک معیاری جریدے کے شایانِ شان نہیں۔ ہماری یہ استدعا آپ کے نزدیک کچھ وزن رکھتی ہے، تو فهو المراد ورنہ کج بحثی کے لیے نہ ہمارے پاس وقت ہے، نہ ہم اسے دین کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اپنے دین کو صحیح سمجھنے کی توفیق دے۔ آمین۔

والسلام

محمد لطیف چوہدری، ناظم ادارہ

☆.....☆.....☆

یہ ہے علمی مسائل پر طلوع اسلام کے لکھنے کا انداز۔ قارئین کرام، اس ساری دو طرفہ خط و کتابت کو ملاحظہ فرما کر، خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح طلوع اسلام کے کار پرداز، اپنے مخالف کے مدلل اور مسکت جواب کو نہ صرف یہ کہ اپنے قارئین تک نہیں پہنچنے دیتے بلکہ وہ ان دلائل و براہین کو "کج بحثی" قرار دے کر، اپنے "دین کا تقاضا" پورا کرتے ہیں۔ میں نے تو اس خط کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، البتہ ادارہ محدث نے، جواباً جو مکتوب ارسال کیا ہے، اس کا ابتدائی حصہ، ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

❶ خط میں یہاں لفظ واضح نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ نجی خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

محترم جناب محمد لطیف صاحب

السلام علیکم! آپ کا ارسال کردہ گرامی نامہ موصول ہوا، جس میں پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کے مضمون کے خلاف قلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ صاحبِ مضمون کی طرف سے، آپ کے جملہ اشکالات کا آپ کو مدلل جواب مل جانے کے بعد بھی، اعتراض نامہ کی ترسیل، باعثِ افسوس بات ہے۔ قاسمی صاحب کے مضامین کے خلاف، آپ کی بے چینی سے، یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریر میں وزن ہے، اور اگر وہ، بالفرض، اس قابل ہی نہیں کہ آپ اس پر کوئی تبصرہ کریں تو بے فکر رہیے، قارئین خود ہی اس کے متعلق، آپ کی سی رائے قائم کر لیں گے۔ لیکن اس علمی کاوش پر آپ کی ناپسندیدگی کی وجہ سے، ان قارئین کے دہائیوں خطوط سے چشم پوشی کر لینا بھی ممکن نہیں، جو اس علمی تنقید کو پسند کرتے ہیں اور قرآن و حدیث پر مخالفین کے الزامات کے دفاع کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔

الراقم الاثم

محمد رمضان سلفی

۲۰/۷/۱۴۰۹ھ

حرفِ آخر

مطالعۂ قرآن کے ذوق کے باعث، جن بہت سے اہلِ قلم کی تصنیفات تک میری رسائی ہوئی، ان میں جناب پرویز صاحب اور مولانا مودودیؒ دونوں شامل ہیں۔ میں نے دونوں کے لٹریچر کا اگرچہ تفصیلی مطالعہ کیا ہے، لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ جس قدر بالاستیعاب مطالعہ، اول الذکر شخصیت کی کتب اور ان کے مجلّہ کا، میں نے کیا ہے، اس قدر مؤخر الذکر ہستی کے لٹریچر کا مطالعہ میں نہیں کر پایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کی پوری فائل (از ابتدا تا انتہا) فراہم کر پانا، میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ جبکہ طلوع اسلام کی فائل مجھے بآسانی فراہم ہو گئی۔ باقی رہیں، دونوں اصحاب کی کتب و تصنیفات، تو بازار سے بسہولت میسر ہیں۔ پرویز صاحب کی وفات کے تقریباً پونے دو سال بعد (یعنی دسمبر ۱۹۸۶ء) تک کی فائل کا ایک ایک حرف میری نظروں سے گزرا ہے۔ کتبِ پرویز اور ان کے ماہوار مجلّہ کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پرویز صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس میں وہ قلب وذہن کی مغایرت کا شکار رہے ہیں، ان کے لسان ودل میں ہم آہنگی نہیں تھی۔ وہ، اپنے ضمیر سے لڑ کر، وہ کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں جس پر ان کا ایمان نہیں تھا، اور جس پر فی الواقعہ، ان کا اعتقاد تھا اُسے وہ چھپائے رکھنے پر مجبور تھے۔ ان کی اسی قلبی کیفیت نے، ان کے لٹریچر میں وسیع و عریض خارزارِ تضادات پیدا کیا ہے۔ ان تضادات میں سے بعض ایسے بھی ہیں، کہ ایک وقت میں، اگر ایک چیز عین مطابقِ قرآن اور موافقِ اسلام تھی، تو دوسرے وقت میں، وہی چیز، نہ صرف "خلافِ قرآن" بلکہ صریح کفر وشرک قرار پا گئی۔ تضادات وتناقضات کا وجود، بہرحال، کذب وزور اور دروغ وجھوٹ کو مستلزم ہے، جو ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب کی اس حد تک فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا کہ وہ جھوٹ بولتے ہوئے اُن کاموں کو بھی اپنے کارنامے قرار دیا کرتے تھے، جو سرے سے

انہوں نے انجام ہی نہیں دیے تھے، مقدمہ بہاولپور کے فیصلے کا سہرا، اپنے سر باندھنا اس کی نہایت واضح مثال ہے۔ ہوسِ شہرت اور دروغ گوئی کے ہاتھوں مجبور ہو کر، فاضل جج (جناب محمد اکبر صاحب) پر بھی بہتان تراشی اور افتراء پردازی سے نہیں چوکے۔ اپنی مطلب برآری کے لیے، یا اپنے فکری حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے، صحت مند اور مضبوط دلائل و براہین کا سہارا لینے کی بجائے، اُن کے اقتباسات کو پیش کرنے میں خداع، فریب اور بددیانتی وخیانت کاری جیسے ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں۔ دوسروں کی عبارتوں کو مکانی اور زمانی سیاق و سباق سے کاٹ کر، مغالطہ آرائی کرنا، ان کا شیوہ رہا ہے۔ اپنے نظریاتی مخالفین پر جھوٹے الزامات لگانا اور ان پر بہتان تراشتے رہنا، اُن کی مستمر خصلت تھی۔ اگر کسی نے، ان کے فکری حریفوں کی بے جا مخالفت کرتے ہوئے، کوئی غلط بات بھی کہہ دی تو اسکی تائید کر ڈالنا، "مفکر قرآن" پر لازم ہو گیا، بغیر اس بات کی پرواہ کیے کہ یہاں انصاف کے ساتھ، خدا لگتی بات کہنے کا تقاضا کیا ہے۔ چنانچہ عدل و انصاف اور امانت و دیانت کے مقتضیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اپنوں اور بیگانوں کے لیے وہ دوہرے معیار اختیار کیا کرتے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں، نظامِ باطل کی چاکری کرنا، اور طاغوتی نظامِ حکومت کی مشینری کا کل پرزہ بنے رہنا، اُن کا ذریعۂ معاش تھا۔ اُن کے فکری تضادات کا ایک حصہ، اُن کے وہ فتوے بھی ہیں، جن میں وہ دوسروں کو تو یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ "تمہاری جان چلی جائے، تو چلی جائے، لیکن جھوٹ ہرگز نہ بولیے" لیکن اپنی دو ٹکے کی نوکری کے لیے بھی، وہ جھوٹ بولنے سے احتراز نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ جعلی اور جھوٹے ناموں کے ساتھ قلم کاری کیا کرتے تھے۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے معاملہ میں، امانت و دیانت، عدل و انصاف اور معروف کاروباری اصولوں کے منافی، دھن، دھونس، دھاندلی اور جبر و زبردستی کا انہوں نے جو مظاہرہ کیا، وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

چوری اور سینہ زوری:

"مفکر قرآن" صاحب کے یہ "اخلاقی فضائل" اگر ان کی ذات تک محدود رہتے تو ہمیں اُن سے کوئی پرخاش نہ تھی، لیکن حیرت اور انتہائی حیرت تو اس بات پر ہے کہ چوری اور سینہ زوری

کا مظاہرہ کرتے ہوئے، وہ، الٹا کوتوال کو ڈانٹا کرتے تھے، اور جن رذائل و معائب میں وہ خود عمر بھر مبتلا رہے ہیں، ان سے چھٹکارا پانے کی بجائے، وہ، انہیں اپنے مخالفین کے سر تھوپا کرتے تھے۔ وہ خود جھوٹ بولتے تھے، مگر اس کا الزام دوسروں پر عائد کیا کرتے تھے۔ وہ خود بہتان تراش اور تہمت طراز تھے مگر وہ اس خصلتِ بد کو اوروں کی طرف منسوب کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرنے میں بددیانت واقع ہوئے تھے مگر وہ، غیروں کو اس حرکت کا مرتکب قرار دیا کرتے تھے۔ وہ بغیر کسی دلیل و حجت کے، اپنی طرف سے ایک بات وضع کر کے، اپنے مخالفین کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، لیکن پلٹ کر وہ اسی الزام کو، یہ کہہ کر، اپنے مخالفین کے سر چپک دیا کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ خود متناقض الکلام اور تضاد گو تھے، مگر وہ یہ الزام، دوسروں پر چسپاں کیا کرتے تھے، اور اپنے تضادات کو چھپائے رکھنے کے لیے، دوسروں کے ''تضادات'' کو اچھالا کرتے تھے۔ وہ خود اخلاقی رذائل کی گندگی میں لت پت تھے، مگر کیچڑ دوسروں پر اچھالا کرتے تھے، اور سینہ زوری کا یہ رویہ اپنانے میں وہ اس قدر سرگرم تھے کہ فرطِ جوش میں ہوش کا دامن بھی، ان کے ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا تھا، جس کا نتیجہ تقلیبِ امور، تنکیسِ معاملات، تحریفِ واقعات اور مسخِ حقائق کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا، اور پھر اس صورتِ حال کا الزام، وہ پلٹ کر، دوسروں پر عائد کیا کرتے تھے۔ وہ مالی معاملات میں گڑبڑ کرنے کے الزام کو، اپنی ذات سے دفع کرنے کے لیے، منافقین کے نام لے کر، خود اپنی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی الزام عائد کر کے، اس ذاتِ اقدس و اعظم کو اپنی سطح پر گھسیٹ لانے میں شرم و عار محسوس نہیں کرتے تھے، خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی سے مطلق عاری ہو کر، محض لوگوں کو اپنا ہم نوا اور حمایتی بنانے کے لیے، اور عامۃ الناس کو قرآن و سنت پر مبنی، اس نظام سے برگشتہ کرنے کے لیے، جسے وہ ''عجمی اسلام'' کہا کرتے تھے، اور اس ''قرآنی نظام'' کے نفاذ کے لیے، (جسے انہوں نے کمیونزم کے معاشی نظام کو مغربی معاشرت کے اجزاء کے ساتھ ممزوج کر کے، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کر رکھا تھا) وہ کوئی بھی گھٹیا سے گھٹیا حربہ اختیار کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اپنے مقاصد کی بازیابی کے لیے، ان کی ایک بڑی ضرورت

...... بلکہ شاید سب سے بڑی ضرورت ... یہ تھی کہ ان لوگوں کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے، جو پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے قرآن وسنت کا نفوذ چاہتے ہیں۔ چنانچہ طلوع اسلام میں اس مخالفت کو بلند ترین نصب العین کی حیثیت دی گئی، اور اس کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں عداوت ومخاصمت کی یہ موسلا دھار بارش نہ ہوئی ہو، اور مرورِ ایام کے ساتھ، اس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ، دھوکہ وفریب کی یورش اور خیانت وبددیانتی کی یلغار کے ساتھ، مجلہ مذکورہ میں، ایک شدید پراپیگنڈہ مہم شروع کی گئی، تاکہ قرآن وسنت پر مبنی اسلام کے خلاف، اور اسے نافذ کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کے خلاف، شکوک وشبہات اور ریب وتشکیک کا ایسا گردوغبار اٹھایا جائے، کہ حق کی نگاہوں سے مخفی ہو کر رہ جائیں۔ آئے دن نت نئے شگوفے چھوڑے اور شوشے اٹھائے گئے۔ مولانا مودودیؒ کی برسوں پرانی عبارتوں کو "نئے تقاضوں اور جدید ضرورتوں" کے تحت، کھنگالا گیا تاکہ جہاں کہیں بال برابر بھی اعتراض جڑنے کی کوئی گنجائش ملے، اسے شائع کر کے معاندانہ پراپیگنڈہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا، لیکن مولانا مودودیؒ ان سب شیطانی چالوں سے بے نیاز اور ان سے بے پرواہ ہو کر، خدمتِ اسلام کے مثبت اور تعمیری کام میں منہمک رہے، اور "ترجمان القرآن" کو کبھی بھی "طلوعِ اسلام" کا حریف نہ بننے دیا، لیکن طلوعِ اسلام اپنی اس یک طرفہ حریفانہ کشمکش کو مستقل جنگ میں تبدیل کروانے کے لیے، ہر ماہ مسلسل ایندھن ڈالتا چلا گیا تاکہ مخالفت وعداوت کے اس الاؤ کو نہ صرف یہ کہ بجھنے نہ دیا جائے بلکہ اسے مسلسل بھڑکائے رکھا جائے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ کے خلاف، ایک ہی طرح کی باتوں کو، مسلسل بدلتے ہوئے انداز واسالیب کے ساتھ، بتکرار وفہ وبسیار، دہرایا جاتا رہا تاکہ نفرت کے اس زہر کے پھیلاؤ میں، جس قدر ممکن ہو سکے، اضافہ ہوتا رہے۔

مولانا مودودیؒ کا ایمان افروز جوابی طرزِ عمل:

مولانا مودودیؒ کی خدمت میں ان کے بعض ارادت مندوں کی طرف سے، یہ درخواست بھی کی گئی کہ آپ ان جھوٹے اور دروغ گو لوگوں کا تعاقب فرمائیں، لیکن انہوں نے اس

مولانا کے محترم کا جواب نہ دینا، شاید طلوع اسلام پر، جواب دینے کی نسبت، کہیں زیادہ گراں گزرا، اور وہ اپنی مخالفت میں شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، وہ ہر ماہ، مولانا کے محترم کی عبارات سے، اپنی موشگافیوں کے ذریعہ نئے نئے شگوفے چھوڑتا رہا۔ خوردبینی مطالعہ کے ذریعہ، خوردہ گیری کرتا رہا۔ نت نئی نکتہ آفرینیوں سے نئے فتنے اٹھاتا رہا، لیکن مولانا مودودیؒ نے صبر و سکوت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، کسی بات کا جواب نہ دیا، اور اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں، لیکن طلوع اسلام اپنے بدن سے ماہ بماہ، اخلاقی ملبوسات کے حوالے سے Striptease کا مظاہرہ کرتا چلا گیا لیکن اسے کون سمجھاتا کہ ...... یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ آدمی اپنے عام کپڑے صرف اس لیے اتار ڈالے کہ شریف آدمی اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔ شریف آدمی نے تو بیچ بچ اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، لیکن ساری دنیا کی آنکھیں تو بند نہیں ہیں، ...... لیکن شیطان کی نگاہیں، جونہی لباسِ شرافت اور پوشاکِ اخلاق سے عاری، اس مادھو پر پڑیں، تو فوراً اس کے پاس آیا، تھپکی دی، پیٹھ ٹھونکی، اور اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ تمہاری باتوں کا تو جواب ممکن ہی نہیں، تمہارے دلائل و براہین کی تردید، بھلا کون کر سکتا ہے، کیونکہ:

> ’’ملا، طلوع اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لیے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے اور ملا بیچارہ قرآنی دعوت سے محروم ہوتا ہے۔‘‘ ❶

اور مولانا مودودیؒ کے بارے میں، شیطان نے ان کے کانوں میں یہ وحی کی:

> ’’مودودیؒ صاحب، پرویز صاحب سے خائف ہیں۔‘‘ ❷

شیطان کے چیلے، دراصل اسی قسم کی وحیوں سے اپنی عزت میں اضافہ تصور کرتے ہیں، اور ہم بھی یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر کسی کو اس خیال سے سرور و راحت ملتی ہے کہ فلاں آدمی، مجھ سے خائف اور لرزاں و ترساں رہتا ہے، تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی طبیعت کی خوشی کے لیے اور اپنی صحت کی بحالی کے لیے ایسے کلمات (ہی نہیں بلکہ ایسے ظنون واوہام) کو وٹامن کے طور پر

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۷ ❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۶۲

استعمال کرے۔ آخر بعض حالات میں انسان کو اپنی بحالی صحت کے لیے اگر حرام چیزوں کو کھا لینے کی اجازت ہے، تو راحت بخش خیالات اور مسرت افزا امکانات سے کیوں نہ طبع نازک کے لیے بہجت و انبساط کا سروسامان کیا جائے۔

قصہ مختصر یہ کہ:

یہ تھا وہ رویہ، جو "مفکر قرآن" نے عمر بھر اختیار کیے رکھا، اور جسے اب تک طلوع اسلام اپنائے ہوئے ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس "مفکر قرآن" کا اخلاقی رویہ یہ ہو کہ..... نہ وہ اپنوں سے عدل و انصاف کر سکتا ہو اور نہ ہی غیروں سے، جو علمی اور قومی مسائل میں وقار، متانت اور سنجیدگی کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے سوقیانہ اندازِ تکلم کا عادی ہو، جھوٹ بولنا، بہتان تراشی کرنا جس کا شیوہ ہو، مخالفین کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، انہیں من مانے معانی پہنانا جس کی عادت ہو، غیروں کی عبارتوں میں خیانت کاری اور بد دیانتی کے ذریعے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، جس کا وطیرہ ہو، خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی سے عاری ہو کر، دھوکہ و فریب کے ساتھ لوگوں کو اپنا حامی و ہمنوا بنا لینے ہی کو فلاح و کامیابی سمجھنا، جس کی روش ہو۔ ..... اس شخص کے متعلق خود سوچ لیجیے کہ وہ اپنی تفسیر قرآن میں جو کچھ پیش کر چکا ہے، آیا وہ "قرآنی تحریفات و تلبیسات" ہیں یا "بلند پایہ علمی نکات"۔

مزید برآں، یہ بھی سوچ لیجیے کہ جس کے پیش کردہ "انقلابی اسلام" کے تصور کو دیکھ کر، امتِ محمدیہ کے علماء کرام (خواہ ان کا تعلق کسی بھی مکتبِ فکر سے ہو) بیک زبان ہو کر، اس پر فتویٰ کفر عائد کریں اور اس کے برعکس، عالمِ کفر کے یہودی مفکر، عیسائی دانش ور، بے دین سکالرز، اور زندیق و ملحد پیشوایانِ کفر، اس پر تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائیں، تو اس کا فکر، فکرِ حق ہے یا فکرِ باطل؟ اس کا "انقلابی اسلام" محمد رسول اللہ والذین معہ کے کام کا ہے، یا عالمِ کفر و اشتراکیت کے کام کا؟ اس کی ذات، اہلِ ایمان کے لیے مستحسن و پسندیدہ ہے یا اہلِ کفر کے لیے؟ وہ اپنے افکار و نظریات کے حوالے سے، علم برداران کفر و الحاد، پیشوایانِ زندقہ اور ائمہ دہریت کے لیے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابنِ حجر کی سی قدر و اہمیت کا حامل ہے، یا سلمان رشدی یا تسلیمہ نسرین کی سی عزت و تکریم کا؟

اور اس کے ہم قدم و ہم رکاب رہے گا۔

۲...... دوسرا وہ گروہ جو طلوعِ اسلام کے لٹریچر کا سطحی اور یک طرفہ مطالعہ کر کے، اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کر کے مطمئن ہو چکا ہے، وہ اس کتاب کو پڑھ کر تذبذب کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہو گا کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ ایک طرف اگر وہ پرویز صاحب کی شگفتہ تحریر سے متاثر ہو کر "مفکر قرآن" کے خلوصِ قلب کا قائل ہو چکا ہے تو دوسری طرف اس کتاب کا حقائق پر مشتمل مواد، اس کی اس عقیدت پر سخت چوٹ لگائے گا جو پرویز صاحب کے لیے ان کے سویدائے قلب میں پیدا ہو چکی ہے۔ تذبذب کے اس دوراہے پر کسی بھی راستے پر پیش قدمی کرنے سے پہلے اگر اس نے تحقیق سے کام لیا اور جن کتب و رسائل کے حوالے اس کتاب میں دیے گئے ہیں، ان تک رسائی پا کر حقیقتِ حال کو جاننے کی کوشش کی، تو وہ مصنف کی تحقیق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بالآخر کرگسوں کی صحبت میں پلنے والا یہ فریب خوردہ شاہین اپنے اصل مقام کی طرف پلٹ کر راہ و رسمِ شہبازی اختیار کرنے پر مجبور ہو گا۔

۳...... تیسرا ٹولہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو سالہا سال سے طلوعِ اسلام کے لٹریچر کا یک رُخا مطالعہ کر کے، ہر اس جماعت اور ہر اس فرد کے خلاف اپنے سینوں میں کینہ و کدورت پیدا کر چکے ہیں، جس کے خلاف ایسا کرنا، طلوعِ اسلام کا نصب العین بن چکا ہے۔ یہ لوگ، اپنے مسلک کی حمایت اور اپنے فکری مخالفین کی مخالفت میں، اپنے قلوب و نفوس میں شدید حمیتِ جاہلیہ، سنگین تعصب اور سخت ضد پیدا کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اس کتاب کے مطالعہ کا وہی اثر ہو گا جو نزولِ قرآن نے مشرکین عرب کی ذہنیتوں پر کیا تھا: ﴿ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝ ﴾ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی چیخیں نکل جائیں گی، وہ چلائیں گے، شور مچائیں گے، سب و شتم اور دشنام طرازی پر اتر آئیں گے اور یہ کہہ کر

آسمان سر پر اٹھا لیں گے!

دیکھنا ، لینا ، پکڑنا ، دوڑنا ، جانے نہ پائے

لے چلا ، میری شکیبائی وہ کافر لے چلا ❶

اس آخری ٹولے نے بھی پہلے دو طبقوں کی طرح، ٹھیک وہی ردِّعمل ظاہر کیا ہے، جس کی مجھے توقع تھی، چیخنے چلانے، شور مچانے اور سب وشتم پر اُتر آنے کا یہ ردِّعمل، طلوعِ اسلام جون ۲۰۰۶ء میں ظاہر ہوا ہے۔ اس گروہ کے متعلق میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

"مجھے یہ بھی پیشگی اندازہ ہے کہ اس کتاب کے مواد کے بارہ میں وابستگانِ طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ کہا جائے گا (جیسا کہ یہ اکثر کہا کرتے تھے) کہ پرویز صاحب (یا طلوعِ اسلام) کی عبارات کو توڑ مروڑ کر لکھا گیا ہے۔" ☆ ❷

میرا یہ بھی اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا، اور مقالہ نگار ٹھیک وہی کچھ لکھتے ہیں جس کی مجھے توقع تھی، وہ فرماتے ہیں:

"پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام کے اقتباسات توڑ مروڑ کر، اور سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے پیش کیے جاتے ہیں۔" ❸

حالانکہ جہاں میں نے یہ پیشگی اندازہ رقم کیا تھا، وہیں اس کے متصل ہی میں نے یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ

"جو شخص یہ بات کہے، اس سے کہیے کہ جو اقتباسات اور حوالے اس کتاب میں شائع کیے گئے ہیں، وہ ان سے متعلقہ کتب ومجلات کو لے آئے اور اس کے بعد آپ کو بتائے کہ کہاں الفاظ کو توڑا مروڑا گیا ہے اور کہاں عبارات کو غلط پیش کیا گیا ہے۔ آپ اس کا شدت سے مطالبہ کیجیے آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کرسکیں گے۔" ❹

---

❶ کتاب (زیر بحث)، ص ۳۴تا۳۶

☆ چونکہ کتاب "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" کا نام بہت لمبا ہے، اس لیے اس کی جگہ حوالوں میں صرف کتاب (زیر بحث) اور مکرر حوالہ کی صورت میں ایضاً صفحہ...... لکھا گیا ہے۔

❷ ایضاً صفحہ ۴۷ ❸ طلوعِ اسلام، جون ۲۰۰۶ء، صفحہ ۷ ❹ کتاب (زیر بحث)، ص ۴۷

کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ اُن ہی کا یہ اصول ہے کہ کسی چیز کو بلا اختلافی نوٹ کے شائع کرنا، دلیلِ موافقت قرار پاتا ہے۔" ❶

پہلا اعتراض:

طلوع اسلام کے جس اقتباس میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو تاریخی اعتبار سے ایک وضعی شخصیت قرار دیا گیا ہے، اس کا حوالہ 'طلوع اسلام' نومبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۹ دیا گیا ہے، جب کہ اس مقام پر ایسا کوئی اقتباس موجود نہیں ہے۔ چنانچہ مقالہ نگار نے اپنے تنقیدی مضمون کے آخر میں محولہ بالا صفحہ کا عکس بھی پیش کیا ہے۔

یہ اعتراض بالکل بجا ہے۔ کیونکہ کتاب میں، احتیاط کے باوجود، حوالہ غلط درج ہو گیا ہے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ بہرحال یہ اقتباس فی الواقعہ طلوع اسلام نومبر ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں صفحہ ۴۹ پر موجود ہے جس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ میں مقالہ نگار کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس لغزش کی نشان دہی کی۔

دوسرا اعتراض:

دوسرا زیرِ اعتراض اقتباس وہ ہے جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ وحی ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ معترض کا اعتراض یہ ہے کہ مصنف کتاب نے جو یہ کہا ہے کہ..... "طلوع اسلام (یا پرویز صاحب) نے کسی اختلافی رائے کو ظاہر نہیں کیا۔" تو یہ بات غلط ہے، کیونکہ مضمون کے آخر میں "استدراک" کے زیرِ عنوان، بایں الفاظ یہ اختلافی نوٹ موجود ہے:

> "اس مقالہ میں جس قدر حصہ تاریخ سے متعلق ہے، ظاہر ہے کہ اسے یقینی نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے اسے احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔ یہ احتیاط اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب معاملہ صحابہؓ کبار کے متعلق ہو۔ اس سلسلہ میں ہم طلوع اسلام میں بڑی تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اور وہ مباحث اب "قرآنی فیصلے"

---

❶ کتاب (زیرِ بحث)، صفحہ ۸۶

(جلد دوم) میں درج ہو گئے ہیں، جنہیں اس موضوع کی تفصیلات سے دلچسپی ہو، وہ اسے وہاں دیکھ سکتے ہیں۔" ❶

اس اقتباس میں، ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتب وحی ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ایک حرف بھی موجود نہیں ہے۔ صرف یہ "وعظ" موجود ہے کہ تاریخ سے متعلقہ حصہ غیر یقینی ہے، اس لیے اسے احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔ یہ احتیاط اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب معاملہ کبار صحابہؓ کے متعلق ہو۔ لیکن مقالہ نگار صاحب محض میری مخالفت میں، اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتب وحی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں، "اختلافی رائے" قرار دیتے ہیں اور پھر اس فاسد پر ایک اور فاسد کا یہ کہہ کر اضافہ فرماتے ہیں کہ:

> "ملاحظہ فرمایا آپ نے، پروفیسر موصوف کا دعویٰ تھا کہ طلوع اسلام یا پرویز صاحب نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا، اس لیے اسے پرویز صاحب سے منسوب کیا گیا ہے۔ آپ ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمائیے۔ مستشرقین کی کتابیں بھی اسلام پر تنقید سے مملو ہوتی ہیں، مگر آج تک کسی مستشرق نے بھی اس قسم کی علمی خیانت کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا اظہار پروفیسر موصوف نے کیا ہے۔" ❷

استدراک کے زیر عنوان، طلوع اسلام نومبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۵۷ پر موجود عبارت کو (جو قطعی طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتب وحی ہونے یا نہ ہونے سے غیر متعلق ہے) محض سینہ زوری سے "اختلافی رائے" قرار دے کر مقالہ نگار کا "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کا مصداق بننا، واقعی قابل داد ہے۔ مستشرقین نے ایسی علمی خیانت کا مظاہرہ کیا ہے یا نہیں، لیکن مقالہ نگار نے اصل مسئلہ سے قطعی غیر متعلقہ عبارت کو "اختلافی رائے" ظاہر کر کے جس علمی خیانت کا مظاہرہ فرمایا ہے، وہ تو ہم سب کے سامنے ہی ہے۔ پھر عدل و انصاف اور امانت و دیانت کا یہ معیار بھی ہمارے سامنے ہی ہے کہ مقالہ نگار صاحب ایک طرف تو مصنف کتاب پر علمی خیانت کا من گھڑت اور جھوٹا الزام عاید کرتے ہیں اور دوسری طرف اس "منکر قرآن" کی حمایت میں کاغذ سیاہ

---

❶ طلوع اسلام، جون ۲۰۰۶ء + نومبر ۱۹۶۴ء ص ۵۷ ❷ طلوع اسلام، جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۰

مقالہ نگار اس باب کی کسی مثال اور کسی دلیل کی بھی تردید نہیں کر پائے۔ الحمد للہ۔

باب نمبر ۷:...... ساتویں باب میں، جو "تائید باطل کا رویۂ پرویز" کے زیر عنوان ہے، دو ایسی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن میں "مفکر قرآن" صاحب، مولانا مودودیؒ کی مخالفت اور عداوت و عناد کے جوش میں ہوش سے عاری ہو کر، دو باطل اُمور کی تائید پر تُل جاتے ہیں۔ مقالہ نگار نہ تو ان دونوں مثالوں، اور نہ ہی ان کے دلائل کی تردید کر سکے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

باب نمبر ۸:...... آٹھویں باب کا عنوان ہے "تخیلاتی مقصود اور حکمتِ عملی"۔ اس باب میں ایک ایسی اُصولی حقیقت پیش کی گئی ہے، جس پر سلف و خلف اور ہر عصر و مصر کے علماء و فقہاء متفق ہیں۔ ہماری زبان میں، اسے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے:

> "ایک اُصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار، جس سے اس اُصول کی نسبت، بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں، حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔" ❶

اسی اُصولی حقیقت کے تحت کئی ذیلی حقیقتیں، مثلاً اختیار أهون البلیتین وغیرہ سمٹ آتی ہے۔ پرویز صاحب نے سلف و خلف کے جملہ علماء و فقہاء کو نظر انداز کر کے، صرف مولانا مودودیؒ ہی کو اس "جرم" کا مرتکب قرار دے کر، انہیں جس قدر نشانہ بنایا ہے، اس قدر کسی اور مسئلہ پر نشانہ نہیں بنایا۔ یہاں تک کہ اس مسئلہ کی آڑ میں مولانا مودودیؒ کے خلاف ایک ایسی آتشِ جنگ بھڑکائی گئی، جس کے الاؤ کو زندہ و توانا رکھنے کے لیے وابستگانِ طلوعِ اسلام اب تک ایندھن ڈالتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے منکرینِ حدیث کے سرخیل کے خلاف یہ "قلمی جنگ" اپنی سرزمین پر قرآن و سنت کے ہتھیاروں سے نہیں لڑی بلکہ "مفکر قرآن" ہی کی گراؤنڈ پر ان ہی کے ہتھیاروں سے لڑی ہے۔ کیونکہ میرا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ یہ لوگ قرآنی دلائل کو اپنی تاویلاتِ فاسدہ کا نشانہ بنا دیتے ہیں، اور اس طائفہ کے اندھے مقلدین، ان "قرآنی تحریفات" کو بلند پایہ "علمی نکات" قرار دے دیتے ہیں۔ صاحبِ تردید اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ

❶ تفہیمات، ج ۲، ص ۷۶

میں نے معترضین کے "قرآنی دلائل" کا جواب دے دیا ہے اور دوسری طرف کی قوم بعنوان "قرآنی جواہر پاروں" پر مطمئن رہتی ہے اور نتیجۃً بات کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کی بجائے بھنور میں پھنسی ہوئی کاغذی ناؤ کی طرح وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ رہے احادیث وسنت نبی ﷺ کے دلائل، تو وہ ان لوگوں کے نزدیک سرے سے حجت ہی نہیں۔ باقی رہ گئے فقہاء و مجتہدین کے افکار ونظریات، تو ان کو یہ لوگ بھلا کیا وزن دیں گے، جو خود رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو رد کر دینے کے عادی ہوں۔ اس لیے ان لوگوں کے سامنے نہ قرآنی دلائل ہی کارگر ہیں اور نہ ہی حدیث وسنت کی کوئی دلیل پیش کرنا ہی سودمند ہے، اور نہ فقہاء وعلماء کے ارشادات۔ ان لوگوں کی گردنیں، اگر جھکتی ہیں تو صرف "مفکرِ قرآن" کے مقولات ومقالات اور طلوعِ اسلام کی عبارات واقتباسات ہی کے سامنے۔ ان افراد کے نزدیک رسولِ خدا ﷺ کی اتباع، شخصیت پرستی ہے، لیکن قرآن کے نام پر، پرویز صاحب کی نت نئی بدلتی ہوئی آراء واہواء کی اتباع "خدا پرستی" ہے۔ اس لیے میں نے اس باب میں طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب ہی کے لٹریچر سے وہ دلائل پیش کیے ہیں، جو خود "مفکرِ قرآن" کی تردید اور جملہ علماء سلف وخلف (بشمول مولانا مودودیؒ) کی تائید پر شاہد عدل ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس باب میں مذکور دلائل وبراہین کا بھی مقالہ نگار سامنا نہیں کر پائے اور تردید تو رہی ایک طرف، وہ اعتراض تک کی گنجائش نہ پا سکے۔ الحمد لله على ذلك

باب نمبر ۹: ... باب نمبر ۹ کا عنوان ہے...... "مفکرِ قرآن کے اکاذیب واباطیل" ......

اس باب میں بھی، حکمتِ عملی کے مباحث کا وہ حصہ زیرِ بحث آیا ہے جو بعض ناگزیر صورتوں میں جوازِ کذب' کے مباحث پر مشتمل ہے، مت بھولیے کہ بعض ایسی ناگزیر صورتوں میں جوازِ کذب پر جملہ علماء اولین وآخرین متفق ہیں، لیکن 'مفکرِ قرآن' صاحب، ماضی وحال کے جملہ علماء و فقہاء کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف مولانا مودودیؒ ہی کو نشانہ بناتے ہوئے یہ تاثر اُچھالا کرتے تھے کہ صرف مودودیؒ ہی کے نزدیک:

" اقامتِ دین جیسے اہم مقصد کے لیے، اُصولوں میں لچک اور استثنا تو ایک

طرف، ان کے لیے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔" ❶
غور فرمایئے کہ "مفکرِ قرآن" صاحب کی وہ عقلِ عیار، جسے وہ اپنی "قرآنی بصیرت" کا نام دیا کرتے تھے، مولانا مودودیؒ کے ایسے اقتباسات کو پیش کرتے ہوئے بعض ناگزیر حالات، کی شرط خیانتاً حذف کر دیا کرتی تھی۔

بہرحال اس کے مقابلہ میں، پرویز صاحب کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے کسی بھی حال میں جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے۔ اسے مر جانا قبول کر لینا چاہیے لیکن جھوٹ ہرگز نہیں بولنا چاہیے، کیونکہ قرآن کسی حالت میں بھی جھوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔ اس موقف کے حق میں، پرویز صاحب بڑے دھڑلے سے ایک قاعدہ کلیہ بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے:

"اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کرا لیا جائے کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان، قرآن کے خلاف ہے، وہ غلط ہے تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لیے دینی سند نہیں مل سکتی۔" ❷

اس کے بعد میں نے "مفکرِ قرآن" جناب غلام احمد پرویز صاحب کے چند صریح جھوٹ، واضح اکاذیب اور نمایاں اباطیل، طلوعِ اسلام ہی کے لٹریچر سے پیش کر کے یہ لکھا ہے کہ:

"ظاہر ہے کہ "مفکرِ قرآن" جناب پرویز صاحب سے بڑھ کر قرآن کو سند ماننے والا کون ہو سکتا ہے، اور ان سے بڑھ کر قرنِ اول کی تاریخ کو جو خلافِ قرآن ہو، غلط قرار دینے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن پھر حیرت بالائے حیرت اور تعجب بر تعجب ہے اس امر پر کہ خود ان کو اپنی فریب سازیوں، بہتان تراشیوں، خیانت کاریوں اور مغالطہ آرائیوں کے لیے (جن کا تفصیلی ذکر ابوابِ گزشتہ میں کیا جا چکا ہے) دینی سند کہاں سے مل گئی؟ کیونکہ کذب و زور اور دجل و فریب کی شاید ہی کوئی ایسی صورت ہو، جسے انہوں نے اختیار نہ کیا ہو۔" ❸

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۳ ❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۱
❸ کتاب (زیرِ بحث)، صفحہ ۳۰۱

بہر حال اس باب میں مذکور کسی چیز کی تردید وتغلیط کی ہمت طلوعِ اسلام کے مقالہ نگار کو نہیں ہو سکی۔ الحمد للّٰہ علی ذلک

باب نمبر ۱۰:...... دسویں باب کا عنوان ہے...... ''داعیِ انقلاب کا ذاتی کردار'' یہ پورا باب مولانا عبدالرحمٰن کیلانی کی کتاب ''آئینہ پرویزیت'' سے ماخوذ ہے۔ اس باب میں طلوعِ اسلام ہی کی اُمت کے ایک فرد جناب محمد علی بلوچ صاحب نے شهد شاهد من أهلها کا مصداق بنتے ہوئے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کی مالی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا ہے اور پرویز صاحب نے جن پرویزی حیلوں کے ذریعہ میزان پبلی کیشنز کو مالی گزند اور خورد برد کے ذریعہ نقصان پہنچا کر اس کی جان نکالی، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''مفکرِ قرآن'' نے اپنی ذات سے ان الزامات خیانت کو دفع کرنے کے لیے جو تکنیک اختیار کی ہے، اسے محمد علی بلوچ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے:

''صحافتی بازیگری کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ جب آپ کے کسی کام پر اعتراض کیا جائے تو آپ کسی ایسی مشہور ہستی کا نام لے دیجیے جس کا تقدس واحترام مخاطب کے لیے مسلّم ہو، اور اس ہستی کی کسی ایسی ہی مفروضہ غلطی کی نشان دہی کر دیجیے جیسی آپ سے سرزد ہوئی ہے، اور کہہ دیجیے کہ یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے کسی مشہور ہستی کو اپنی سطح پر لا کھڑا کرنا تو دنیا کے بہت سے شاطروں کا شیوہ رہا ہے، لیکن اس مقصد کے لیے حضور اکرم ﷺ کی ہستی کو وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جس کے دل میں خوفِ خدا بلکہ ایمان تک کا بھی شائبہ نہ رہا ہو۔ حسبِ عادت اس مقام پر بھی پرویز صاحب نے کتر بیونت اور تحریف سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر اس انداز کا الزام کبھی بھی نہیں لگایا گیا کہ آپؐ معاذ اللہ پیسے کے معاملے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ آپؐ کے متعلق، منافقین نے محض یہ الزام لگایا تھا کہ آپ ﷺ صدقات میں سے ہم لوگوں کو کم دیتے ہیں اور دوسرے ضرورت مندوں کو زیادہ۔ یہ بات نہیں کہ

انھیں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ معاذ اللہ خود کچھ لے لیتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صدقات کے اموال کو اپنے اور اپنے اہل و عیال پر حرام کر رکھا تھا۔ (حدیث دل گداز ہے، صفحہ ۳۷، ۳۸ + و آئینہ پرویزیت)" ●

اس باب کے مندرجات پر بھی، مقالہ نگار کو کسی اعتراض کی گنجائش نہ مل پائی۔ الحمدللہ

باب نمبر ۱۱:..... یہ کتاب کا آخری باب ہے، اس کا عنوان "اخلاقی نامردی" ہے۔ اس باب میں جس چیز کو "اخلاقی نامردی" قرار دیا گیا ہے وہ منکرین حدیث کا وہ رویہ ہے جس کے تحت یہ لوگ جب کسی سے اختلاف پر اتر آتے ہیں تو دوران بحث اپنے موقف کو تو طلوع اسلام کے قارئین کے سامنے یک طرفہ طور پر پیش کر دیتے ہیں، لیکن اپنے مخالف کے موقف کو اُن کے سامنے آنے نہیں دیتے۔ عامۃ الناس کے سامنے، وہ تصویر کا وہی ایک رُخ لاتے ہیں، جو انہیں پسند ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ جسے وہ ناپسند کرتے ہیں، پیش کرنے کو وہ اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قارئین طلوع اسلام، ان کے یک رُخے مطالعے پر ہی اپنی رائے قائم کر کے بیٹھ جائیں اور کسی دوسرے شخص کا موقف، خواہ وہ کتنا ہی مضبوط، قوی اور صحیح ہو، ان کے سامنے آنے ہی نہ پائے۔ وہ اگر اپنے مخالف کے نقطہ نظر کا تذکرہ کرتے بھی ہیں تو اُس (مخالف) کے الفاظ میں نہیں، بلکہ خود اپنے الفاظ میں، متغیر مفہوم کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس باب میں "اخلاقی نامردی" کی دو نہایت صریح مثالیں بڑی تفصیل سے پیش کی گئی ہیں۔ ایک مثال وہ ہے جو "سنت کی آئینی حیثیت" پر مولانا مودودیؒ اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے مابین مراسلت سے تعلق رکھتی ہے اور ابتدائے مراسلت ہی میں ڈاکٹر صاحب نے پوری مراسلت کی اشاعت کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن مولانا مودودیؒ کے مضبوط دلائل کو طلوع اسلام کے قارئین تک نہ پہنچنے دیا گیا اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب ہی کے بعض خطوط کو یک طرفہ طور پر شایع کر ڈالا گیا۔ آخر اس طرز عمل کو "اخلاقی نامردی" کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس مثال میں مولانا مودودیؒ کی عبارات کو جس خیانت کارانہ

● کتاب (زیر بحث)، صفحہ ۳۲۰

انداز میں پیش کرکے، عبارات کے مصنف ہی کو دھوکہ دینے کی کوشش ڈاکٹر صاحب نے فرمائی تھی، اس کی بھی دس گیارہ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

''اخلاقی نامردی'' کی دوسری مثال، اس خط وکتابت پر مشتمل ہے جو میرے اور جناب محمد لطیف چوہدری، سابق ناظم ادارہ طلوع اسلام کے درمیان دسمبر ۱۹۸۸ء اور جنوری ۱۹۸۹ء میں ہوئی تھی۔ دونوں طرف کی مراسلت کو دیکھ کر ہر شخص خود اندازہ کرسکتا ہے کہ کس نے اپنے موقف کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے اور کس نے اوچھے انداز میں۔ کس کا موقف دلائل و براہین سے مملو ہے اور کس کا افترا پردازیوں اور بہتان تراشیوں پر مشتمل ہے، پھر ساتھ ہی محمد لطیف صاحب نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان کے ارسال کردہ مکتوب کو 'محدث' میں شائع کیا جائے۔ محدث نے تو دونوں طرف کی مراسلت کو، مارچ ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں شائع کردیا، لیکن صحافتی دیانت کا یہ تقاضا، طلوع اسلام پورا نہ کرسکا اور اپنی ''اخلاقی نامردی'' کی روش پر برقرار رہا۔

بہرحال اس آخری باب میں بھی پیش کردہ ہماری کسی بات کی، نہ تو تردید ہی مقالہ نگار سے ہوسکی اور نہ ہی وہ کوئی اعتراض کرپائے۔ الحمد للہ علی ذلک

حرفِ آخر:

آخری باب کے بعد ''حرفِ آخر'' کے زیرِ عنوان میں نے چند صفحات میں پوری کتاب کا خلاصہ بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ 'مفکرِ قرآن' جناب غلام احمد پرویز صاحب کن غیر اخلاقی اور غیر شائستہ پرویزی ہتھکنڈوں سے کام لے کر علمائے کرام کو بالعموم اور مولانا مودودیؒ کو بالخصوص، تذلیل و تضلیل اور استہزاء و تضحیک کا نشانہ بناتے رہے ہیں اور مولانا مودودیؒ کس طرح پرویز صاحب کے معاندانہ اور زہریلے پراپیگنڈے کے جواب میں، صبر و سکوت کا دامن تھامتے ہوئے اور إِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا کی روش اختیار کرتے ہوئے خدمتِ اسلام کی مثبت کاوشوں پر جمے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ کے انتہائی شائستہ طرزِ عمل کی وضاحت کے لیے، میں نے اُن کا ایک اقتباس بھی...... مولانا مودودیؒ کا ایمان افروز جوابی

طرزِ عمل...... کی سرخی کے تحت پیش کیا ہے۔

مقالہ نگار کا پہلا اعتراض (بسلسلہ حرفِ آخر):

"حرفِ آخر" کے زیرِ عنوان میری مندرجہ ذیل عبارت کو (جو صفحہ ۳۸۳ پر موجود ہے) مقالہ نگار نے ہدفِ اعتراض بنایا ہے:

"وہ (پرویز صاحب) مالی معاملات میں گڑبڑ کے الزام کو، اپنی ذات سے دفع کرنے کے لیے، منافقین کے نام لے کر، خود اپنی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر یہی الزام عاید کر کے اس ذاتِ اقدس و اعظم کو، اپنی سطح پر گھسیٹ لانے میں شرم و عار محسوس نہیں کرتے۔" ●

پرویز صاحب کے شرم و حیا کے حوالے سے، اس عبارت کو مقالہ نگار برسوں پہلے لکھے ہوئے میرے ایک خط کی مندرجہ ذیل عبارت کے ساتھ، متضاد و متصادم قرار دیتے ہیں:

"میں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مضبوط دلائل اور قوی براہین کے ساتھ پرویز صاحب کی تردید کر ڈالنے کے بعد، اُن کے متعلق "بے شرم ہے، بے حیا ہے جیسے سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کروں۔" (کتاب زیرِ بحث، صفحہ ۳۷) ❷

یہ الفاظ میرے اُس خط سے ماخوذ ہیں جو میں نے جنوری ۱۹۸۹ء میں محمد لطیف چوہدری ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کو اس وقت لکھے تھے جب کہ اُنہوں نے محدث میں چھپنے والے میرے ایک مضمون پر اظہارِ قلق کرتے ہوئے اور مجھ پر جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ میں (قاسمی صاحب) نے پرویز صاحب کے لیے "بے حیا ہے، بے شرم ہے" جیسے بازاری الفاظ استعمال کیے ہیں، اُس وقت میں نے جواباً انہیں یہ لکھا تھا کہ:

"میرا مقالہ (جس پر آپ اعتراض فرما رہے ہیں) ماہنامہ محدث کے دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں صفحہ ۵۰ سے ۵۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا آپ اس میں کہیں یہ جملہ دکھا سکتے ہیں کہ "پرویز بے شرم ہے، بے حیا ہے" اس بے سروپا الزام

● طلوعِ اسلام، جون ۲۰۰۶ء، صفحہ ۸۷
❷ طلوعِ اسلام، جون ۲۰۰۶ء، صفحہ ۷

تراشی اور بہتان طرازی کے جواب میں، میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ!

ظالم! جفائیں کر، مگر اتنا رہے خیال
ہم بے کسوں کا بھی کوئی پروردگار ہے!

میں پرویز صاحب کے فکر کی تردید میں، ڈیڑھ دو سال سے 'محدث' میں مسلسل لکھ رہا ہوں۔ میں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مضبوط دلائل وقوی براہین کے ساتھ، پرویز صاحب کی تردید کر ڈالنے کے بعد، ان کے متعلق ''بےشرم ہے، بے حیا ہے'' جیسے سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کروں۔'' ❶

اور یہ میری اُس زمانے کی عبارت ہے جب میں نے طلوع اسلام کی مکمل فائل کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس وقت میں اگرچہ پرویز صاحب کو فکری طور پر راہِ راست پر نہیں سمجھتا تھا، لیکن اس کے باوجود میں انہیں قرآن کریم کا مخلص، نیک نیت اور دیانت دار طالب علم سمجھتا تھا۔ لیکن بعد میں جب ان کی بددیانتیاں، خیانت کاریاں، کذب بیانیاں، بہتان تراشیاں اور فریب کاریاں مجھ پر عیاں ہوتی چلی گئیں تو ان کے متعلق میرا یہ حسن ظن بھی جاتا رہا۔ اور اب جبکہ ان بہتان تراشیوں کی تیر افگنی کا نشانہ بننے سے عام علمائے امت اور ائمہ فقہ تو رہے ایک طرف، خود قرآن اور رسولِ قرآن بھی محفوظ نہ رہ پائے تو مجھے اس امر میں رتی برابر شک نہ رہا کہ وہ خوفِ خدا، شرم وحیا بلکہ (بقول محمد علی بلوچ صاحب) ایمان تک سے عاری ہیں۔

دوسرا اعتراض:

مقالہ نگار نے جو دوسرا اعتراض کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکتبِ طلوع اسلام کی کرامت کے باعث یا پرویز صاحب کے فیضانِ نظر کے صدقے، مقالہ نگار بھی دوسروں کی عبارات کو پیش کرتے وقت کتربیونت سے کام لیتے ہیں، بالخصوص ایسی عبارتوں کو پیش کرتے وقت، جن سے طلوع اسلام کی فاسد ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں:

❶ کتاب (زیر بحث)، صفحہ ۳۷۵

"مارچ ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں ایک قاری نے جناب مودودی کو لکھا
"ابھی ابھی ایک پرچہ طلوع اسلام نظر سے گزرا۔ یہ پرچہ قریب قریب ان مضامین پر مبنی ہے جن میں آپ کی کتاب "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں" کی قرآن کی رو سے تردید کی گئی ہے .... اس سلسلے میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ "آئندہ ماہ کے ترجمان القرآن میں آپ اس کا جواب لکھ رہے ہیں کہ نہیں؟ اگر کسی دوسرے پرچے میں اس کا جواب لکھ رہے ہوں تو ہمیں آگاہ کر دیا جائے۔" جناب مودودی نے پرویز صاحب کے مقالے "قتل مرتد" کا جواب تو شایع نہ کیا، البتہ مستفسر کے جواب میں پرویز صاحب کا نام لیے بغیر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔" ❶

اس اقتباس میں نقطوں کے ذریعہ جس عبارت کو محذوف ظاہر کیا گیا ہے وہ چونکہ طلوع اسلام کی ذہنیت فاسدہ کی عکاس ہے، اس لیے اسے مقالہ نگار نے چھوڑ دیا ہے، از راہِ کرم قارئین کرام! اس حذف کردہ عبارت کو (جو درج ذیل ہے) نقطوں والی جگہ پر رکھ کر پڑھ لیں۔

پرچے میں جملے ایسے ہیں جیسے برسوں کی چھپی ہوئی دشمنی کا بدلہ نکال رہے ہوں۔
اس پرچے کے آخر میں یعنی آخری صفحہ پر مفتی محمد شفیع کے ایک تازہ فتوے کی جسے مولانا سید سلیمان ندوی کی تائید حاصل ہے، تردید بھی کی گئی ہے:
"ہماری سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آخر کس ہستی کو یہ لوگ مستند خیال کرتے ہیں۔" ❷

اب رہی "گالیوں کی بوچھاڑ" تو اس کے لیے یہ پورا اقتباس ملاحظہ فرمالیجیے:

"ہمیں تعجب ہے کہ طلوع اسلام کے تازہ ارشادات پر آپ نے ہمیں توجہ دلانے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی۔ یہ لوگ تو مسلسل دس سال سے ہم پر انہی ہی عنایات کی بارش کیے جا رہے ہیں اور کراچی سے نیا 'طلوع اسلام' شروع ہونے کے بعد تو شاید کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں موسلا دھار بارش نہ ہوئی ہو۔

❶ طلوع اسلام، جون ۲۰۰۶، صفحہ ۸ ❷ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۵۲، صفحہ ۷۰

پھر اس موقع پر کیا خاص بات ایسی پیش آگئی کہ آپ نے ہم سے ان کے جواب کی فرمائش کرنا ضروری سمجھا؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ترجمان القرآن کے صفحات میں آج تک ہم نے کبھی ان حضرات کو مخاطب نہیں کیا ہے؟ ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حملوں پر ہمارے توجہ نہ کرنے کی وجہ، ہر معقول آدمی جو ترجمان القرآن اور طلوع اسلام دونوں کو پڑھتا ہے، خود سمجھ لے گا۔ لیکن آپ کے اس خط سے محسوس ہوا کہ شاید بعض لوگوں کے لیے اس سلسلہ میں ہماری طرف سے کچھ تصریح کی بھی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہاں دو اصولی باتیں درج کی جاتی ہیں، جن سے آپ کو نہ صرف طلوع اسلام کے معاملہ میں، بلکہ اُن بہت سے دوسرے لوگوں کے معاملہ میں بھی، ہمارے سکوت کی وجہ معلوم ہو جائے گی، جو اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں میں ہم پر آئے دن حملے کرتے رہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی شخص کی عبارات کو توڑ مروڑ کر اور ان کے ساتھ کچھ اپنی من گھڑت باتیں ملا کر پہلے اس کی ایک غلط پوزیشن بناتے ہیں اور پھر خود اپنی ہی بنائی ہوئی اس پوزیشن پر حملہ کرتے ہیں، ان کی اس حرکت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ تین قسم کی کمزوریوں میں مبتلا ہیں: ایک یہ کہ وہ اخلاقی و ذہنی کے اعتبار سے نامرد ہیں، ان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ آدمی کی اصل پوزیشن پر حملہ کرسکیں۔ اس لیے پہلے وہ اس کی ایک ایسی کمزور پوزیشن بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر حملہ کرنا آسان ہو۔ پھر بہادروں کی سی شان کے ساتھ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بے حیا ہیں، انہیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ جن لوگوں کو اس شخص کی اصلی پوزیشن معلوم ہے وہ اس کی اس کاریگری کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ ان کی نگاہ میں بس یہ کامیابی کافی ہے کہ کچھ ناواقف لوگوں کو وہ غلط فہمی میں مبتلا کر دیں۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے بالکل فارغ ہیں۔ ان کے لیے جو کچھ ہے، بس پبلک ہے

جسے دھوکہ دے کر اگر وہ اپنا کام نکال لے گئے تو گویا انہیں فلاح حاصل ہو گئی۔ اوپر کوئی عالم الغیب جانتا ہے کہ انہوں نے کن افترا پردازیوں سے اپنا کام نکالا ہے تو جانا کرے۔ یہ نامردی اور یہ بے حیائی اور یہ ناخداترسی جن لوگوں کے طرزِ عمل میں صاف جھلک رہی ہو، ان کو اپنا مدمقابل بنانے کے لیے ہم کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ وہ اگر اپنی ساری عمر بھی ہم پر حملے کرنے میں کھپا دیں تو شوق سے کھپاتے رہیں، ہم بھی ان کا جواب نہ دیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی مسائل ہوں یا علمی مسائل؛ ان میں اگر آدمیت اور معقولیت کے ساتھ گفتگو کی جائے تو دلیل کا جواب دلیل سے دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مباحثے مفید و نتیجہ خیز بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان میں ہم احقاقِ حق اور افہام و تفہیم کے لیے بھی حصہ لینے کے لیے تیار ہیں اور طلبِ علم اور طلبِ حق کے لیے بھی۔ ہمیں اپنی ہی بات منوانے پر اصرار نہیں ہے۔ دوسرے کی بات معقول و مدلل ہو تو ہم کھلے دل سے اس کو مان لیں گے۔ مگر جو لوگ دلیل سے کم اور گالی سے زیادہ کام لیں، جو زبان کھولتے ہی پہلے آدمی کی عزت پر حملہ کریں، جن کی تقریر کا اصل مدعا آدمی کو بدنیت اور بے ایمان ثابت کرنا ہو۔ اور جنہیں کوئی ذلیل سے ذلیل تہمت تراشنے میں تامل نہ ہو، ان کو کسی علمی یا قومی مسئلے میں بحث کا مخاطب بنانا کسی شریف اور معقول آدمی کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں کا جواب دینے کی فرمائش، جو لوگ ہم سے کرتے ہیں ان کی اس فرمائش سے ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو ہمیں بھی اسی قماش کا آدمی سمجھتے ہیں اور یہ ہماری توہین ہے یا وہ خود شرافت اور رذالت کا فرق نہیں سمجھتے اور یہ ان کی توہین ہے۔'' ❶

مقالہ نگار صاحب کو یہ اعتراض اور شکایت ہے کہ اس اقتباس میں جناب مودودیؒ نے

❶ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۵۲ء، صفحہ ۷۶-۷۷

پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کے لیے "نامرد، بے حیا اور ناخدا ترس" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ درج ذیل ہی میں اس اعتراض کا جواب دیا جا سکتا ہے:

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن
اِک شور اُٹھا خلافِ تہذیب ہے یہ

یقیناً طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کے طرزِ عمل میں نہ صرف یہی تینوں اوصافِ بد، بلکہ دیگر اوصافِ سیہ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور میری کتاب میں قدم قدم پر اس کے دلائل، براہین، شواہد اور ثبوت موجود ہیں۔ اگر کوئی شتر مرغ کی طرح آندھی کے آثار دیکھ کر ریت میں سر چھپا لے یا اپنے قارئین کو یک طرفہ پراپیگنڈے کے خول میں بند کر کے، انھیں یہ جھوٹا اطمینان دلا دے کہ کتاب زیرِ بحث میں پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام کے اقتباسات کو توڑ مروڑ کر یا سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا گیا ہے تو اس جھوٹ سے حقیقتِ نفس الامری بدل نہیں جائے گی، بلکہ کاذبین کے اکاذیب میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جھوٹے کو جھوٹا، خائن کو خائن، تضاد گو کو تضاد گو، بہتان تراش کو بہتان تراش، اخلاقی نامرد کو اخلاقی نامرد، حیا سے عاری شخص کو بے حیا اور خدا خوفی سے بیگانہ فرد کو ناخدا ترس نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟ "مفکرِ قرآن" صاحب ہی جواباً فرماتے ہیں:

"ہم ایک شخص کو اپنے ذاتی تجربہ اور دلائل و شواہد کی بنا پر جھوٹا اور بددیانت پاتے ہیں۔ ہمارا علیٰ وجہ البصیرت یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہے، ہم اسے دل میں ایسا سمجھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہم ایسے شخص کا ذکر کریں تو کیا اسے جھوٹا اور بددیانت کہیں یا سچا اور نہایت ایماندار؟ ہمارے نزدیک یہ انتہائی بددیانتی ہے اور منافقت ہے کہ جس شخص کو جھوٹا اور بے ایمان (بددیانت) سمجھتے ہیں، اسے محض اس لیے سچا اور ایماندار کہیں کہ اسے جھوٹا کہنے سے اس کے مداحین برا مانیں گے۔" ❶

❶ طلوعِ اسلام، ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶

لہٰذا پرویز صاحب ہی کے اس فرمان کی رو سے بھی ہم یہ بددیانتی اور منافقت نہیں کر سکتے کہ جسے ہم علی وجہ البصیرت، جھوٹا، خائن، متناقض الکلام، بہتان تراش، شرم و حیا سے عاری، خدا خوفی سے فارغ اور آخرت کی جواب دہی سے بے پرواہ پاتے ہیں، اسے ایسا نہ کہیں اور ایسا نہ لکھیں۔ جھوٹے کو جھوٹا اور بددیانت کو بددیانت کہنا، بداخلاقی نہیں بلکہ امر واقعہ کا اظہار ہے۔ متناقض الکلام اور بہتان تراش کو ایسا کہنا خلاف تہذیب نہیں بلکہ اس کی واقعی حیثیت کو بیان کرنا ہے۔ شرم و حیا سے عاری، خدا خوفی سے فارغ اور آخرت کی جواب دہی سے بے پرواہ کو ایسا کہنا گالی نہیں، بلکہ حقیقت نفس الامری کا اعلان ہے۔

سید مودودیؒ پر ''عنایات'':

تاہم اگر آپ اسے گالیاں ہی قرار دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ ان گالیوں سے کہیں زیادہ گالیاں، خود پرویز صاحب علمائے کرام کو بالعموم اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو بالخصوص دیتے رہے ہیں۔ عام علماء کے خلاف سارے جہان کی نفرتیں لفظ 'مُلّا' میں سمیٹ کر جس جس طرح نشانہ بناتے رہے ہیں، اس کی ایک ہلکی سی جھلک میرے اس مقالہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو محدث کے مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں بعنوان'' علمائے کرام کے خلاف، پرویز صاحب کا معاندانہ پراپیگنڈہ'' چھپ چکا ہے۔ باقی رہے مولانا مودودیؒ، تو ان کو دی جانے والی چند گالیاں مقالہ نگار کی خدمتِ اقدس میں نذر ہیں۔ چونکہ یہ سب گالیاں طلوع اسلام میں محفوظ ہیں، اس لیے ماہ وسال اور صفحہ نمبر ہی بطورِ حوالہ درج کیے جا رہے ہیں:

نمبر شمار	مغلظاتِ طلوعِ اسلام	ماہ وسال	صفحہ نمبر
۱۔	ملائیت کا سرخیل (مودودی صاحب)	فروری ۱۹۵۳ء	۱۵
۲۔	اسلام اور پاکستان دونوں کی دشمن (مودودی کی جماعت اسلامی)	اکتوبر ۱۹۵۳ء	۴۵
۳۔	اسلام اور پاکستان، دونوں کے لیے خطرہ (مودودی)	۱۴ مئی ۱۹۵۵ء	۵

۴۔ فتنہ انگیزی کا زہر پھیلانے میں منظم طور پر سرگرم کار	جنوری ۱۹۶۱ء	۴۴ تا ۴۵
۵۔ اپنی مفاد پرستی کے لیے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کرنے والا	جنوری ۱۹۶۱ء	۴۴ تا ۴۵
۶۔ یہودی کی طرح دین ساز	مئی ۱۹۶۳ء	۱۴۹
۷۔ پاکستان کا کھلا کھلا باغی	دسمبر ۱۹۶۳ء	۳۴
۸۔ بیچ بازار کھڑے ہو کر گالیاں دینے والا	جنوری ۱۹۶۴ء	۳۱
۹۔ سرمایہ دارانہ نظام کا حامیٔ اعظم	اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء	۱۴۶
۱۰۔ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والا	دسمبر ۱۹۶۳ء	۴۲
۱۱۔ ہر آن بدلتے ہوئے اور تضاداتی اسلام کا علمبردار،	جنوری ۱۹۶۶ء	۲۳
جس پر اصل اسلام بھی سر پیٹ کر رہ جائے۔	+جنوری ۱۹۶۷ء	۱۲
۱۲۔ جھوٹا اور بے اُصول (جس سے تعاون کرنا ممکن ہی نہیں)......(اداریہ)	جنوری ۱۹۶۸ء	۲ تا ۸
۱۳۔ ساری زندگی تضادات سے بھرپور	اگست ۱۹۶۸ء	۴۹
۱۴۔ جرأت اور دیدہ دلیری سے جھوٹ بولنے والا	فروری ۱۹۶۹ء	۴۰
۱۵۔ مذہبی آمریت کے مقام پر براجمان	فروری ۱۹۷۰ء	۳۲
۱۶۔ صحابہ سے بغض رکھنے والا	جون ۱۹۷۰ء	۶۱
۱۷۔ نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ رسول	فروری ۱۹۷۱ء	۷۸
۱۸۔ ڈھٹائی سے گھٹیا دلی سیاست پر کاربند	ستمبر ۱۹۷۱ء	۶۳
۱۹۔ پاکستان میں اس لیے آیا کہ اسلام کو ذلیل کرے اور پاکستان کو کمزور کرے	جولائی ۱۹۷۳ء	۲۵
۲۰۔ مرزائیت کے نقش قدم چلنے والا، مگر اس سے بھی زیادہ		

خطرناک	دسمبر ۱۹۷۴ء	۲۳
ایضاً	جون ۱۹۷۶ء	۹
۲۱۔ اُمتِ محمدیہ ﷺ سے شدید بغض و عناد رکھنے والا	دسمبر ۱۹۷۴ء	۳۹
۲۲۔ دینِ اسلام کو تفریح سمجھنے والا	ستمبر ۱۹۷۶ء	۱۵
۲۳۔ نفرت کی اشاعت کے مشن کا علمبردار	جنوری ۱۹۷۷ء	۱۴
۲۴۔ سیرتِ رسول ﷺ کو داغدار کرنے کا سازشی بلکہ اس سازش کا بانی	مارچ ۱۹۷۷ء	۱۶
۲۵۔ اسلام کو بدنام کرنے والا	مارچ ۱۹۷۷ء	۱۶
۲۶۔ قرآن کریم کی ابجد سے بھی ناواقف	مارچ ۱۹۷۷ء	۳۱
۲۷۔ قرآن سے کھلا کھلا بغض رکھنے والا	اپریل ۱۹۷۷ء	۲۷
۲۸۔ نظریہ ضرورت کے تحت فتوائے کذب دینے والا	فروری ۱۹۸۳ء	۷
۲۹۔ نظریہ ضرورت کے اسلام کا حامل	جولائی ۱۹۸۳ء	۴۸
۳۰۔ ہوسِ اقتدار میں پاکستان کو جہنم میں دھکیلنے والا	اکتوبر ۱۹۸۵ء	۴۶

یہ وہی مودودیؒ صاحب ہیں، جن کے متعلق کبھی پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

"ترجمان القرآن، ایک ماہانہ مجلہ ہے جو چھ سال سے مسلسل اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشر و تبلیغ کر رہا ہے۔ جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے، اُن کے لیے بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مولانا موصوف کو، اس زمانہ میں اسلام کی خدمت اور ملت کی تجدید کے لیے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے، اور وہ شرحِ صدر، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کرکے، قرآن کریم کی روشنی میں ہر

مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے۔ ترجمان القرآن کا موضوع قرآن حکیم ہے، ایک طرف وہ قرآن حکیم کی روشنی میں تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے، اور دوسری طرف فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے مغربی فلسفہ کا رعب دلوں سے نکال رہا ہے۔

قرآن کریم کو منشاء الٰہی کے مطابق صحیح سمجھنا، صحیح اُصولوں پر اس کی نشر و اشاعت کرنا، اسلام کے خلاف باطل سرچشموں کا پتہ لگانا اور ان کو عقل سلیم کی حجت سے بند کرنا، اسلام کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مخالفت سے مرعوب نہ ہونا، ذہنیتوں میں یکسر انقلاب پیدا کر دینا اور وقت کی مناسبت سے جملہ مشکلات کا حل قرآن کریم سے پیش کرنا وغیرہ وہ خصوصیات ہیں جو **بحمد اللہ** رسالہ ''ترجمان القرآن'' کو حاصل ہیں۔ ہندوستان میں آج کل سیاست کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی فرما رہے ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے از بس ضروری ہے، خصوصاً ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کے لیے جو فلسفہ جدیدہ، سائنس اور مغربی حکماء کی دانش فروشیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں اور جنہوں نے مذہب کو عقل و دانش اور ترقی کے خلاف سمجھ لیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ کو اس رسالہ کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیے، بلحاظ نصب العین اور مسلک ''ترجمان القرآن'' اور ''طلوع اسلام'' کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں سمجھیے۔'' ❶

دو قابل توجہ باتیں:

یہاں میں، قارئین کرام کی توجہ کے لیے دو باتوں کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

☆ ایک یہ کہ پرویز صاحب علمائے کرام اور مولانا مودودیؒ کے خلاف انتہائی دریدہ دہنی

---

❶ (طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۷۸)

کے ساتھ ان پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کو بہ تکرار و اِعادۂ بسیار ...... اس لیے بھی ...... اُچھالا کرتے تھے کہ اس کی آڑ میں خود ان کی اپنی حرکاتِ سیئہ چھپی رہیں۔ چالاک، عیار اور مکار لوگ، بلند نصب العین کا لبادہ اوڑھ کر، تنقید کے پردے میں تنقیص و توہین کرتے ہوئے، دوسروں پر کیچڑ اُچھالا کرتے ہیں تاکہ ان کی اپنی سیاہ عملی مستور و مخفی رہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کو ایک مقام پر خود طلوعِ اسلام نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے میں مقالہ نگار اور دیگر وابستگانِ طلوعِ اسلام کے سامنے اسی اقتباس کا آئینہ پیش کیے دیتا ہوں، تاکہ وہ خود بھی پڑھ لیں:

"اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے تاکہ اس کی اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے اور اسے چھپانے کے لیے، اُس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو، فریبِ نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔" ❶

اور دریدہ دہنی اور تلخ نوائی کے ساتھ علمائے کرام کے خلاف، ان جھوٹے اور باطل الزامات کی بوچھاڑ ...... اس لیے بھی ہے کہ اس سے علماء اور ان کے متبعین کے خلاف، قلوبِ قارئینِ طلوعِ اسلام میں جو نفرت پیدا ہوتی ہے، وہ انہیں متحد رکھنے میں کام آئے، کیونکہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے مخالفین کے خلاف متحد رکھنے کے لیے "حُبِّ علی" سے کہیں زیادہ مؤثر داعیہ "بغضِ معاویہ" ہی کا داعیہ سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اپنے فرقہ منکرینِ حدیث کے تشخص کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے علماء کے خلاف نفرت انگیز، زہریلے اور معاندانہ پراپیگنڈے کی یلغار کو پیہم رواں دواں اور جواں رکھنا، "مفکرِ قرآن" کی ایک مجبوری تھی۔ اور یہ ٹیکنیک انہوں نے بدقسمتی سے اُمتِ مسلمہ ہی کے بعض بے بصیرت پیشواؤں سے اخذ کی ہے، کیونکہ بقول پرویز صاحب:

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۳

> ”فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ اپنے فرقہ کے لوگوں کے دل میں دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے۔ جس قدر نفرت شدید ہوگی، اتنا ہی فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔“ ❶

> ”فرقے ہوں یا پارٹیاں، ان کا جداگانہ تشخص، دوسرے فرقوں یا پارٹیوں کے خلاف جذباتِ نفرت کی بنا پر قائم رہتا ہے۔“ ❷

اور طلوعِ اسلام کی فائل گواہ ہے کہ پاکستان میں پرویز صاحب نے اپنی ساری عمر، علماء کے خلاف، اور (بالخصوص) مولانا مودودیؒ کے خلاف، جذباتِ نفرت کو بھڑکانے اور ہوا دینے ہی میں کھپادی۔

✲ اور دوسری بات یہ کہ 'مفکرِ قرآن' صاحب علماء کے خلاف جو الزامات عاید کرتے رہے ہیں، ان میں بعض قطعی بے اصل، بے بنیاد اور بے سروپا ہیں اور بعض کو اپنے مخالفین کی عبارات کو کانٹ چھانٹ، مسخ و تحریف، سیاق و سباق سے اکھاڑ پچھاڑ، کتربیونت اور خدع و فریب کا نشانہ بناتے ہوئے ”ثابت“ کیا ہے جن کی قلعی میری (زیرِ بحث) کتاب میں کھول گئی ہے۔ جبکہ میں نے پرویز صاحب کے متعلق اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ایسے اٹل حقائق ہیں جنہیں دلائل و براہین اور شواہد و بینات سے ثابت کیا گیا ہے اور جنہیں اگر کوئی عدالتی جج بھی اپنی تحقیق و تفتیش کی جولانگاہ بنائے تو وہ بھی کمپوزنگ کی اغلاط کے سوائے حقائق و واقعات میں کوئی سقم نہیں پائے گا۔

تاہم، میں ”مفکرِ قرآن' صاحب کی اس صلاحیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ بہرحال قلمی صلاحیتوں کے دھنی تھے۔ انہوں نے اپنے زورِ قلم سے گالیاں دینے کو بھی ایک فن بنادیا ہے۔ جناب افتخار احمد بلخی مرحوم ان کی ”ادبی اور قرآنی خدمات“ میں سے تیسری خدمت کا ذکر بایں الفاظ کرتے ہیں:

> ”رہی وہ تیسری خدمت یعنی ذوقِ دشنام طرازی کی تسکین اور اس کے مقتضیات

---

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۱ ❷ ایضاً، نومبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲

سے عہدہ برآ ہونے اور اخلاقی بضاعت کے افلاس پر فریب و ریا کے پردے ڈالے جانے کی خاطر جوگالیوں کو باضابطہ ایک "فن شریف" بنا کر پیش کیے جانے کی صورت میں، پوری سرگرمی کے ساتھ انجام دی جارہی ہے، وہ دراصل اس دورِ ترقی و تجدد کا ایک مرض ہے، جس کے متواتر و پیہم دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اس مرض کو آپ "مُلا خولیا" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ اس مرض کی علت، وہ احساسِ کمتری ہے جو تحت الشعور میں جاگزیں ہے، یا کتاب و سنت میں ادراک و بصیرت کے فقدان کا ایک ردِ عمل ہے جو اس شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔" ❶

"اور اس 'جہادِ اکبر' کے لیے اس ادارے نے جو اسلحہ فراہم کر رکھے ہیں، وہ ذاتی پرخاش، آتشِ حسد، گندگیاں اچھالنے کی فن کاری، تضلیل و تحقیر، تضحیک و استہزاء، کذب و افتراء، اتہام و دشنام طرازی اور اقتدارِ وقت کو اُکسا کر، جبر و تشدد پر آمادہ کرنے کی سعی جیسے "قرآنی" حربے ہیں۔" ❷

❶ فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، حصہ سوم، صفحہ ۴۹

❷ فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، حصہ سوم، صفحہ ۴۸

”نقطۂ نظر“ کی بیان کردہ ”چند کمزوریاں“
اور ان پر مصنفِ کتاب کی معروضات

تبصرہ نگار، جناب اختر راہی نے جگہ جگہ کتاب کی تعریف بھی کی۔ اس کے مندرجات کی تصویب و تائید بھی فرمائی۔ اور مصنف کتاب کے تحقیقی مواد کو فراخدلی سے سراہا بھی۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

۱..... جناب قاسمی نے برسہا برس کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی تفصیل، زیرِ نظر کتاب کے گیارہ ابواب اور ”حرفِ آخر“ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ❶

۲..... پرویز صاحب نے سید مودودیؒ کی عبارتوں کو ان کے زمانی پس منظر سے کاٹ کر پیش کیا، اور اپنے منصف مزاج قارئین کے اعتماد کو ٹھیس لگائی۔ جناب محمد دین قاسمی نے اس کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ (صفحات ۱۳۳۔۱۶۳) ❷

۳..... جناب قاسمی نے واضح کیا کہ پرویز صاحب دوہرے معیار کے حامل تھے، اور عدل و انصاف کے یکسر منافی رویے رکھتے تھے۔ انہوں نے عبارتیں پیش کر کے دکھایا ہے کہ سید مودودی اور پرویز صاحب دونوں کی عبارتیں، دین کا یہ تصور پیش کرتی ہیں کہ: ”متمرد، سرکش اور جاہل افراد کے ہاتھوں سے اقتدار چھین لیا جائے۔“ (ص ۲۱۵) سید مودودیؒ کی عبارت سے پرویز صاحب کو، ان کے ہاں ”فاشسٹ عزائم کی بو آتی ہے، مگر خود، ان کی اپنی عبارت، مطلوب و مقصودِ مومن قرار پاتی ہے۔ ❸

---

❶ نقطۂ نظر، شمارہ ۲۰، صفحہ ۲۷ تا ۲۸ ❷ ایضاً، صفحہ ۲۸ ❸ ایضاً، ص ۲۹

۴..... جو کچھ لکھا گیا ہے، بحیثیت مجموعی درست سیاق و سباق میں پیش کیا گیا ہے۔ پرویز صاحب نے واقعتاً صریح غلط بیانیوں اور افتراء پردازیوں سے کام لیا ہے۔ ❶

۵..... برصغیر کی مسلم فکر و دانش کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے جناب محمد دین قاسمی کی یہ کاوش، امید ہے کہ کشش اور جاذبیت کا باعث ہوگی، اور اگر ان کے ہاں پرویز صاحب کو پیش کرنے میں کوئی جھول ہے تو اہل علم اس کی نشان دہی ضرور کریں گے۔

کتاب سرائے نے مختصر عرصے میں بڑی تعداد میں کتابیں شائع کر دی ہیں۔ اور ان میں بعض بڑی معرکہ خیز ہیں۔ جناب محمد دین قاسمی صاحب کی یہ کاوش بھی آخرالذکر کتابوں میں شامل ہے۔ ❷

کتاب اور مصنف کتاب کی تعریف و تحسین فرمانے کے ساتھ، تبصرہ نگار نے چند کمزوریوں کی نشان دہی بایں الفاظ کی ہے:

”زبردست محنت اور دقتِ نظر کے ساتھ لکھی گئی کتاب میں، دورانِ مطالعہ، کچھ معمولی کمزوریاں بھی سامنے آئی ہیں۔“ ❸

پہلی کمزوری اور اس کا جائزہ:

جناب تبصرہ نگار نے جس پہلی کمزوری کی نشاندہی فرمائی ہے، اس کا تعلق، پرویز صاحب کی اُس مصلحت سے ہے جس کی بنا پر، وہ، قیامِ پاکستان سے قبل، قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت کا بالالتزام ذکر کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں، نہ صرف یہ کہ وہ کھلے کھلے منکرِ حدیث ہوگئے، بلکہ مسلکِ انکارِ حدیث کے علمبردار بھی بن گئے۔ میرے نزدیک، پرویز صاحب، اُس وقت بھی سنتِ رسول ﷺ اور حدیث نبیؐ سے اعتقاداً منحرف تھے جبکہ وہ قرآن کے ساتھ، حدیث و سنت اور اسوۂ رسول کا نام لیا کرتے تھے، بلکہ وہ، اُس دور میں، منکرینِ حدیث کی تردید میں، ایسے مضامین و مقالات بھی لکھا کرتے تھے جن میں حدیث کی دینی حیثیت کو ثابت کیا جاتا تھا۔ اُن دنوں، پرویز صاحب کا رویہ، صرف اس ”مصلحت“ پر مبنی

---

❶ نقطۂ نظر، شمارہ ۲۰، صفحہ ۶۹ ❷ ایضاً، ص ۷۲ ❸ ایضاً، ص ۶۹

تھا کہ وہ عامۃ المسلمین میں معتقدِ سنت قرار پا کر، اُن کے ہاں، اپنے لیے وثوق اور اعتماد کی فضا پیدا کر لیں، اور نہ صرف معتقدِ حدیث بلکہ مدافعِ حدیث کی حیثیت سے "پاپولر" Popular ہو جائیں۔ چنانچہ اسی حقیقت پر (کہ ۱۹۲۸ء ہی میں پرویز صاحب سنت رسول ﷺ سے کٹ کر محض قرآن ہی کی حجیت و سندیت پر قائم ہو چکے تھے) اُن کے مندرجہ ذیل اقتباس کو، میں نے، بطورِ ثبوت پیش کیا تھا:

"مہ و سال کے شمار سے "میں" ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو، اپنی عمر رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں جس کا خصوصیت کے ساتھ طلوعِ اسلام کے صفحات پر ذکر کیا جاتا۔ قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔" ❶

اس سے یہ قطعی واضح ہے کہ ۱۹۷۸ء سے پچاس سال قبل' یعنی ۱۹۲۸ء میں' وہ سنتِ رسول ﷺ سے دامن کش ہو کر، صرف قرآن ہی کی سندیت و حجیت پر ایمان لا چکے تھے، اور فرقہ اہل قرآن سے وابستہ ہو کر پختہ "قرآنی ذہن" بن چکے تھے۔ لیکن اپنے ضمیر و ایمان کے خلاف، اپنے مقالات و مضامین میں، وہ 'مصلحتاً' قرآن کے ساتھ سنتِ رسول ﷺ اور اسوۂ نبی ﷺ کا ذکر کرنے پر ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، اُس دور کے منکرین حدیث کی تردید میں، حدیث کی دینی حیثیت کا اثبات کرنے پر بھی مجبور تھے۔ لیکن میرے اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے، جناب تبصرہ نگار فرماتے ہیں:

"اس سے یہ تو بداہتہً ثابت ہے کہ وہ اپنے قارئین سے اپنا ماضی چھپا رہے ہیں۔ ان کے خیالات ۱۹۲۸ء میں کیا تھے۔ اور وہ "معارف" اور "ترجمان القرآن" میں شائع ہونے والے اپنے مقالات میں کیا کچھ لکھتے رہے تھے؟ مگر اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ وہ بڑی گہری اور طویل پلاننگ کے تحت،

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲ + زیر تبصرہ کتاب، ص ۳۵

عامۃ المسلمین میں اپنا مثبت امیج (Immage) بنانا چاہتے تھے۔ یہ کہنا ہی کافی ہے کہ پرویز صاحب نے وقت کے ساتھ، انکارِ سنت کی گمراہی اختیار کر لی تھی۔" ❶

جہاں تک پرویز صاحب کے اپنے ماضی کو چھپانے کا تعلق ہے، تو یہ ایک متفق علیہ اور شک و شبہ سے بالاتر حقیقت ہے۔ لیکن اصل مسئلہ، جو زیرِ بحث ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد، وہ، اپنے ماضی کو چھپا رہے تھے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں، جب کہ وہ قرآن کے ساتھ، حدیث و سنت کا بھی ذکر کر رہے تھے، تو کیا نیک نیتی کے ساتھ (حدیث کی دینی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے) ایسا کر رہے تھے؟ یا منافقت کا لبادہ اوڑھ کر 'مصلحتاً' ایسا کر رہے تھے تاکہ فرزندانِ اسلام کی نگاہوں میں، قرآن و حدیث اور کتاب و سنت کا خادم قرار پا کر "پاپولریٹی" (Popularity) حاصل کر سکیں۔ میرے نزدیک صورتِ واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ جس حدیث و سنت کو قلمی طور پر ماخذِ اسلام قرار دے رہے تھے، اس پر وہ قلبی اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کے قلبی معتقدات اور قلمی نظریات میں تغایر و تفاوت بلکہ تضاد و تناقض پایا جاتا تھا۔ جناب تبصرہ نگار نے اپنے موقف کی حمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی، مجرد دعویٰ ہی کیا ہے (کہ ایسا نہیں ہے) اور یہ دعویٰ بجائے خود محتاجِ دلیل ہے، جب کہ میں نے اپنے موقف کو، خود پرویز صاحب ہی کے اقتباسات سے (اپنی زیرِ تبصرہ کتاب میں) ثابت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں، مزید دلائل درج ذیل ہیں۔ پرویز صاحب، اپنی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں، جن کی نمایاں خصوصیات، بالترتیب، تقلید، تنقید اور تجدید ایمان ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"میری زندگی کا پہلا تہائی حصہ، اندھی عقیدت کا تھا۔ اس زمانے میں مَیں بھی اسی قسم کی باتیں، محض تقلیداً کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد میری زندگی کا تنقیدی دور آیا جس میں اندھی عقیدت کا تراشیدہ بت پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ یہ لا کا دور تھا جس میں ہر اس عقیدے کی نفی ہوتی چلی گئی جسے بلا سوچے سمجھے اختیار کر رکھا تھا، اور اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جس میں مَیں نے جس عقیدہ کو بھی

---

❶ نقطۂ نظر، شمارہ نمبر ۲۰، صفحہ ۷

مانا "علیٰ وجہ البصیرت مانا" اس طرح یوں کہیے کہ قرآن عظیم کی صداقتوں پر از سر نو ایمان لایا ہوں۔" ❶

۱۹۰۳ء میں متولد ہونے والے پرویز صاحب، ۱۹۷۳ء میں (جب کہ وہ اپنی زندگی کے ان ادوارِ ثلاثہ کا ذکر کر رہے تھے) ستر سال کے تھے۔ اس عمر کا پہلا تہائی حصہ (جو ۲۳، ۲۴ سال پر محیط ہے) اندھی تقلید میں گزرا ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ (۱۹۰۳ + ۲۳، ۲۴ =) ۱۹۲۶ یا ۱۹۲۷ء کے بعد، وہ "اندھے مقلد" نہ رہے تھے، اور یہی وہ دور ہے جس میں حدیث کی حجیت اور سنت کی سندیت سے دستکش ہو کر، فقط "قرآن ہی کی حجیت و سندیت" پر قائم ہو چکے تھے، اور صرف اور صرف قرآن ہی کی بنیاد پر، انسائیکلوپیڈیا لکھنے کا جو منصوبہ وہ بنا چکے تھے، اس کی ابتداء (۱۹۲۸ء) میں معارف القرآن، جلد اوّل کی تصنیف سے ہوئی، جس کا تعارف طلوع اسلام میں بایں الفاظ موجود ہے:

"جناب پرویز صاحب نے سلسلہ معارف القرآن کی ابتدا، ۱۹۲۸ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا "اللہ"، جو بعد میں "من ویزداں" کے نام سے شائع ہوئی۔" ❷

اس کتاب کو قرآن و حدیث یا کتاب و سنت کی بجائے، فقط قرآن ہی کی بنیاد پر تصنیف کیا جا رہا تھا، خود پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"معارف القرآن میں وہی کچھ لکھا گیا ہے، جو میں نے خالص قرآنِ کریم سے سمجھا ہے کہ یہی اس کتاب کا نقطۂ ماسکہ ہے۔" ❸

لیکن یہ کتاب، جس کی تصنیف کا آغاز، ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔ تیرہ سال بعد، ۱۹۴۱ء میں پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ اس دوران، پرویز صاحب کی زندگی میں، دو باتیں، بالکل نمایاں رہی ہیں۔

اولاً: .... یہ کہ، اپنے اُن مقالات و مضامین میں، جو مختلف مجلات میں چھپا کرتے تھے، پرویز صاحب، خود کو معتقدِ سنت اور حامی حدیث ظاہر کیا کرتے تھے، بلکہ اُس دور کے

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۶۰

❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۴

❸ معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۵۳

منکرینِ حدیث کے خلاف، دفاعِ سنت کے سرگرم مجاہد کا روپ اپنایا کرتے تھے، حالانکہ اپنے سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی کڑی کو "خالص قرآن" کی بنیاد پر تصنیف کر رہے تھے۔ کیا قلم وقلب کی اس مغایرت کو، جناب تبصرہ نگار، واقعی پرویز صاحب کے خلوصِ قلب پر مبنی سمجھتے ہیں؟ ان کے قلبی طرزِ فکر اور قلمی طرزِ عمل میں پائے جانے والی ثنویت کو، فاضل تبصرہ نگار کیا حقیقتاً ان کی "پاکیزگی نیت" اور "دیانت داری" پر محمول سمجھتے ہیں؟ بلکہ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں شروع ہونے والی تصنیف کی اشاعت کو ۱۹۴۱ء تک مؤخر اس لیے کیا گیا کہ اس کی اشاعت سے پہلے پہلے، پرویز صاحب، اپنے مقالات ومضامین کے ذریعے، عامۃ الناس میں اپنے معتقدِ سنت اور حامیٔ حدیث ہونے کے تاثر کو قائم کر ڈالیں۔ آخر اس امر کی کیا توجیہ، فاضل تبصرہ نگار فرمائیں گے کہ وہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۱ء تک، معارف القرآن کو تو صرف قرآن ہی کی بنیاد پر لکھتے رہے ہیں، لیکن اسی تیرہ سالہ دور میں مختلف مجلات میں، وہ اپنی جو نگارشات چھپواتے رہے ہیں، وہ حجیتِ حدیث اور سندیتِ سنت پر مبنی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب، متفرق مجلات میں چھپنے والی اپنی نگارشات کو، مسلکِ انکارِ حدیث کی روشنی میں پیش کرتے، تو وہ "معارف"، "ترجمان القرآن"، "صدق" یا کسی اور رسالہ میں شائع نہ ہو سکتی تھیں۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ جن عقائد ونظریات کی بنیاد پر وہ معارف القرآن لکھ رہے تھے، انہیں وہ اپنے دل کی کال کوٹھڑی میں محبوس رکھیں، اور مجلاتی نگارشات کو اپنے ضمیر کے خلاف، ان افکار ونظریات کی روشنی میں پیش کریں جو امتِ مسلمہ میں مسلّم ومتداول ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کسی رسالہ میں، ان کا کوئی مضمون نہ چھپتا، اور وہ گمنامی کی حالت میں دم گھٹ کر مرجاتے۔ اس لیے انہوں نے مسلم عوام میں "پاپولر" ہونے کے لیے، وہ ٹیکنیک اختیار کی جو ان ہی کے ہم نام، (مرزا) غلام احمد (قادیانی) نے اختیار کی تھی۔ اور جس کا ذکر، میں نے اپنی (زیرِ تبصرہ) کتاب کے صفحہ ۳۰ پر کیا ہے۔

ثانیاً: .... یہ کہ اپنے "اندھی تقلید" کے دور کے بعد (یعنی ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کے بعد) پرویز صاحب جن لوگوں کے ساتھ، ہم پیالہ وہم نوالہ رہے ہیں۔ وہ خود فتنۂ انکارِ حدیث

کے علمبردار تھے۔ اور یہ چیز، خود ان کے قلبی رجحانات کی عکاس ہے۔ مثال کے طور پر پرویز صاحب کے اُس دور کے سند بند منکر حدیث، اسلم جیراجپوری کے ساتھ، جو تعلقات استوار ہوئے، ان کی تہہ میں نظریات کی ہم آہنگی ہی کارفرما تھی، کبھی میری رائے یہ تھی کہ پرویز صاحب کے ذہنی انحراف کا باعث اسلم جیراجپوری تھے، لیکن بعد میں میری رائے بدل گئی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ "شاہین بچہ" صحبت زاغ سے پہلے ہی خراب ہو چکا تھا جیسا کہ اس اقتباس پرویز سے ظاہر ہے:

"غالباً ۳۱-۱۹۳۰ء کا ذکر ہے۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے متعلق، ایک مضمون دیکھا۔ اس کا بیشتر حصہ خود میرے خیالات کا ترجمان تھا، لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مجھے کچھ تردد بھی تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس موضوع پر، اس قسم کا مضمون دیکھا۔ سلجھی ہوئی عبارت، خیالات صاف اور واضح، سادہ انداز اور الفاظ کم از کم، لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب محکم اور بجود خزیدہ، دلائل دلکش، تبحر عالمانہ، لیکن اسلوب بحث طالبعلمانہ، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔" ❶

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ ۳۱-۱۹۳۰ء تک، پرویز صاحب اپنے قلب و دماغ کو کچھ واضح افکار ونظریات کی آماجگاہ بنا چکے تھے۔ اور یہ مضمون ایسا تھا کہ بقول پرویز صاحب، "اس کا بیشتر حصہ، خود ان کے خیالات کا ترجمان تھا"۔ پھر اس مضمون کی تعریف میں ان کا یہ کہنا کہ ...."سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے"..... خود اس بات کی دلیل ہے کہ فکری طور پر "وہ" اپنے رسول ﷺ کی سنت اور اسوۂ حسنہ سے اپنا تعلق توڑ چکے تھے، اور ان کا ذہن، اب "قرآنی ذہن" تھا۔ جو ہاتھی کے اصل کھانے والے دانتوں کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور دکھانے والے دانت وہ تھے، جو قرآن وسنت کی بنیاد پر، مجلات میں چھپنے والی ان کی نگارشات سے ظاہر ہوتے تھے۔ کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بغیر محمد ﷺ، کا مسلک

❶ طلوع اسلام، ۲ جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ ۷

نامعقول، معارف القرآن کی تصنیف کا منظر ما سکتا تھا، اور کتاب مع پیغمبر اور قرآن مع محمد ﷺ کا معقول مسلک، ان کی مجلاتی نگارشات میں پایا جاتا تھا، اور ان دونوں مسالک متفرقہ کا اظہار ایک ہی دور میں، دو مختلف قسم کی نگارشات پرویز میں ہو رہا تھا:

بہر حال، یہ تھی اسلم جیراجپوری سے پرویز صاحب کی "پہلی ملاقات"۔ اپنی اسی "پہلی ملاقات" کے ضمن میں پرویز صاحب فرماتے ہیں:

> "میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عند الفرصت مولانا سے یہ کتابیں، از سر تو پڑھ لوں۔ چنانچہ غالباً ۱۹۳۵ء میں، مَیں نے اس کے متعلق، مولانا سے ذکر کیا، اور وہ اس کے لیے بخوشی راضی ہو گئے۔ چنانچہ شملہ سے تنہا دہلی آ گیا، اور چونکہ مولانا بھی، اُس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لیے فیصلہ یہی ہوا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ ماہ کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھا۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی کو دور کرنے کے لیے، لیکن [وہ جو کہتے ہیں کہ...... آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے ......] ہمارا بیشتر حصہ، قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا۔" ❶

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی ادب میں ناپختگی کو دور کرنا ہی مقصود تھا، تو اس کے لیے دہلی میں، اسلم جیراجپوری سے کہیں بڑھ کر ہستیاں موجود تھیں، جن سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً:

> "عربی دانی کے لیے، وہ مولانا عبدالسلام نیازی کی صحبت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے ...... اسی دلی میں مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے فاضل روزگار عالم بھی موجود تھے جن کے درس و وعظ میں نازک و غامض دینی اور کلامی مسائل کی گرہیں کھلتی تھیں، سب سے زیادہ معروف شخصیت مولانا کفایت اللہ مرحوم کی تھی، جن کے علم و فضل

---

❶ طلوع اسلام، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۷

اور صالحیت و تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ بقید حیات تھے، جن کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی .... ان تمام ارباب کمال کو نظر انداز کر کے، پرویز صاحب کی نگاہِ انتخاب پڑی تھی تو کس پر؟ مولانا اسلم جیراجپوری پر، جو عبداللہ چکڑالوی کے "مسلکِ انکارِ حدیث" کا بوریا سنبھالے بیٹھے تھے .... لیکن اس قسم کے حق پسند علماء کو چھوڑ کر پرویز صاحب نے مولانا اسلم جیراجپوری کی راہنمائی اور قیادت کو قبول کیا۔" ❶

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہاں پھر دو باتیں، قابلِ غور ہیں:

اوّلاً: .... یہ کہ ایک طرف تو پرویز صاحب (۱۹۳۵ء میں) اپنے قلبی رجحانات کے تحت، سنت نبوی سے گریزاں ہوتے ہوئے، اسلم جیراجپوری جیسے کٹر منکر حدیث سے استفادہ کر رہے تھے، اور اس کے ساتھ ہی معارف القرآن نامی کتاب کی تصنیف "قرآن خالص" کی بنیاد پر مکمل کر رہے تھے، اور دوسری طرف ٹھیک اسی زمانہ میں ۱۹۳۵ء کے مارچ اپریل کے "معارف" میں منکرین حدیث کی تردید و مخالفت کرتے ہوئے، حدیث کی دینی حیثیت کا پرزور اثبات کر رہے تھے۔ یہ فکر و عمل کا کھلا ہوا تضاد و تناقض ہے، جن میں سے کسی ایک ہی طرزِ عمل کو "دیانتداری" اور "نیک نیتی" اور "خلوص قلب" پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا طرزِ عمل لامحالہ "منافقت" اور "مصلحت پرستی" پر ہی محمول قرار پائے گا۔

ثانیاً: .... یہ کہ عربی زبان و ادب میں ماہر، مشاق اور حاذق اربابِ فضل و کمال کو چھوڑ کر، پرویز صاحب کا اسلم جیراجپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ مسلکِ انکارِ حدیث کے حوالہ سے دونوں افراد (استاد اور شاگرد) تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ کے رشتہ میں منسلک تھے ......

❶ قرآن کی معنوی تحریف، قرآن کے نام پر، صفحہ ۸۱ تا ۸۲

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز ۔۔۔ کبوتر با کبوتر ، باز با باز

یہ حقائق، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ اگرچہ اسلم جیراجپوری سے، پرویز صاحب کی "پہلی ملاقات" سے قبل بھی، اور اس کے بعد بھی، وہ، سنت رسول ﷺ اور اسوۂ نبی ﷺ سے اپنا اعتقادی رشتہ توڑ چکے تھے، لیکن وہ اپنی زبان اور قلم سے، مصلحتاً، ان ہی خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور تھے جو ملت مسلمہ میں مقبول و مسلّمہ تھے، کیونکہ اس کے بغیر، وہ، مسلم عوام میں "پاپولر" نہیں ہو سکتے تھے، اور "پاپولر" ہونے کے لیے، جو اصول کارگر اور مفید ہیں، ان کا ذکر، خود پرویز صاحب نے بایں الفاظ کیا ہے:

"مختصر یہ کہ اصول ہوں یا فروع۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو کچھ آپ ہیں، وہ ظاہر نہ ہونے پائے، اور جو ظاہر ہوں وہ حقیقت نہ ہو۔ جو کچھ محسوس کریں وہ کہیں نہیں، اور جو کچھ کہیں، وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔ قلب و زبان میں ہم آہنگی کبھی نہ ہو۔ اور اس روش کا نام پالیٹکس یا مصلحت رکھ لیں، بس پاپولر ہونے کی سکیم کا کامیاب ہونا یقینی۔ اور یہ آخری ڈگری ہے جو اخلاقی یونیورسٹی سے آپ کو مل سکتی ہے۔" ❶

اور پرویز صاحب، اخلاقی یونیورسٹی سے یہی آخری ڈگری پا کر، جو کچھ اپنے قلم سے، اس دور میں ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ ان کے دل میں نہ تھا، اور جو کچھ ان کے دل میں تھا، اُسے وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے، اور یہ سب کچھ "پاپولر" بننے کی اسکیم ہی کے پیش نظر تھا۔

دوسری کمزوری اور اس کی حقیقت:

کتاب زیر تبصرہ میں دوسری کمزوری کو، جناب تبصرہ نگار نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

"سید مودودیؒ کے بارے میں لکھتے ہوئے، جناب محمد دین قاسمی نے، پروفیسر افتخار احمد کی کتاب "عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین (لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء) کے حوالے سے ان کی کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں سید مودودیؒ کی

❶ طلوع اسلام فروری ۱۹۴۱ء ص ۱۴

ایک تالیف "سیرت نظام الملک آصف جاہ اول" ۱۹۲۹ء، حیدر آباد دکن، کا ذکر کیا ہے، اور اس کے بارے میں یہ لکھا ہے "بعد میں یہ کتاب مضامین کی شکل میں الجمعیت کے ماہ جون ۱۹۳۲ء کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی تھی۔ (ص ۲۰۹)۔ اسی طرح سید مودودی کی، ایک اور کتاب "تحریک خلافت کے دورِ شباب" (؟) کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ص ۲۰۹) غالباً یہ اطلاعات درست نہیں۔ کیا "سیرتِ نظام الملک آصف جاہ اول" سے مراد، سید مودودی کی تالیف "دکن کی سیاسی تاریخ" ہی تو نہیں؟" ❶

فاضل تبصرہ نگار کا یہ فرمانا کہ... "غالباً یہ اطلاعات درست نہیں"... خود ان کے عدمِ وثوق اور عدمِ تحقیق پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے وہ خود "غالباً" کے لفظ سے شک کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پھر نامعلوم، بے بنا شک پر مبنی، انھوں نے یہ سوال کیسے اٹھا دیا کہ... "کیا سیرتِ نظام الملک آصف جاہ اول" سے مراد، سید مودودی کی تالیف "دکن کی سیاسی تاریخ" ہی تو نہیں"..... حالانکہ اول الذکر کتاب، ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی، جب کہ موخر الذکر کتاب ۱۹۳۵ء میں۔ پھر پروفیسر افتخار احمد مرحوم، جن کی کتاب سے، میں نے یہ مواد لیا ہے، خود صاحبِ تحقیق اور ثقہ ہستی تھے، اس لیے میں، اس میں کوئی کمزوری یا کوتاہی محسوس نہیں کرتا۔ ہاں، البتہ اگر فاضل تبصرہ نگار، ٹھوس دلائل کے ساتھ، اپنے موقف کو ثابت فرما دیں، تو مجھے ان کے موقف کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔

تیسری کمزوری اور اس کی اصلیت:

میری کتاب میں موجود تیسری کمزوری کا ذکر، جے ایم ایس بلجون کی ایک کتاب (Modern Muslim Koran Interpretation) کے ترجمۂ عنوان کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام کے ترجمہ پر اعتراض کرتے ہوئے، خود میں نے یہ لکھا تھا:

"یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عنوانِ کتاب کا جو ترجمہ "عصرِ جدید کے مفسرین

---

❶ نقد و نظر، شمارہ تبصرہ، ص ۷۰-۷۱

قرآن" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وہ قطعی غلط ترجمہ ہے۔ صحیح ترجمہ یا تو یہ ہے کہ "تجدد پسندانہ مسلمانوں کی ترجمانیٔ قرآن" یا پھر یہ کہ "قرآنِ مسلم کی تجدد پسندانہ ترجمانی"۔ ❶

خود میرے ترجمۂ عنوان پر، جناب تبصرہ نگار نے یہ اعتراض فرمایا ہے:

"طلوعِ اسلام کے ترجمۂ عنوان میں لفظ Muslim تو رہ گیا ہے، مگر Modern کا ترجمہ "تجدد پسند" بھی چنداں درست نہیں۔ تجدد پسند تو Modernist کا ترجمہ ہے۔ Modern کا نہیں۔" ❷

کاش! فاضل تبصرہ نگار، عنوان کتاب کے چار الفاظ پر مشتمل مرکب کا اپنا ترجمہ بھی پیش کر دیتے، تا کہ مجھے اپنے ترجمہ کی غلطی یا کمزوری کا احساس ہو جاتا، اور اگلے ایڈیشن میں، میں اس کی اصلاح کر ڈالتا۔

میری غلطی پر مبہم انداز میں اشارہ کرتے ہوئے، لیکن متبادل ترجمہ پیش نہ کرتے ہوئے، آگے سرک جانے پر، میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ:

کون دیکھے یہ بے بسی دل کی
چل دیے یونہی دل کو تڑپا کر

چوتھی کمزوری اور اس کی حقیقت:

چوتھی کمزوری، فاضل تبصرہ نگار کے نزدیک، میرے اُس استدلال سے تعلق رکھتی ہے، جو میں نے عالم کفر میں، پرویز صاحب کی پذیرائی پر کیا تھا۔ اس پذیرائی پر طلوعِ اسلام، خوشی سے نہال ہے کہ: "چلو! عالم اسلام میں نہیں، تو دنیائے کفر میں تو پرویز صاحب کی پذیرائی پائی جاتی ہے۔" اس سلسلہ میں، میرا استنتاج، ان الفاظ میں مذکور تھا (اور ہے):

"یہ خراجِ تحسین، یہ تعریف و توصیف، یہ تہنیت و پذیرائی، یہ گلہائے عقیدت،

❶ کتاب زیرِ تبصرہ "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں"، صفحہ ۴۰
❷ نقطۂ نظر، شمارہ نمبر ۲۰، صفحہ ۷۱

"وہ مفکر قرآن" (پرویز صاحب) کو یہودی عیسائی کافر دلادین علماءِ مغرب کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ کیوں؟ کس لیے؟ صرف اور صرف اس لیے کہ جو "انقلابی اسلام" انہوں نے پیش کیا ہے، وہ مغربی ممالک کے سیاسی اغراض و مقاصد کے عین مطابق ہے، اس لیے وہ "مفکر قرآن" جناب چوہدری غلام احمد پرویز سے انتہائی خوش ہیں۔" ❶

میں نے اپنی زیرِ تبصرہ کتاب میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا تھا کہ:

"کیا یہ "انقلابی اسلام" فی الواقعہ، اشتراکی نظامِ معیشت اور مغربی معاشرت کے لوازمات کو قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرنے کی وہ سازش نہیں ہے جو امریکہ اور یورپ کی مادہ پرست تہذیب کو اس لیے پسند ہے کہ اس "انقلابی اسلام" کو محمد رسول اللہ والذین معہ کے حقیقی اسلام کا متبادل قرار دیا جا رہا ہے۔ یوں دین اسلام میں رخنہ اندازی اور پیوندکاری، امریکی یورپی اور اشتراکی حکومتوں کے سیاسی اغراض کے عین مطابق ہے، کیونکہ بقول طلوعِ اسلام (۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۳)...... "مغربی ممالک، خواہ وہ یورپ ہو، یا امریکہ، اسلامیات کی طرف خالص علمی نقطۂ نظر سے توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ کے سامنے بھی اپنے سیاسی مقاصد تھے۔ اسی طرح امریکہ کے پیشِ نظر بھی اپنے سیاسی مصالح ہیں"..... ❷

میرے اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے، فاضل تبصرہ نگار فرماتے ہیں:

"صورتِ حال یہ ہے کہ مستشرقین اور مغربی جامعات سے وابستہ اہلِ علم، مسلم معاشروں کی تفہیم کے لیے کوشاں ہیں۔ انہیں، اس سے چنداں غرض نہیں کہ صحیح تعبیر کس کے ہاں ہے اور کس کے ہاں نہیں؟ ان کے ہاں ہر وہ فرد اور ہر وہ گروہ علمی توجہ کا مستحق ہے جو مسلم معاشروں میں ہلچل کا باعث ہے۔ مستشرقین کو یہ

---

❶ کتاب زیرِ تبصرہ "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" صفحہ ۲۲۲

❷ زیرِ تبصرہ کتاب "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸

جاننے کی ضرورت نہیں کہ ہلچل کیوں ہے؟" ❶

جی نہیں! مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ مستشرقین اور مغرب کے اہل علم، اگر مسلم معاشروں کا فہم پانا چاہتے ہیں، تو اس کی بھی کوئی غرض، کوئی غایت، کوئی علت یا کوئی مصلحت ہوگی۔ بغیر کسی مقصد کے "فہم برائے فہم" کی روش اپنانا، ایک غیر معقول طرزِ عمل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ...... "مستشرقین کو یہ جاننے کی ضرورت نہ ہو کہ ہلچل کیوں ہے"...... مگر وہ یہ ضرور جاننا چاہتے ہیں کہ...... "یہ ہلچل، مغربی تہذیب اور اس کے اصول و اقدار کے حق میں ہے یا مخالفت میں"...... اگر خلاف ہو تو ہلچل پیدا کرنے والے عناصر کو "بنیاد پرست"، "دہشت گرد"، "روشن خیالی کے دشمن"، "قدامت پرست"، "اعداءِ ترقی اور دلدادگانِ پسماندگی" قرار دے کر، اُن مسلمان حکمرانوں سے انہیں کچلوا دینا چاہتے ہیں، جو مغربی نظریات کا دودھ پی پی کر پلے بڑھے ہیں۔ لیکن اگر یہ ہلچل، مغرب کے حق اور مفاد میں ہو، تو اسے پیدا کرنے والے عناصر کی حوصلہ افزائی کو، اہل مغرب اپنا فریضہ سمجھتے ہیں، اور دامے، درمے، قدمے، سخنے، ان کی مدد کرتے ہیں۔ عوامی سطح پر مغربی حکومتیں، اُن این جی اوز کے ذریعہ، ایسے عناصر کی تائید و تقویت کا موجب بنتی ہیں، جو اسلام کا نام لے کر، اسلام ہی کی مخالفت کرتے ہیں، اور اپنے دروس و مقالات میں، قرآن ٹھوس کر ایسی تعبیرِ دین پیش کرتے ہیں، جو مغربی معیار پر پوری اترتی ہے۔ پرویز صاحب کا "انقلابی اسلام" اور ان کی ستاون سالہ "قرآنی خدمات"، اسلام کی ایسی ہی تعبیر پر مشتمل ہیں جو عالم کفر کو پسند ہیں۔ اور ہمارے ملک میں غیر ملکی سرمائے سے چلنے والی این جی اوز کے "مسلمان" کارکن، پرویز صاحب کے "انقلابی اسلام" کو پھیلانے کے لیے، پرویز صاحب ہی کا لٹریچر استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس امر کا اعتراف، خود طلوعِ اسلام کا ایک مقالہ نگار، بایں الفاظ کرتا ہے:

> "راقم سطور کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان تمام .N.G.Os میں طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" موجود رہتی ہے، جس میں عورتوں کے حقوق

❶ نقطۂ نظر، شمارہ نمبر ۲، صفحہ ۷۱ تا ۷۲

سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ N.G.Os. وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔"

تاہم، اگر فاضل تبصرہ نگار، ان حقائق کے بعد اور باوجود بھی، اپنی رائے پر قائم رہنا چاہیں تو ان کی مرضی۔

کتاب کی زبان اور اندازِ بیان:

کتاب کی زبان اور اندازِ نگارش پر، بڑے ہلکے پھلکے انداز میں، تبصرہ فرماتے ہوئے، ایک مقام پر تبصرہ نگار لکھتے ہیں:

> ''کتاب پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ زیر نظر کتاب، جناب پرویز صاحب کے خلاف لکھی گئی ہے، اور زبان و بیان میں کچھ تلخی بھی ہے، تاہم جو کچھ لکھا گیا ہے بحیثیت مجموعی درست سیاق و سباق میں پیش کیا گیا ہے، پرویز صاحب نے واقعتاً صریح غلط بیانیوں اور افتراء پردازیوں سے کام لیا ہے، اور یہ رویہ کسی منصف مزاج مصنف کا نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ کسی خادم قرآن کا ہو۔'' ❷

یہ بات میرے لیے انتہائی حیرت کا باعث ہے کہ وابستگانِ طلوعِ اسلام نے اپنے مقالہ ''شمع اخیر شب'' میں (جو جون ۲۰۰۶ء میں چھپا) زبان و بیان کی تلخی کا قطعاً ذکر نہیں کیا، کجا یہ اسے نشانۂ اعتراض بنایا ہو، لیکن ''نقطۂ نظر'' کے تبصرہ نگار، زبان و بیان کی تلخی کا گلہ فرما رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ اس کی وجہ، میرے نزدیک، یہ ہے کہ ''نقطۂ نظر'' کے تبصرہ نگار کو ''طلوعِ اسلام'' میں استعمال ہونے والی اُس تند و تیز، تلخ، تمخیلا اور کرخت زبان و بیان کا علم ہی نہیں ہے، جو خود پرویز صاحب، علماءِ کرام کے خلاف بالعموم اور سید مودودیؒ کے خلاف بالخصوص استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور چونکہ وابستگانِ طلوعِ اسلام کو یہ معلوم ہے اس لیے وہ یہ گلہ نہیں کر سکتے۔ پرویز صاحب، اپنے فکری مخالفین کے خلاف، جس قسم کی سوقیانہ زبان استعمال کیا کرتے تھے، اس کے متعلق افتخار احمد بلخی مرحوم نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ:

❶ طلوعِ اسلام، جون ۲۰۰۵ء، صفحہ ۴۹

❷ نقطۂ نظر، شمارہ نمبر ۲۰، صفحہ ۶۹

"ذوقِ دشنام طرازی کو ایک فن بنا کر، طعن و تشنیع، طنز و استہزاء اور تضحیک کی وہ تیسری خدمت ہے جو تقسیم کار کے اُصول سے اس ادارہ (طلوعِ اسلام) نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔

چنانچہ کتاب کے ساتھ سنت کو بھی دینی حیثیت باور کرنے والے دین دار طبقہ اور اسلام اور شعائرِ اسلام کی توہین و تضحیک کی خاطر، جو ایک اصطلاح "مُلّا اور مُلّائیت" کی وضع کی گئی تھی، اس اصطلاح کی آڑ میں، دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے، اس فنِ دشنام طرازی کی بے محابا نمائشیں کی جاتی ہیں۔

یہ تیسری خدمت، اس لیے بھی پوری دلچسپی کے ساتھ، ایک اہم کے انداز سے انجام دی جا رہی ہے کہ اخلاقی بضاعت کے افلاس پر فریب و ریا کے پردے ڈالے جائیں اور احساسِ کمتری کے جو یہ حضرات شکار ہیں، تو اس باب میں تسکینِ خاطر کے کچھ ساماں فراہم ہو سکیں۔

اس کے علاوہ علم و فن میں، اپنی ناپختہ کاری کی پردہ پوشی بھی، اس تیسری خدمت کے پسِ پردہ مطلوب ہے۔" ❶

اور مولانا مودودیؒ نے طلوعِ اسلام میں استعمال ہونے والی زبان کے متعلق، ایک مرتبہ فرمایا تھا:

"یہ لوگ دینی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو لیے کھڑا ہو، اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔" ❷

۳۱ مارچ ۲۰۰۶ء کے فرائیڈے اسپیشل میں ملک نواز احمد اعوان صاحب (کراچی) نے میری اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا، اس سے طلوعِ اسلام کے بارے میں، ان

---

❶ فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، حصہ سوم، صفحہ ۲۰۴ ❷ رسائل و مسائل، جلد ۲، صفحہ ۵۰

کی وسعت واقفیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے کتاب کی زبان کے حوالہ سے یہ تحریر فرمایا کہ:

"کتاب میں جگہ جگہ نفیس علمی تحقیقات بکھری ہوئی ہیں۔ قاسمی صاحب نے کتاب کی زبان وہی رکھی ہے جو پرویز صاحب استعمال کرتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ زبان، اپنی ہی استعمال کی جائے تو مناسب و احسن ہوگا۔" ❶

الغرض اپنی کتاب میں، میں نے پرویز صاحب کے لیے، جو الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، ان میں کوئی لفظ بھی ایسا ہی نہیں ہے جو خود پرویز صاحب نے، علماءِ کرام اور بالخصوص مولانا مودودیؒ کے بارے میں استعمال نہ کیا ہو۔

آخر میں، میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں طبعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ علمی مباحث میں تلخ لب و لہجے سے کام لیا جائے، اور امکان کی آخری حد تک، میں نے اس احساس کو پیش نظر رکھا ہے، لیکن جن قارئین نے طلوعِ اسلام میں شائع شدہ "مفکرِ قرآن" جناب غلام احمد پرویز صاحب کے اندازِ تحریر کو ملاحظہ فرمایا ہے، وہ اس امر سے اتفاق کریں گے کہ آخر الامر، ایک سنجیدہ مزاج انسان بھی جواباً اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو شخص، جس انداز میں بات کرنے اور سمجھنے کا عادی ہو، اُس سے اسی انداز میں بات کی جائے، تاکہ وہ حسبِ عادت، اِسے آسانی سے سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ میری کتاب ...... "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" ...... میں، بعض مقامات پر، سخت اندازِ بیان کی جس کیفیت کو، محترم تبصرہ نگار نے محسوس فرمایا ہے، وہ اگرچہ میرے طبعی منشا کے خلاف ہے، لیکن بہرحال وہ اسی مجبوری کی آئینہ دار ہے۔

---

❶ فرائیڈے اسپیشل، ۳۰ مارچ ۲۰۰۶ء، صفحہ ۳۰ تا ۳۱

کتابیات

۱۔ ابن منظور۔ ''لسان العرب'' ......نشر ادب الحوزہ، قم، ایران

۲۔ اسماعیل، مولانا محمد ......سلفی۔ ''تحریک آزادیٔ فکر'' ...مکتبہ نذیریہ، لاہور

۳۔ افتخار احمد پروفیسر ''عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین......سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ''......نو وی پرائیٹ پبلشرز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۴۔ اقبال، علامہ ڈاکٹر محمد......۔ ''کلیاتِ اقبال'' ......شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز لاہور، حیدرآباد، کراچی۔ III۔ جون ۱۹۹۶ء

۵۔ بٹالوی، عاشق حسین۔ ''ہماری قومی جدوجہد (جنوری ۱۹۳۹ء تا دسمبر ۱۹۳۹ء)'' ......مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور۔

۶۔ لجنی، افتخار احمد۔ ''فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر'' ......مکتبہ چراغ راہ، کراچی

۷۔ بلوچ، محمد علی......۔ ''حدیثِ دلگدازے''

۸۔ پرویز، غلام احمد۔ ''اقبال اور قرآن'' ...... ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ IV۔ ۱۹۹۶ء

۹۔ .... ''تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱'' ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔

۱۰۔ .... ''تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲'' ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

۱۱۔ .... "تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳" ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ لاہور، پاکستان۔ نومبر ۱۹۷۹ء۔

۱۲۔ .... "تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴" ... ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ نومبر ۱۹۸۱ء۔

۱۳۔ .... "تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷" ......ادارہ طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ ۱۹۹۵ء۔

۱۴۔ .... "جوئے نور" ......ادارہ طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ V۔ جولائی ۱۹۹۴ء۔

۱۵۔ .... "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" .....ادارہ طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ V۔ جولائی ۱۹۹۸ء۔

۱۶۔ .... "شاہکار رسالت" ...... ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ IV۔ ۱۹۸۷ء

۱۷۔ .... "طاہرہ کے نام" ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ III۔ ۱۹۷۴ء۔

۱۸۔ . ... "لغات القرآن، ج ۲" ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ I۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء۔

۱۹۔ ... . "لغات القرآن، ج ۳" ......ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔ I۔ جنوری ۱۹۶۱ء۔

۲۰۔ .... "معارف القرآن، ج ۱" ......ادارہ طلوع اسلام، دہلی۔

۲۱۔ .... "معارف القرآن، ج ۲" .... (۱) معارف القرآن، ۳۷ ترکمان روڈ، نئی دہلی۔ (۲) ڈاکٹر اے حمید (ہومیو پیتھ) فتح پوری، دہلی۔

۲۲۔ .... "معارف القرآن، ج ۳"۔ معارف القرآن، ۳۷ ترکمان روڈ، نئی دہلی۔

۲۳۔ .... "مقامِ حدیث"..... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور، پاکستان۔۱۹۹۲ء

۲۴۔ .... "نظامِ ربوبیت"..... ادارہ طلوع اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور، پاکستان۔II۔۱۹۷۸ء۔

۲۵۔ ثعالبی، امام ابو منصور۔"فقہ اللغہ"..... شرکۃ مکتبۃ مطبعہ، مصطفیٰ البابی الحلبی، واولادہ، مصر۔ II۔۱۹۵۴ء

۲۶۔ جلالی، عبدالدائم + نعمانی، عبدالرشید۔"لغات القرآن"..... ناشر شاہد نذیر خان، یوسفی مجددی۔

۲۷۔ راغب اصفہانی۔"مفردات"..... نور محمد اصح المطابع، کارخانہ بازار، تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

۲۸۔ قدوسی، اعجاز الحق۔"اقبال اور علماء پاک و ہند"

۲۹۔ مجلس ارشادیہ..... "فیصلہ مقدمہ بہاولپور"..... محفل ارشادیہ سیالکوٹ، پاکستان۔جون ۱۹۷۳ء۔

۳۰۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔"اسلام اور ضبطِ ولادت"..... اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ فروری ۱۹۹۹ء۔

۳۱۔ .... "اسلام کا نظریہ سیاسی"..... اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۰ء۔

۳۲۔ .... "اسلامی ریاست"..... اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ فروری ۱۹۶۷ء۔

۳۳۔ .... "تحریک آزادی ہند اور مسلمان، ج ۱"..... اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ فروری ۱۹۶۸ء۔

۳۴۔ .... "تحریک آزادی ہند اور مسلمان، ج ۲"..... اسلامک پبلیکیشنز

(پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۳ لوئر مال روڈ، لاہور۔ XI ۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

۳۵۔ .... "تفہیمات، جلد سوم"۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ مارچ ۱۹۶۵ء۔

۳۶۔ .... "خطبات"۔ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۳ لوئر مال روڈ، لاہور۔ مارچ ۲۰۰۳ء۔

۳۷۔ .... "رسائل و مسائل، جلد دوم" ...... اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ ۱۷۔ مارچ ۱۹۶۷ء۔

۳۸۔ .... "سنت کی آئینی حیثیت"۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۶۳ء۔

۳۹۔ .... "روداد جماعت اسلامی، حصہ اول" ...... شعبہ نشر و اشاعت، جماعت اسلامی، منصورہ، لاہور۔ XIII ۔ مارچ ۱۹۸۵ء۔

۴۰۔ .... "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"۔ دفتر ترجمان القرآن، دارالاسلام، جمال پور، متصل پٹھان کوٹ۔

۴۱۔ ندوی، شاہ معین الدین۔ "سیر الصحابہ، ج: ۵" ...... ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی، لاہور۔

۴۲۔ فائل مجلہ طلوع اسلام۔

۴۳۔ فائل مجلہ ترجمان القرآن۔

۴۴۔ فائل مجلہ محدث۔

۴۵۔ مجلہ "فرائیڈے سپیشل"۔ کراچی

۴۶۔ مجلہ "نقطۂ نظر"۔ اسلام آباد

۴۷۔ Modern Islam in India, by W.C.Smith, Sh.M.Ashraf, 7 Aibak Road, New Anarkali, LHR, 1969.

پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی کے قلم سے دیگر کتب

جناب پرویز صاحب کے

"نظامِ ربوبیت" پر ایک نظر

صفحات ۲۸۰

ولادت عیسیٰ علیہ السلام

اور

منکرینِ حدیث

صفحات ۳۲۸

اسلام دین الٰہی ہے۔ جس کی تعلیمات اب انسانیت کو صرف قرآن وحدیث کے مستند ذرائع سے میسر آ سکتی ہیں۔ قرآن اگر وحی متلو ہے تو حدیث وحی غیر متلو کا درجہ رکھتی ہے۔ نبی ﷺ پر وحی کی ابتدا حدیث کی تنزیل سے ہوئی اور آپ کی حیات میں جبریل علیہ السلام سے آخری مکالمہ بھی حدیث کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ یہی باعث ہے کہ امت مسلمہ کے تمام مسالک کا اس پر اتفاق ہے کہ وحی حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے جبریل امین کے ذریعے قلب مصطفیٰ پر اترتی تھی۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن کی تفہیم ناممکن اور ایمان و یقین تشنۂ تکمیل رہتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں احادیث کی فقہی جمع وترتیب اور تراجم ابواب کے حوالے سے تدوین کا کام شروع ہوا تو عہد عباسی میں انکار سنت کے فتنے نے اپنی آنکھ کھولی اس فتنے کے استیصال کے لیے محدثین کرام نے علوم الحدیث کی صورت میں تاریخ انسانی کے سب سے محیر العقول علمی اور تحقیقی اسالیب کو ترتیب دیا۔ یہ فتنہ بارہ صدیوں تک دفن رہا کہ برصغیر میں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اس نے پھر انگڑائی لی۔ سرسید احمد خاں، چراغ علی، مولوی احمد دین، عبداللہ چکڑالوی اور اسلم جیراج پوری نے انکار سنت کے جس فتنے کا دروازہ کیا اسے مسٹر غلام احمد پرویز نے عقلیت کے نام پر بڑی ابلیسی مہارت کے ساتھ اردو زبان کے ایک تازہ اور دل کش اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لیے حکومتی سرپرستی اور انتظامیہ کے تعاون سے ایک مدت تک اس فتنے کی آبیاری ہوئی مگر اہل علم نے اس فتنے کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ ایسی علمی اور تحقیقی کاوشوں کی ایک کڑی پروفیسر محمد دین قاسمی کی ''جناب غلام احمد پرویز۔ اپنے الفاظ کے آئینے میں'' کے نام سے ایک تحقیقی کاوش ہے۔ پرویزیت کی حقیقت کے علمی جائزے کی آج تک جس قدر کوشش ہوئی ہیں۔ ان میں یہ اپنے تحقیقی مزاج، علمی اسلوب اور سائنٹفک منہج کے لحاظ سے ایک مسکت، مدلل، مستند، مثبت اور ایمان افروز کوشش ہے۔ جس کے مطالعے سے مسٹر پرویز کا علمی دجل وفریب، شخصی تضادات اور فکری تناقضات بھی الم نشرح ہو جاتے ہیں۔ میں اس کامیاب علمی تجزیے اور بے لاگ محاکمے پر مصنف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب ابطال باطل اور احقاق حق کا بہترین نمونہ ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

مدیر بیت الحکمت لاہور

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور۔ فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ISBN 969-8773-45-2